احادیثِ فتن

کی تفہیم کے اصول

ڈاکٹر محمد رشید ارشد
مدیر غزالی فورم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب

غزالی فورم
Ghazzali Forum

کتاب	:	احادیثِ فتن کی تفہیم کے اصول
مؤلف	:	ڈاکٹر محمد رشید ارشد
سنِ اشاعت	:	ربیع الاول ۱۴۴۵ھ بہ مطابق اکتوبر ۲۰۲۳ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
بارِ اشاعت	:	اول
ناشر	:	شعبہ تحقیق تصنیف، فقہ اکیڈمی
ای میل	:	info@fiqhacademy.com.pk

فقہ اکیڈمی
C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی۔ 0330-3474223
www.FiqhAcademy.com.pk 021-34613474

فہرست

پیش لفظ ۴

علاماتِ قیامت میں دلچسپی: اہمیت واسباب ۷

خیر و شر سے آگاہی اور منصبِ نبوت ۲۲

وقوعِ قیامت کا تصور اور علاماتِ قیامت ۶۰

احادیثِ فتن اور معاصر عرب مفکرین ۸۸

احادیثِ فتن اور معاصر مصری مفکرین ۱۱۲

علاماتِ قیامت اور برِ صغیر کے مفکرین ۱۲۶

احادیثِ فتن کی جدید تاویلات کے محرکات ۱۴۱

احادیثِ فتن کی جدید تاویلات کے نتائج ۱۴۹

احادیثِ فتن سے استنباط کے اصول اور عہدِ حاضر کی چند گمراہیاں ۱۵۷

معاصر مفکرین کی آرا کے مآخذ کا جائزہ ۲۰۶

احادیثِ فتن کا اطلاق و انطباق اور راہِ اعتدال ۲۲۳

احادیثِ فتن کا بیان اور معتدل راستہ ۲۴۰

حرفِ آخر ۲۶۳

پیش لفظ

خدائے بزرگ و برتر جہاں ارزاقِ ابدان تقسیم فرماتے ہیں، وہیں ارزاقِ ارواح کے لیے اہلِ علم و دانش کو ہر زمانے میں مُوَفَّق فرمایا کرتے ہیں۔ جس طرح لذتِ کام و دہن کے باب میں مخلوقِ خدا، مختلف الاذواق واقع ہوئی ہے، اسی طرح لطفِ علم اور ذوقِ معنوی میں تفاوت ایک امرِ فطری ہے۔ اللہ رب العزت نے جہاں مزاج، طبیعت کے تقاضے علیحدہ علیحدہ خلق فرمائے، وہاں ان کی تسکین کا انتظام بھی ادھورا نہیں رکھا۔ یہ دینِ اسلام، جس کی نسبت براہیمی ہے، خالقِ ارض و سما کا آخری دین ہے (نہ کہ فلسفیوں کے خیالات اور شیاطین کے وساوس) چنانچہ اس کی عالم گیریت اور مداومت اس امر کی متقاضی ہے کہ ذہن و فکر کی جس عمق اور اُفق سے اسے دیکھا جائے تو مشاہدہ کرنے والے کو اپنا قد چھوٹا اور نظر کوتاہ معلوم ہو۔ لہذا دین کی ترجمانی کرنے والے طبقات میں تنوع لازم اور ناگزیر ہے۔ جہاں احکامِ شریعت بتلانے اور منبر و محراب سے اہلِ اسلام کو بِاِسْمِ الدِّین مخاطب کرنے کے لیے مسجد، مدرسے اور خانقاہ کی روایت تابناک اور درخشاں ہے، وہیں ایسے رجالِ فکر و دعوت[1] بھی موجود ہیں اور موجود رہیں گے، جن کا کلامِ دل فروز بیک لخطہ ذہن اور ذوق دونوں کی آبیاری کرتا ہے اور شذوذ و نشوذ اور تفرد و تشدد سے یکسر پاک رہتا ہے۔ وللہ الحمد

ہمارے استادِ محترم ڈاکٹر محمد رشید ارشد صاحب مد ظلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی باکمال بنایا ہے۔ اس دورِ بے حد زوال میں ایسے اجلے، ایسے نکھرے اصحابِ علم و دانش، لق و دق صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں کی مانند نووارد انِ بساطِ ہوائے دل کے لیے اپنا اِفضال عام کیے ہوئے ہیں۔ کمی ہے تو سنجیدگی کے ساتھ استفادے کی! اگر کوئی

---

[1] حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تالیف "تاریخِ دعوت و عزیمت" کے عربی ترجمے کا نام رجال الفکر و الدعوۃ ہے

واقعی طالبِ علم بن جائے تو یقیناً اُس کے ذوق، مزاج، طبیعت اور ذہن وفکر کے تزکیے اور ترفع کا عملِ ہمہ جہت شروع ہوجائے گا، ان شاءاللہ تعالیٰ۔ آپ ایک عرصے سے شہر لاہور میں مسلسل اور کراچی واسلام آباد میں وقفے وقفے سے علمی حلقے، فکری محاضرات منعقد فرماتے رہے ہیں۔ اب بھی ہفتہ وار چار نشستیں روزمرہ کی تدریسی ذمے داریوں کے علاوہ جاری ہیں۔ ایک درسِ قرآن، دوسری درسِ حدیث، تیسری حلقۂ شعروادب جس میں کلامِ اقبال کا مطالعہ ہوتا ہے اور چوتھی بعنوان "قراءت خانہ" جس میں مغربی فکروفلسفے پر کسی کتاب کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب بیک وقت علومِ تفسیر وحدیث، تصوف وکلام، شعروادب اور فلسفہ ونقد سے اشتغال رکھتے ہیں۔ علوم کا یہ سمندر چار زبانوں پر مہارت سے موج افزا ہوجاتا ہے۔ میری مراد عربی، اردو، انگریزی اور فارسی سے ہے۔ پھر یہ سب کچھ اگر "بڑے لوگوں" کی صحبت سے مہمیز پاتا ہو تو یقیناً شخصیت میں محبوبیت کے اسباب یکجا ہوجاتے ہیں۔ یہ تو چند سطور صاحبِ کتاب کے بارے میں مؤلف کی ناراضی کا خطرہ مول لیتے ہوئے اپنے احساسات کے اظہار کے طور پر درج کردی گئیں۔ اب آتے ہیں کتاب پر!

جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اس کا عربی نام مؤلف نے أصول فقه أحاديث الفتن وأشراط الساعة تجویز فرمایا ہے جسے اردو میں "احادیثِ فتن کی تفہیم کے اصول" سے موسوم کیا جارہا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ سن ۲۰۲۰ء میں کورونا کی وبا نے جہاں کاروبارِ زندگی کو معطل کر دیا وہیں تعلیم وتعلم کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا اور درس گاہیں ویران ہوگئیں۔ اکثر وقت گھروں میں گزرنے لگا، اس موقعے پر محترم ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی گئی کہ وہ آن لائن کسی کتاب کی تدریس فرمائیں تو طلبہ کا یہ وقت قیمتی ہوجائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمالِ شفقت کے ساتھ یہ درخواست منظور فرمائی اور زوم میٹنگ کے ذریعے احادیثِ فتن کی تفہیم پر خطبات کا آغاز ہوگیا۔ الحمدللہ فقہ اکیڈمی کے اساتذہ وطلبہ نے اس آن لائن سلسلے میں دل جمعی کے ساتھ شرکت کی۔ گزشتہ سال ان قیمتی خطبات کو ٹرانسکرائب کیا گیا، اس کے بعد ناظمِ شعبۂ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی صوفی جمیل الرحمٰن عباسی صاحب، نائب ناظم مولانا حماد احمد

ترک صاحب اور معاونِ شعبہ مولانا محمد اقبال صاحب نے تمام خطبات کو تحریری صورت میں منتقل کیا اور پروف ریڈنگ کے مراحل سے گزار کر یہ کتاب مرتب کی۔

اس کتاب کے بنیادی طور پر تین حصے کیے جاسکتے ہیں: پہلا حصہ اس بات کی تفصیل پر مشتمل ہے کہ فتنہ کسے کہتے ہیں؟، احادیثِ فتن کی اہمیت کیا ہے اور محدثین نے ان احادیث کے بیان و تفہیم میں کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا، نیز ان احادیث پر کلام کے لیے کس قدر استعداد کی ضرورت ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ ان افراد کے تذکرے پر مشتمل ہے جنھوں نے احادیثِ فتن پر گفتگو کی۔ مزید برآں، ان احادیث پر گفتگو کے محرِکات کیا تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اُن اصحابِ علم کی خدمات بھی بیان کیں جنھوں نے اعتدال کے ساتھ ان احادیث کی تشریح کی مثلاً شیخ ابو بکر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر سفر بن عبد الرحمن الحوالی وغیرہ۔ اور ڈاکٹر صاحب نے ان مفکرین کی تصنیفات کا بھی جائزہ پیش کیا جنھوں نے عدم استعداد کے باوجود احادیثِ فتن کو موضوع بنایا اور اس باب میں طرح طرح کی غلط تاویلات اور لغو تشریحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ بعض نے تو تحقیق کے نام پر ایسی مضحکہ خیز تاویلات پیش کیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جائے: ”ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی“۔ کتاب کا تیسرا حصہ اس بات کے بیان پر مشتمل ہے کہ احادیثِ فتن کی تطبیق کا طریقہ کیا ہے، ان احادیث پر گفتگو میں معتدل طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے اور کن احتیاطوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دعا ہے کہ استادِ محترم کی یہ گراں قدر کاوش بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو اور امت کے لیے نفع کا باعث بنے۔ آمین

اویس پاشا قرنی

مدیر فقہ اکیڈمی، کراچی

١٨/صفر/١٤٤٥ھ

بمطابق ٥/ستمبر/٢٠٢٣ء

علاماتِ قیامت میں دلچسپی: اہمیت واسباب

یوں تو مستقبل کے حوالے سے پیش بینی کی خواہش انسان کی فطرت کا حصہ ہے، مگر ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہ بہت سے حوالوں پر آشوب اور ہنگامہ خیز قرار دیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر امتِ مسلمہ مجموعی طور پر اپنی تاریخ کے ایسے غیر معمولی ادوار سے پچھلی کچھ صدیوں میں گزری ہے جن سے گزشتہ زمانوں میں اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اقوامِ عالم میں ان کا مقام و مرتبہ گھٹتے گھٹتے پاتال کی پستیوں کو جالگا۔ اور بہت سے ممالک تو براہِ راست اغیار کے زیرِ نگیں ہو گئے۔ ایسے میں فطری طور پر خارجی حالات کا پیش گوئیوں کی روشنی میں مطالعہ اور مستقبل کی پیش بینی کی کوشش کرنا پچھلی صدی کے دوران بہت بڑھ گیا ہے۔ خاص طور پر پچھلی چند دہائیوں یا نصفِ صدی میں پیش گوئیوں والی روایات، احادیثِ فتن و ملاحم، علامات الساعۃ اور اس طرح کے موضوعات کی طرف بعض افراد کا التفات کچھ زیادہ بڑھ گیا ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے اندر بھی مختلف ادوار میں یہ رجحان رہا ہے کہ جب خارج میں حالات کو دیکھتے ہیں اور خاص طور پر فتنے اور انتشار والے حالات کو تو وہ خارجی حالات کو دستیاب مذہبی متن اور اخبار کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس پر کلام کرتے ہیں اور اس کو ایک نظریے کی شکل دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ویسے بھی ایک فطری چیز ہے، کیونکہ اس موضوع کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے واضح ہدایات فرمائی ہیں۔ ان ہدایات وارشادات میں اہلِ ایمان کے لیے رہنمائی اور رُشد ہے، اس لیے وہ ان کا مطالعہ کریں گے اور خارج کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ دیکھیں گے کہ جو باتیں بیان ہوئی تھیں کیا وہ ظاہر ہو گئیں اور یہ کہ جس دور میں ہم رہ رہے ہیں، کیا یہ وہی دور تو نہیں جس کا احادیث میں ذکر ہے؟

عام طور پر ''علاماتِ قیامت اور دورِ فتن'' کو ایک دلچسپ اور سنسنی خیز موضوع سمجھ کر اس پر کلام کیا جاتا ہے، اور بارہا تو ایسے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جو اس کام کی کم سے کم استعداد کے بھی حامل نہیں۔ پیچیدہ اور حسّاس موضوع ہونے کے ناتے نہ صرف یہ کہ یہ بہت زیادہ سنجیدگی اور دقتِ نظر کا متقاضی ہے، بلکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کو ایک خاص سطح کی استعداد کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

مستقبل بینی اور انسانی نفسیات

علاماتِ قیامت اور فتن کے علم کی ضرورت کیا ہے اور آخر انسان کیوں اس کے تجسس میں رہتا ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کو عمومی انسانی رویوں کے مطابق سمجھیں تو اصل بات یہ ہے کہ انسان شروع ہی سے اپنے مستقبل کے بارے میں تجسس رکھتا ہے اور اپنے مستقبل کی جان کاری میں غور فکر کرتا رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس معاملہ جانور کا ہے کہ اسے اپنے مستقبل اور ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انسانوں اور جانوروں میں ایک بنیادی فرق ہی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حیوانات لمحۂ حال میں اپنی جبلتوں کی بنیاد پر جیتے ہیں۔ یعنی لمحۂ موجود میں جو چیز ان کے اندر کوئی امنگ یا جذبہ پیدا کرتی ہے، یہ اس کی فوری تسکین چاہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے ہاں ماضی کے حوالے سے کوئی تصور یا کچھ یادیں پائی جاتی ہیں، اور یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ مستقبل کے حوالے سے ان کے ہاں کوئی بہت زیادہ دور اندیشی ہے۔ انسان کا معاملہ ذرا مختلف ہے کہ انسان حال میں رہتے ہوئے اپنے ماضی اور مستقبل سے جڑا رہتا ہے اور یہ چیز ہی تو انسان کے معاملے کو پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں بار بار جب جنت کا تذکرہ آتا ہے یا حیاتِ طیبہ کی بشارت دی جاتی ہے، تو وہاں خوف اور حزن دونوں کی نفی کی جاتی ہے: ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ ''نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ ''حزن'' ماضی سے متعلق ہوتا ہے، یعنی انسان کی زندگی میں تکلیفیں، پریشانیاں اور صدمات آتے ہیں اور انسان انھیں یاد رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ انسان کسی صدمے کو جھیلے اور پھر اسے اپنے آپ سے بالکل محو کر دے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کمپیوٹر سسٹم کی طرح خود کو دوبارہ ترتیب دے یا سارا ڈیٹا ڈیلیٹ کر دے۔ انسان ماضی کے غم و حزن میں یہ سوچتے ہوئے جیتا ہے کہ یہ کیوں ہوا

اور وہ کیوں نہیں ہوا۔ جبکہ ”خوف“ کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے۔ انسان کو مستقبل کا ڈر وخوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ کیونکہ دنیا میں جتنی بھی راحتیں اور خوشیاں ہیں، ان کے ساتھ اندیشے لگے ہوئے ہیں، یعنی اللہ نے آپ کو مال دیا ہے تو آپ کو خوشی ہوگی لیکن ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہو گا کہیں یہ مال مجھ سے چلا نہ جائے۔ اللہ نے اولاد دی اور پھر اولاد کی اولاد دی، تو آپ کو یہ احساس لگا رہے گا کہ کہیں اولاد کو کچھ ہو نہ جائے، کہیں یہ ہم سے رخصت نہ ہو جائیں یا کہیں ہم ان سے رخصت نہ ہو جائیں۔ جیسے جیسے خوشیاں بڑھ رہی ہیں ویسے ویسے اندیشے بھی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل سے متعلق مستقل اندیشے رہتے ہیں۔ اسی حوالے سے انسان بحیثیتِ فرد اور بحیثیت نوع یہ جاننے کی ایک طلب رکھتا ہے کہ کل میرے ساتھ اور میرے ابنائے جنس کے ساتھ کیا ہوگا، ہمارا مستقبل کیسا ہوگا۔

اگر ہم سورۂ لقمان کی آخری آیت کا مطالعہ کریں تو اس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (لقمان: ۳۴) ”بے شک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم اور وہی بارش برساتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ ارحام میں ہے اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ کس زمین میں اس کی موت ہوگی بے شک اللہ ہی جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے“۔

اس آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں سے آخری دو کے بارے میں تو انسانوں کے علم کی نفی کی گئی جبکہ پہلی تین کے متعلق یہ اعلان تو کیا گیا کہ یہ علمِ الٰہی میں ہیں، مگر ان سے انسانی علم کی نفی نہیں کی گئی۔ مطلب یہ کہ ان کا کُلی اور حتمی علم تو اللہ ہی کے پاس ہے لیکن انسان اپنی طلب، طبیعت کے زیرِ اثر مختلف نشان وآثار اور ایجادات سے ان چیزوں کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ چنانچہ بعض چیزوں کے بارے میں کچھ تخمینی یا جزوی علم انسان کو حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً قیامت کی بعض نشانیوں کا علم جیسے مسلم شریف کی حدیث میں آیا ہے کہ: «وَلَا تَقُومُ السَّاعَةُ إِلَّا فِي يَوْمِ الْجُمُعَةِ». ”قیامت نہیں قائم ہوگی مگر جمعے کے دن“۔

اب اس سے جزوی طور پر قیامِ قیامت کا علم ہوا کہ اس کا وقوع جمعے کے دن ہوگا۔ اسی طرح رحمِ مادر میں بچے کی

موجودگی اور اس کی جنس کا علم بعض اوقات الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے ہو جاتا ہے، لیکن بچے کے متعلق بہت سی باتیں صرف علمِ الٰہی کے ساتھ خاص ہیں اور انسانوں کے لیے اس علم میں سے کوئی حصہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ جو بچہ ہے، یہ پیدا بھی ہو پائے گا یعنی جو سمسٹر ماں کے پیٹ کے اندر ہوتے ہیں وہ پورے ہوں گے، اس کا تولد ہو گا کہ نہیں، پھر تولد ہو گا تو زندہ ہو گا، سانس لیتا ہو گا یا مردہ ہو گا، جب پیدا ہو جائے گا تو اس کے بعد اس کی کتنی زندگی ہے، اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئیں گے؟ لہٰذا بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو پیشگی طور پر کسی کے علم میں نہیں آتیں۔ کسی بچے کی جنس کا معلوم ہو جانا، اس کے متعلق علم کا ایک غیر اہم اور چھوٹا سا جزو ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ”الادب المفرد“ کی ایک روایت موجود ہے کہ جب ان کو محلے میں اردگرد کسی بچے کی ولادت کی خبر دی جاتی تو کبھی یہ نہ پوچھتیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے، وہ پوچھتیں کہ زندہ ہے؟ چنانچہ یہ سب سے اہم سوال ہے کہ وہ جیتا جاگتا بچہ ہے کہ نہیں ہے، وہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے؟ یہ اتنی اہم بات نہیں ہے کہ جس کو ہم نے بہت اہم بنا لیا ہے۔ بخاری شریف کی ایک معروف روایت ہے جس میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان کی تخلیق اس کی ماں کے رحم میں ہو جاتی ہے تو چالیس دن وہ نطفہ رہتا ہے۔ پھر چالیس دن وہ علقہ رہتا ہے، پھر مضغہ بنتا ہے۔ پھر جب ایک سو بیس دن یعنی چار مہینے پورے ہو جاتے ہیں تو ایک فرشتے کو اس کی طرف بھیجا جاتا ہے اور اس کو ان چار باتوں کے تعین کا حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا رزق کتنا ہو گا؟ ظاہر بات ہے کہ رزق ویسے روحانی بھی ہوتا ہے اور مادی بھی ہوتا ہے جبکہ یہاں اس سے مراد مادی ہے کہ کیا اور کتنا رزق کمائے گا؟ اسی طرح اجل کی بات ہے کہ اجل کیا ہے؟ دنیا میں آیا ہے اس کو یہاں سے جانا بھی ہے کہ مخلوق ہونے کا مطلب ہے کہ وہ فانی ہے۔ وہ نہیں تھا وجود میں آیا پھر اس کو جانا ہے یعنی موت زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے، اس سے منہا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح وہ عمل کیسے کرے گا نیک عمل کرے گا یا برے عمل کرے گا؟ اور پھر اس کا دائمی ٹھکانہ کیا ہو گا، خوش بختی مقدر آئے گی یا بدبخت ہو گا؟ تو ان سوالات کا جواب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے متعیّن کر دی ہیں۔ اب یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ انسان کو اللہ نے جو اختیار دیا ہے وہ اس کو استعمال کر کے یہ سب کرے گا۔

مستقبل بینی کے شوق میں کاہنوں سے رجوع

مستقبل کے امور کو جاننے کے شوق کی وجہ سے انسانوں نے ہمیشہ ہر دور میں اس کی کوشش کی ہے کہ ایسے لوگ ہوں کہ جو ہمیں اس کی کوئی اطلاع دے دیں کہ ہمارا کل کیسے گزرے گا اور "یہ ہفتہ کیسا گزرے گا"، اسی کی وجہ سے کاہن قسم کے لوگوں کا سارا کاروبار چلتا ہے۔ صحیح احادیث سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تکوین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی آزمائش کرنی ہے۔ صحیح احادیث میں ایک تفصیلی روایت ہے اس میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی امر نازل فرماتے ہیں تو فرشتے اس کو لینے کے لیے پھڑ پھڑاتے ہیں، پھر ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے، پھر اس کے بعد جب یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کا امر لے کر آسمان سے اترتے ہیں، تو کچھ جنات سن گن لینے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی چھوٹی موٹی بات اچک لیں۔ جیسے آج کل "لیکس" کا لفظ بہت استعمال ہوتا ہے، تو یہ جیسے ایک "ڈیوائن لیکس" ہے کہ جب تکوینی احکامات صادر کیے جاتے ہیں تو ان میں سے جنات کوئی ایک آدھ بات اچک لیتے ہیں۔ پھر اسی کا ایک طریقۂ کار یہ بھی ہے کہ وہ کاہن جو شیطانوں کے دوست ہوتے ہیں، ان کی سیوا کرتے ہیں، ان کی پوجا کرواتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ اس طرح یہ شیاطین اپنے ان دوستوں کے کان میں کوئی ایک آدھی بات ڈال دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جیسے کوئی مرغا ٹھونگیں مارتا ہے اس طرح سے کچھ باتیں وہ انڈیل دیتے ہیں۔ پھر کاہن کیا کرتا ہے، روایت میں آتا ہے کہ وہ کاہن یا وہ ساحر ان کے ساتھ سو جھوٹ اور ملا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کہانت کا کاروبار چلتا ہے اس میں بھی کیا ہوتا ہے کہ ایک ڈرامہ رچایا جاتا ہے بتائیے جی کل کیا ہوگا؟ اور فلاں کام ہو جائے گا یا نہیں؟ فلاں جاب مل جائے گی یا نہیں؟ میں ترقی کروں گا کہ نہیں کروں گا؟ میرے ہاتھوں میں قسمت کی لکیر کیا کہتی ہے؟ اور میرے ہاتھ میں کوئی پیسہ ہے کہ نہیں؟ وغیرہ، وغیرہ۔ چونکہ انسانوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے اور اس کا استعمال؛ ایسے دجال، برے اور گمراہ لوگ یعنی کاہن اور نجومی وغیرہ کرتے ہیں۔ لہذا انسان کی طبیعت میں ان چیزوں کی طرف ایک لپک ہے اور اس کے اندر جو مستقبل میں جھانکنے کا ایک شوق اور تجسس ہے کہ کل کیا ہوگا؟ آنے والے دور میں کیا ہوگا؟ ان کاہنوں اور نجومیوں کی وجہ سے لوگ اپنا عقیدہ ضائع کر بیٹھتے ہیں۔

کاہنوں سے رجوع کے نتائج

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ "السلوك في سياسة الملوك" میں بڑی خوبصورت بات کہتے ہیں کہ: مَعَ أَنَّ لِكُلِّ جَدِيْدٍ لَذَّةً وَلِكُلِّ مُسْتَحْدَثٍ صَبْوَةً. "ہر جدید چیز میں لذت پیدا ہوتی ہے اور ہر نئی اور اچھوتی بات بیان کرنے والے کی طرف نفس میں میلان پیدا ہوتا ہے"۔ "صبوۃ" کا مطلب ہوتا ہے نفس کا میلان، اسی کی وجہ سے لوگ کاہنوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ آگے وہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں جو مسندِ احمد میں وارد ہوئی، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي كُلُّ مُنَافِقٍ عَلِيمِ اللِّسَانِ». "مجھے اپنی امت پر جس چیز کے متعلق بہت ہی زیادہ اندیشہ ہے، وہ ہے ہر وہ بڑا چرب زبان منافق جو لوگوں کو باتوں میں لگالیتا ہے"۔ امام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاہنوں کی کہانت کو فروغ ملتا ہے اور ان کی دسیسہ کاریوں سے بدعتیں پھیل جاتی ہیں اور حق کی راہیں کمزور پڑجاتی ہیں۔ اسی طرح امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ "فتاوی" میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ حوادثِ کونیہ میں جھوٹ امورِ دینیہ میں جھوٹ سے زیادہ ہے۔ یعنی ایک جھوٹ شریعت کے معاملہ میں بولا جائے گا ایک جھوٹ تکوینی معاملات میں بولا جائے گا۔ تو امام کے مطابق تکوینی امور میں جھوٹ زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاں دنیا، دین پر غالب آجاتی ہے تو ان پر دنیا کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کے درپے ہوتے ہیں کہ میں کتنا کامیاب ہوں گا؟ کیا ملے گا؟ کہاں جاؤں گا؟ فلاں منصب مجھے ملے گا کہ نہیں؟ تو دنیا پرستی کے غلبے کی وجہ سے دنیا پرست لوگ ان کاہنوں اور نجومیوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اور وہ پھر ان کو جھوٹی باتوں اور کاموں میں ملوث کرتے ہیں۔ اسی طرح ابنِ خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ بات کہی ہے کہ انسان کے نفس کے اندر یہ خاصیت ہے اور اسی خاصیت کی بدولت اس کے نفس کے اندر معاملات کے انجام کو دیکھنے کا شوق ہے کہ ان باتوں کا علم جان لے کا جو ابھی واقع نہیں ہوئی ہیں۔ خاص طور پر عورتیں اور بچے اسی طرح کی چیزوں میں زیادہ اشتغال کرتے ہیں۔ یہ توہمات حبِ جاہ، حبِ مال اور معاشرت وعداوت کے مسائل کی بدولت فروغ پاتے ہیں۔

ماڈرن لوگوں میں توہم پرستی

ہمارے ہاں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کیمبرج اور آکسفرڈ کے پڑھے ہوئے ہیں اور اپنے تئیں بہت سمجھدار اور عقل مند ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہر بات عقل کے مطابق کر رہے ہیں، لیکن وہ بھی طرح طرح کے توّہمات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک بابا جی ہوتے تھے دھنکا بابا اور وہ بابا جی جذب کی کیفیت میں لوگوں کو چھڑیاں مارتے تھے، تو جب ایک آدھ سیاست دان گیا، اس نے چھڑی کھائی اور اتفاق سے وہ وزیر اعظم بھی بن گیا، تو اس توہم میں مبتلا دوسرے سیاست دانوں نے بھی وزیر اعظم بننے کے لیے بابا جی کا رخ کیا۔ اسی طرح ہمارے کئی وزیر اعظم ان کے پاس گئے، اس کے بعد یہ بات پھیل گئی اور جو بھی چاہتا تھا کہ وہ وزیر اعظم بنے وہ بابا جی سے چھڑیاں کھا کے آتا تھا۔ ہمارے ایک پرانے صدر صاحب اسلام آباد چھوڑ کے کراچی شفٹ ہو گئے اور پتا چلا کہ ان کے پیر صاحب نے انھیں بتایا ہے کہ آپ ایک ایسے شہر میں رہیں، جہاں سمندر ہو، جہاں ساحل ہو۔ یہ بظاہر وہ لوگ ہیں جو ویسے بہت پڑھے لکھے ہیں اور بڑے سمجھدار ہیں، مگر اس طرح کے توہمات سے وہ بھی اپنے آپ کو دور نہیں کر سکے۔

امتِ مسلمہ کی علاماتِ قیامت میں دلچسپی

اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے تک امتِ مسلمہ کا بیشتر علاقہ استعمار کے زیرِ نگیں آ چکا تھا، یعنی کالونائزیشن کا عمل مکمل ہو گیا تھا۔ پوری امتِ مسلمہ میں حجاز، افغانستان اور ترکی کے کُچھ علاقوں کو چھوڑ کر باقی تمام امتِ مسلمہ کے علاقے غیر اقوام کے تحت آ گئے۔ کہیں پر ولندیزی قابض ہو گئے تو کہیں فرانسیسی آ گئے، کہیں پر تگالی آبر اجمان ہوئے تو کہیں پر انگریز قابض ہو گئے۔ لہٰذا وہ اُمت جس کے تحت الشعور میں ایک طویل عرصے تک اقتدار، شوکت اور سطوت کا نشہ تھا، اس کے لیے بلا شبہہ یہ ایک بہت ہی مشکل گھڑی تھی۔ ہم لوگ جو مابعد نو آبادیاتی عہد میں پیدا ہوئے ہیں، ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمارے بڑے جنھوں نے یہ سب حالات جھیلے ہیں اُن پر کیا کچھ نہیں گزرا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انتشار ہوتا ہے، پریشانی ہوتی ہے تو ایک تجزیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ سب ہمارے ساتھ کیوں ہوا؟ اور

پھر اُسی کے ذیل میں ہم اپنی مذہبی کتب کی طرف بھی رجوع کرتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ بات بھی بہت اہم اور حوصلہ افزا ہے اور یہ اس اُمت کی حقانیت ہی کی دلیل ہے کہ امتِ مسلمہ نے من حیث المجموع اپنی مذہبی کتابوں کی طرف ہمیشہ سے رجوع کیا ہے۔ ایک معنی میں یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ یہ اُمت ایک Textual اُمت ہے، یعنی یہ امت ''خدا مرکز'' اور ''رسول مرکز'' ہے۔ اس لیے کہ جو علم ہمارے پاس آیا ہے وہ متن پر مبنی ہے۔ قرآنِ مجید بھی نقل ہوا اور پھر لکھا گیا اور اسی طرح اخبارِ نبی ﷺ کا معاملہ ہے۔ گویا ہماری اُمت سند کی اُمت ہے۔ اس کے اندر ہر چیز کا ایک شجرہ ہے اور علم بڑوں سے چلتا چلا آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنے ٹیکسٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہاں اب اس میں وہ احکامات کا استخراج واستنباط غلط کرتے ہیں یا صحیح، یہ ایک الگ قابلِ بحث معاملہ ہے۔ لیکن اس اُمت میں کوئی بھی شخص، کوئی بھی جماعت یا کوئی بھی گروہ اگر چاہتا ہے کہ اجتماعی اسکیل پر اس کی بات سنی جائے، تو اسے بہر حال قرآن وحدیث سے ہی کوئی نہ کوئی بات نکالنی ہوگی اور دکھانا ہوگا کہ میری یہ بات قرآن وسنت سے کہاں اور کیسے میچ کر رہی ہے۔ اگر اس میں تھوڑی ہٹی ہوئی بات ہے تو اس کے لیے میرے پاس کیا توجیہ ہے۔ تو مسلمان ہمیشہ سے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرتے ہیں، وہاں پر پھر یہ روایتیں ان کے سامنے آتی ہیں اور وہ ان روایتوں کا انطباق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علامتِ قیامت کے متعلق بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی دلچسپی کی وجہ

کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایسے بھی تھے جن کے اندر خاص طور پر حالات میں موجود شر کے عنصر کو جاننے کا تجسس اور جذبہ زیادہ تھا۔ ان میں خاص طور پر سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ گویا اس شعبے کے متخصّص ہیں اور اس کے بارے میں وہ نبیٔ اکرم ﷺ سے چیزیں پوچھتے رہا کرتے تھے۔ ان کا یہ شوق و ذوق دیکھتے ہوئے ایک موقعے پر آپ ﷺ نے انھیں کچھ منافقین کے نام بتائے۔ غزوۂ تبوک سے واپسی پر کچھ منافقین اس ارادے سے ایک گھاٹی میں چھپ گئے کہ بلندی سے کوئی چٹان وغیرہ گرا کر آپ ﷺ کو شہید کر دیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ موجود حُذیفہ ابن الیمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی نظروں میں آ گئے اور

رسول اللہ ﷺ نے انھیں للکارا، وہ بھاگ نکلے اور اس طرح ان کی سازش ناکام ہوگئی۔ نبی اکرم ﷺ نے خاص طور پر اس سازش میں شریک منافقین کے نام حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو بتا دیے۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج:۵، ص:۹۲۲) اس وجہ سے ان کا لقب "صاحب سرّ النبی ﷺ" یعنی رازدانِ رسول اللہ ﷺ معروف ہوگیا تھا۔ چونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے بارے میں کوئی خاص سیلف امیج نہیں رکھتے تھے تو اکابر صحابۂ کرام، سیدنا حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کرتے تھے کہ کہیں ہمارا نام تو منافقین کی فہرست میں نہیں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے طرزِ عمل کے بارے میں بتاتے ہیں: كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الخَيْرِ، وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ مَخَافَةَ أَنْ يُدْرِكَنِي. (ابوداود) "لوگ عام طور پر رسول اللہ ﷺ سے خیر کی بابت پوچھا کرتے تھے اور میں شر کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا کرتا تھا اس اندیشے کے تحت کہ کہیں اس میں مبتلا نہ ہوجاؤں"۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کریں کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے کا سبب خالص اخلاقی تھا، وہ اس ڈر سے پوچھ رہے تھے کہ کہیں ان حالات سے دوچار نہ ہوجاؤں۔ وہ شر سے بچنے اور تحفظ کے لیے پوچھ رہے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ شر سے بچنے کے لیے شر کی معرفت ضروری ہے۔ بعض لوگ احادیثِ فتن کا علم سنسنی پھیلانے کے لیے یا لوگوں پر رعب جمانے یا پیش گوئیاں کرنے کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اتباع میں ہمارا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ ہم علمِ فتن وشرور کی جان کاری اپنی دین داری کو بچانے اور خود کو فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے حاصل کررہے ہیں۔ ہمارے لیے اصل تو یہ ہے کہ اخلاقی شر کی واقفیت حاصل کریں تاکہ اس سے بچ سکیں، مگر ساتھ ساتھ تکوینی شر سے بچنا بھی کوئی کم اہم نہیں ہے اس لیے اس کی واقفیت بھی ضروری ہے۔

علاماتِ قیامت دیگر مذاہب کی نظر میں

دوسرے مذاہب کے مقابلے میں قیامت اور علاماتِ قیامت کے متعلق اسلام کی تعلیمات واضح ہیں، اس لیے اس موضوع کی تحقیق پر ہمارے ہاں اتنا نہیں لکھا گیا جتنا یہودیت وعیسائیت کے ماننے والوں کے ہاں لکھا گیا۔ کیونکہ ہمارے ہاں تو معاملہ یہ ہے کہ کسی نئے نبی کسی نئے رسول نے نہیں آنا ہے، اگرچہ سیدنا مسیح علیہ السلام

نے آنا ہے لیکن انھیں تو ایک خاص مشن کی تکمیل کے لیے آنا ہے نہ کہ نئے رسول کی حیثیت سے۔ لہذا ہمارے ہاں معاملات واضح ہیں اس لیے ہمارے ہاں اس موضوع پر اتنا کچھ نہیں لکھا گیا ہے، جتنا عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں لکھا گیا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں Eschatology یعنی آخر الزماں کے علم کا ایک انبار ہے۔ ان کے ہاں تو بہت سے معاملات کا مدار اس پر ہے، یعنی معاذ اللہ ان کے خیال کے مطابق تو خدا نے آنا ہے اور آکر اُن سب کو بچا کر آسمانوں پر لے جائیں گے اور پیچھے آرمیگاڈان ہو رہا ہو گا۔ ان کے خیال میں پھر وہاں سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے اور پھر مسیح اپنے سارے ماننے والوں کو لے کر زمین پر آئیں گے اور پھر ایک سنہری دور کا آغاز ہو گا۔ یہود کے ہاں یہ معاملہ ہم سے بھی زیادہ اہم ہے، کیونکہ ان کے "مسایا" نے تو پہلی مرتبہ آنا ہے، اس لیے کہ ان کی اور بہت سی چیزیں اور بہت گہرے ایمانیات اُس سہارے سے وابستہ ہیں۔ کورونا وائرس کے ہنگام پر بھی اُن کے بڑے بڑے رِبی یہ باتیں کرتے رہے کہ ہمارا جو "مسایا" نجات دہندہ آنے والا ہے، یہ اُسی کے لیے حالات تیار ہو رہے ہیں۔

مستقبل کا مطالعہ اور مغربی لٹریچر

عام طور پر لوگ مستقبل کی پیش بینی یا پیش گوئیاں مذہبی لٹریچر کے سہارے کر رہے ہیں۔ اب اس کے علاوہ ایک جدید علم پیدا ہوا ہے جو پہلے فزیکل سائنس تھا، پھر وہ سوشل یا ہیومن سائنس ہوا۔ اب چونکہ بہت سے لوگ اس حوالے سے بھی دیکھتے ہیں کہ آگے آنے والی دنیا کیسے ہو گی؟ تو فیوچر سٹڈیز کا پورا ایک ڈسپلن، فیوچرالوجی کے نام سے سامنے آیا اور اس پر بہت سے لوگوں نے کام کیا۔ پچھلی صدی میں ایک بہت مشہور شخص Alvin Toffler تھا، اُس کی کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔ اس نے ۱۹۷۰ء میں "Future Shock" کے نام سے ایک کتاب لکھی، پھر ۱۹۸۰ء میں ایک کتاب "The Third Wave" کے نام سے لکھی۔ اس "Third Wave" کا مطلب انسانیت کی تاریخ میں ایک بہت بڑا پڑاؤ، ایک بڑی ویو ہے۔ اس تھیسس میں قابلِ ذکر بات یہی ہے کہ جب انسان Hunter gatherer سے نکل کر Agricultural Phase میں آیا، ملینیم پیریڈ میں آیا تو یہ First Wave تھی۔ پھر اس کے بعد Industrial age کی Second Wave آئی، اور Industrial

Revolution ہوا۔ اور اس کے بعد اب Third wave ہے جو جاری ہے۔ ۱۹۸۰ء میں اُس نے جب یہ کتاب لکھی تو وہ بنیادی طور پر Post Industrial age ہے، یا جس کو اُس نے Information age کہا ہے کہ انفارمیشن کا دور ہے۔ اس کے بعد بھی آج کے دن تک اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اسی طرح Ray Kurzweil ایک مصنف ہے، اُس کی ایک کتاب "The singularity is near when humans transcend biology" بہت مشہور ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ نیورولوجی، سائیکولوجی، بائیولوجی اور خاص طور پر Artificial intelligence، ان کی Merging سے اب نئے نئے علوم پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر اس موضوع پر کچھ سال پہلے George Friedman کی ایک اور بہت مشہور کتاب "The next 100 years: A Forecast For The 21st Century" آئی تھی وہ بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں وہ بتا رہے ہیں کہ اگلے سو سال میں دنیا کیسے ہو گی۔ اور یہ جو بیان کیا جا رہا ہے، یہ کوئی Metaphysical assumptions نہیں ہیں اور نہ ہی کچھ Theological یا Religious implications ہیں، بلکہ موجودہ سائنس اور انسانیت کے موجودہ رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح ایک اور مصنف جو آج کل نوجوانوں میں بہت معروف ہیں، جن کا نام Yuval Noah Harari ہے، ایک اسرائیلی مؤرخ ہیں، جنھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ پہلے اُنھوں نے ماضی پر "Sapiens" کے نام سے کتاب لکھی اور اس میں بتایا کہ انسانیت یہاں تک کیسے پہنچی ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ اس وقت حال میں کیا ہو رہا ہے۔ پھر قریب کے مستقبل کے حوالے سے اس کی ایک کتاب "21 Lessons For The 21st Century" سامنے آئی، یہ بہت معروف کتاب ہے اور بیسٹ سیلر بھی ہے۔ اس میں اُس نے بتایا ہے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے؟ پہلے "Sapien" آئی، پھر اس کے بعد یہ کتاب آئی کہ مستقبل میں کیا ہونے لگا ہے؟ پھر "Homo Deus" کتاب لکھی گئی کہ انسان گویا خُدا بننے جا رہا ہے۔ تو اب یہ کتابیں بھی بتا رہی ہیں کہ انسان کو آئندہ ہم کہاں دیکھ رہے ہیں؟ پھر بہت سے پیش گوئی کرنے والے آئے۔ ایک خاتون جو ایک زمانے میں Jeane Dixon کے نام سے امریکہ میں بہت مشہور ہوئی۔ اُس نے بہت سی پیش گوئیاں کیں، بہت سے انکشافات کیے۔ پھر فرانس سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب جو سولھویں صدی عیسوی کے ہیں، Nostradamus کے نام سے معروف ہیں۔ انھوں نے فرنچ میں "Les Propheties" کے نام سے

ایک کتاب لکھی، بعد میں وہ کتاب "Prophecies of Nostradamus" کے نام سے چھپتی رہی ہے، اس میں کئی انکشافات کیے گئے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ مختلف اوقات میں جب بھی کوئی بڑا ایونٹ ہوتا ہے تو Nostradamus کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کی پیش گوئیاں لوگ بیان کرتے رہتے ہیں۔ تو یہ جو فیوچرالوجی ہے یا مستقبل میں جھانکنا ہے اس کے حوالے سے لوگوں کے اندر بڑا ایک تجسس رہا ہے۔

مستقبل بینی کے شوق کی تسکین اور اس کا جائز راستہ

اپنے انجام سے متعلق جان کاری ایک جبلت ہے اور دیگر جبلتوں کی طرح اس انسانی جبلت کی تسکین کے لیے بھی دین نے "وحی" کا ایک جائز راستہ کھولا ہے۔ اگر آپ اپنے انجام اور زندگی کے مقاصد سے خبردار ہونا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ وحیُ الٰہی ہی ہے۔ حافظ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "مفتاح دار السعادۃ" میں اس موضوع پر کلام کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ کل کیا حالات پیش آئیں گے اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ یہ نفس کے نزدیک بڑا میٹھا اور لذیذ ہے۔ اگرچہ عالم الغیب تو کوئی بھی شخص نہیں ہوتا، مگر وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ اسے غیب کا علم ہو اور وہ جان لے کہ کل کیا ہوگا، پرسوں کیا ہوگا؟ چونکہ اللہ نے مستقبل کے معاملات اکثر بندوں سے چھپا لیے ہیں، تو خالق ہونے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ انسانی کمزوریوں سے واقف ہیں، جبکہ مستقبل کی جانکاری انسان کی جبلت ہے، تو اس جبلت کی تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اس کے متعلق علم دیا۔ چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (الملک: ۱۴) "کیا بھلا وہی نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا؟"۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ انسانوں کی ضرورتیں کیا ہیں؟ ان کو کن کن حوالوں سے رہنمائی کی ضرورت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کا اہتمام کیا: ﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى، وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى﴾ (الاعلی ۲۔۳) "وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے خلق کیا اور ٹھیک ٹھیک بنایا۔ پھر ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر دیا اور پھر رہنمائی کی"۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ﴾ (اللیل: ۱۲) "بے شک ہمارے ذمے ہے ہدایت دینا"۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں تک ہدایت اپنے رسولوں کے ذریعے پہنچائی ہے اور اپنے خاص علمِ غیب میں سے انھیں ایک حصہ عطا کیا ہے۔ اگر علمِ غیب میں سے کچھ حصہ رسولوں کو نہ دیا جاتا تو انسان اپنے فطری تجسس سے

مجبور ہو کر دجالوں، کاہنوں اور غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ کر گمراہی میں مبتلا ہو جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو عام انسانوں سے پوشیدہ امور کا علم دیا تاکہ اُن کی تجسس پسند طبیعت کو کچھ قرار آ سکے اور وہ گمراہی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا، إِلَّا مَنِ ارْتَضَى مِنْ رَسُولٍ﴾ (الجن:۲۶۔۲۷) ''وہ غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو اختیار نہیں دیتا، سوائے کسی رسول کے جسے اس نے اس کام کے لیے پسند کر لیا ہو''۔ لہٰذا اقربِ قیامت، دورِ فتن اور ملاحم کی پیش گوئیوں کی احادیث، کل کے اسی پوشیدہ علم پر مشتمل ہیں جو عام انسانوں سے پوشیدہ اور اللہ کے خاص علمِ غیب کا ایک حصہ ہے، جس میں سے کچھ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو وحیٔ جلی یا خفی کے ذریعے دیا گیا تاکہ انسانوں کی علم پسند جبلت کی تسکین ہو سکے اور وہ کسی گمراہی میں پڑنے سے محفوظ رہ سکیں۔

مستقبل بینی میں غلو اور علمِ نجوم کی ممانعت

جب مستقبل کے امور جاننا ایک انسانی جبلت ہے اور اس کی ضرورت وحیٔ الٰہی کے ذریعے پوری کی گئی ہے تو اب انسان کو چاہیے کہ فطری تسکین کے لیے مستقبل کا جتنا علم وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اسی پر اکتفا کرے اور اس پوشیدہ علم کے حصول کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار نہ کرے، اس لیے کہ گمراہیوں کا راستہ اسی سے کھلتا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ ''عقیدۂ طحاویہ'' میں فرماتے ہیں کہ علم دو ہیں: ایک علم وہ ہے جو مخلوقات کے لیے موجود ہے، ایک علم وہ ہے جو مفقود ہے۔ لہٰذا جو علمِ موجود ہے اس پر توجہ نہ دینا گمراہی ہے اور جو علمِ مفقود ہے اس پر توجہ دینا اور اس کے درپے ہونا دوسری گمراہی ہے۔ چنانچہ اسی گمراہی کے سدِباب کے لیے ہمیں علمِ نجوم اور کہانت وغیرہ کی طرح کے علم سے روکا گیا ہے۔ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: «مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ». (مسندِ احمد) ''جس نے علمِ نجوم سیکھا اس نے جادو کا ایک شعبہ اختیار کیا''۔ ایک اور روایت ہے کہ نبیٔ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: «مَنْ أَتَى كَاهِنًا، أَوْ عَرَّافًا، فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ». (مسندِ احمد) ''جو کسی عرّاف کے پاس یا کسی کاہن کے پاس آئے اور جو وہ کہے اس کو سچ مان لے، تو اس نے گویا کفر کیا

اس چیز کا، جو محمد ﷺ پر نازل کی گئی"۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: «مَنْ أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ، لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً» . (مسلم) "جو کسی عراف کے پاس گیا اور سے رہنمائی کی غرض سے سوال پوچھا تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی"۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اب تو انفارمیشن کا دور ہے اور ہر چیز انسان کے فنگر ٹپس پر ہے اور ایک کلک کے فاصلے پر دنیا بھر کا علم موجود ہے۔ ہر وقت کتنے دروس ہو رہے ہیں، کتنے دروس یوٹیوب پر موجود ہیں اور کتنا لٹریچر سافٹ اور ہارڈ کاپیوں کی صورت میں موجود ہے۔ لگتا ہے کہ ایک علم کا جہان ہے جو لوگوں کے سامنے کھل گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، جہالت بہت زیادہ بڑھتی جا رہی ہے اور ان میں کچھ جہالتیں وہ ہیں جو خرد کی راہ سے آتی ہیں۔ جگر کا بہت خوبصورت شعر ہے:

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

در حقیقت یہ خرد کی جہالت کا دور ہے، جس میں ہم رہتے ہیں، یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ان احادیث اور پیش گوئیوں کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی ہے۔ لیکن اس ضمن میں کی جانے والی توجیہات گہرے علم اور تفقہ پر مبنی نہیں ہیں۔ متعدّد حضرات اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے متعلقہ احادیث سے استنباط کرتے ہیں اور اپنے فہم کے مطابق چیزوں کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ ان کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اکثریت اُن علوم سے وہ واقفیت نہیں رکھتی جن سے آگاہی اس موضوع کی درست تفہیم کے لیے ناگزیر ہے۔ بنا بریں ضرورت کا احساس ہوا کہ ان احادیث کے فہم کے اصول کسی قدر تفصیل سے بیان کیے جائیں تاکہ نااہل کی تنبیہ اور اہل کی تسکین کا سامان ہو سکے۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ دورِ فتن اور علاماتِ قیامت کے بارے میں تمام احادیث کا احاطہ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ ہم کچھ احادیث بطورِ مثال ذکر کریں گے کہ جن کے معانی و مصداق میں غلو کیا گیا ہو یا پھر وہ احادیث ذکر کریں گے جو فہمِ اصول میں ہماری معاون ہوں۔ جو احادیث ہم

بیان کریں گے ان کے بارے میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ان کی تشریح یا دورِ حاضر یا قدیم پر اس کا انطباق ہماری موجودہ بحث سے خارج ہے ہاں اگر کسی اصول کے فہم یا کسی مثال کی تفہیم کے لیے ضمنی طور پر ان امور کا ذکر آجائے تو یہ الگ بات ہے۔ہم ان علمی گزارشات کا نام أصولُ فقهِ أحاديثِ الفتنِ و أشراطِ الساعة"احادیثِ فتن کی تفہیم کے اصول" تجویز کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس مشکل موضوع کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

*****

خیر و شر سے آگاہی اور منصبِ نبوت

رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی جس طرح عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق میں رہنمائی کی ہے اسی طرح امت کو قیامت تک پیش آنے والے حوادث، فتن اور دیگر اہم معاملات میں، جن کا ایک مسلمان کے ایمان سے تعلق ہیں، بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ کیونکہ انذار اور تبشیر تمام انبیاے کرام علیہم السلام کا اہم وظیفہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ﴾ (الکہف:۵۶) "اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر"۔ بشارت کا تعلق اچھے حالات اور امور خیر کے ساتھ ہے جب کہ انذار کا تعلق برے حالات اور امور شر کے ساتھ ہے۔ یہاں خیر سے مراد وہ نیکیاں بھی ہیں جو جنت کی طرف لے جانے والی ہیں اور اچھے حالات یعنی دین کی غلبے اور اللہ کی مدد و نصرت اور اعانت کی بشارت بھی ہے۔ تو یہ دونوں پہلو خیر کی طرف رہنمائی میں شامل ہیں۔ اسی طرح شر سے ایک طرف اخلاقی شر یعنی شرک، کفر، بدعت، تکبر، حسد، کینہ اور عقوق الامہات وغیرہ مراد ہیں تو دوسری طرف شر سے مراد برے حالات، سختیاں، پریشانیاں، مصیبتیں ہیں۔ تو خیر کی طرف رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ شرور سے آگاہ کرنا بھی ہر نبی کی ذمے داری رہی ہے۔

شفقت و رحمتِ محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کا بیان

نبیِ کریم ﷺ تمام انسانیت اور بالخصوص اپنی امت پر بہت مہربان و شفیق تھے۔ آپ ﷺ بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کا ایک فضل و احسان تھے جس کو واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (التوبہ:۱۲۸) "(لوگو)

تمھارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمھاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمھاری بھلائی کے خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں"۔ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ چونکہ امت کی خیر و خوبی پر حریص تھے، لہذا آپ بہت چھوٹی چھوٹی نقصان دہ باتوں سے بھی امت کو منع کیا کرتے تھے۔ یہ ایسی چیزیں ہوتی تھیں جن کی کوئی دینی اہمیت نہ ہوتی بلکہ وہ صرف دنیاوی امور کے متعلق ہوتی تھیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ پیغمبر صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا ہو کہ اگر آپ عمل نہیں کریں گے تو گناہ کی بات ہے۔ وہ اصلاً شرعی باتیں نہیں ہیں بلکہ امت کے فائدے کی باتیں ہیں۔ یہ بالکل ایسے جیسے کوئی بڑا بزرگ چھوٹوں پر محبت اور شفقت سے انھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ انھیں کوئی تکلیف یا پریشانی نہ ہو۔ مثال کے طور پر نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: «خَمِّرُوا الآنِيَةَ، وَأَوْكُوا الأَسْقِيَةَ، وَأَجِيفُوا الأَبْوَابَ وَاكْفِتُوا صِبْيَانَكُمْ عِنْدَ العِشَاءِ، فَإِنَّ لِلْجِنِّ انْتِشَارًا وَخَطْفَةً، وَأَطْفِئُوا المَصَابِيحَ عِنْدَ الرُّقَادِ، فَإِنَّ الفُوَيْسِقَةَ رُبَّمَا اجْتَرَّتِ الفَتِيلَةَ فَأَحْرَقَتْ أَهْلَ البَيْتِ».(بخاری) "پانی کے برتنوں کو ڈھک لیا کرو، مشکیزوں (کے منھ) کو باندھ لیا کرو، دروازے بند کر لیا کرو اور اپنے بچوں کو اپنے پاس جمع کر لیا کرو، کیوں کہ شام ہوتے ہی جنات (روے زمین پر) پھیلتے ہیں اور اچکتے پھرتے ہیں اور سوتے وقت چراغ بجھا لیا کرو، کیوں کہ موذی جانور (چوہا) بعض اوقات جلتی بتی کو کھینچ لاتا ہے اور اس طرح سارے گھر کو جلا دیتا ہے"۔ بغیر منڈیر والی چھت پر سونے کو ناپسند کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: «مَنْ بَاتَ عَلَى ظَهْرِ بَيْتٍ لَيْسَ لَهُ حِجَارٌ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ». (ابوداود) "جو شخص کسی ایسی چھت پر سوئے جس کے گرد کوئی منڈیر (پردہ وغیرہ) نہ ہو تو اس سے ذمہ اٹھ گیا"۔ یعنی ایسی صورت میں اگر وہ گر کر ہلاک ہو جائے یا نقصان اُٹھائے تو اس کا وہ خود ذمے دار ہے۔ جب دنیوی معاملات میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امت کی اس حد تک رہنمائی کرتے تھے تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی دینی شفقت و رحمت تو اندازے سے باہر ہے۔ پس آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے دینی حوالے سے فتن و شرور سے اپنی امت کو آگاہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک مشہور روایت ہے کہ اللہ کے نبی نے فرمایا: «إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ النَّاسِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَعَلَ الفَرَاشُ وَهَذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهَا، فَجَعَلَ يَنْزِعُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ فَيَقْتَحِمْنَ فِيهَا، فَأَنَا آخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَهُمْ يَقْتَحِمُونَ فِيهَا».(بخاری)

”میری اور لوگوں کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے آگ جلائی، جب اس کے چاروں طرف روشنی ہوگئی تو پروانے اور یہ کیڑے مکوڑے جو آگ پر گرتے ہیں اس میں گرنے لگے اور آگ جلانے والا انھیں اس میں سے نکالنے لگا لیکن وہ اس کے قابو میں نہیں آئے اور آگ میں گرتے رہے۔ اسی طرح میں تمھاری کمر کو پکڑ کر آگ سے تمھیں نکالتا ہوں اور تم ہو کہ اسی میں گرتے جاتے ہو“۔

ایک اہم حدیث کا مطالعہ

تمام انبیاے کرام علیہم السلام کی طرح نبی ٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمے داریوں میں شامل تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کو موجودہ اور مستقبل میں آنے والے شر سے خبردار کریں۔ اس حوالے سے ہم ایک اہم حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں انبیاے کرام علیہم السلام کی اس ذمے داری کے ذکر کے ساتھ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خیر و شر کی جانب رہنمائی کی گئی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما حرم مکہ میں خانۂ کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے، لوگ آپ رضی اللہ عنہ کے پاس جمع تھے اور آپ رضی اللہ عنہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنا رہے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ قیام کیا، تو ہم میں سے کوئی خیمہ لگا رہا تھا، کوئی تیر چلا رہا تھا، اور کوئی اپنے جانور چرانے لے گیا، اتنے میں ایک منادی نے آواز لگائی کہ لوگو! نماز کے لیے جمع ہو جاؤ، تو ہم نماز کے لیے جمع ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر ہمیں خطبہ دیا، اور فرمایا: «إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى مَا يَعْلَمُهُ خَيْرًا لَهُمْ، وَيُنْذِرَهُمْ مَا يَعْلَمُهُ شَرًّا لَهُمْ، وَإِنَّ أُمَّتَكُمْ هَذِهِ جُعِلَتْ عَافِيَتُهَا فِي أَوَّلِهَا، وَإِنَّ آخِرَهُمْ يُصِيبُهُمْ بَلَاءٌ، وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا، ثُمَّ تَجِيءُ فِتَنٌ يُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضًا فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ: هَذِهِ مُهْلِكَتِي، ثُمَّ تَنْكَشِفُ، ثُمَّ تَجِيءُ فِتْنَةٌ، فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ: هَذِهِ مُهْلِكَتِي، ثُمَّ تَنْكَشِفُ، فَمَنْ سَرَّهُ أَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ، وَيُدْخَلَ الْجَنَّةَ، فَلْتُدْرِكْهُ مَوْتَتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يَأْتُوا إِلَيْهِ، وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَمِينِهِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ فَلْيُطِعْهُ، مَا اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ، فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ». (ابنِ

ماجہ) ”مجھ سے پہلے جتنے بھی نبی گزرے ہیں ان کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنی امت کی ان باتوں کی طرف رہنمائی کریں جن کو وہ ان کے لیے بہتر جانتے ہوں، اور انھیں ان چیزوں سے ڈرائیں جن کو وہ ان کے لیے بری جانتے ہوں، اور تمھاری اس امت کی سلامتی اس کے شروع حصے میں ہے، اور اس کے اخیر حصے کو بلا و مصیبت لاحق ہوگی، اور ایسے امور ہوں گے جن کو تم برا جانو گے، پھر ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک کے سامنے دوسرا ہلکا محسوس ہوگا مومن کہے گا: اس فتنے میں میری تباہی ہے، پھر وہ فتنہ ختم ہو جائے گا، اور دوسرا فتنہ آئے گا، مومن کہے گا: اس میں میری تباہی ہے پھر وہ بھی ختم ہو جائے گا، تو جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ جہنم سے بچا لیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو وہ کوشش کرے کہ اس کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اور لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے ساتھ کریں، اور جو شخص کسی امام سے بیعت کرے، اور اس کو اپنی قسم کا ہاتھ دے کر دل سے سچا عہد کرے تو اب جہاں تک ہو سکے اس کی اطاعت کرے، اگر کوئی دوسرا امام آکر اس سے لڑنے جھگڑنے لگے (اور اپنی بیعت پر اصرار کرے) تو اس دوسرے امام کی گردن مار دے“۔

چونکہ یہ حدیث ہمارے موضوع کے بہت زیادہ متعلق ہے، اس لیے اس میں جو رہنمائی کی گئی ہے، اس کے اہم نکات پیش کیے جاتے ہیں۔

امت کے ابتدائی حصے میں عافیت، آخری حصے میں ابتلائیں

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس امت کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے عافیت رکھ دی ہے آخری حصے میں ابتلائیں آئیں گی۔ تم ایسے معاملات دیکھو گے جو تمھارے لیے اجنبی ہوں گے۔ جس سے تمھارے اندر نکارت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ نکارت ختم ہوتی چلی جائے گی اور محض چند لوگوں ہی میں نکارت رہ جائے گی۔ عام عوام کے لیے معاملات نارمل ہو جائیں گے بلکہ شیرِ مادر کی مانند فطری بن جائیں گے جیسے وہ ہوا اور پانی کو فطری سمجھتے ہیں اسی طرح شر کے بہت سے مظاہر کو بھی بالکل فطری سمجھنے لگیں گے۔ اور وہی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: «بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا، وَسَيَعُودُ غَرِيبًا،

فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ». (ابنِ ماجہ) ''اسلام شروع میں اجنبی تھا اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا، پس اجنبیوں کے لیے بشارت ہے''۔

فتنوں کا ظہور

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر فتنہ آئے گا جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو ہلکا کر دے گا۔ یعنی مومن فتنہ دیکھ کر کہے گا کہ یہ تو میری جان لے لے گا یا یہ میرے ایمان پر موثر ہو جائے گا۔ پھر وہ فتنہ جاتا رہے گا اور ایک اور فتنہ آئے گا تو مومن کہے گا کہ اصل فتنہ تو اب آیا ہے، پچھلا تو کوئی خاص نہ تھا۔ تو اب اس سے متعلق آدمی خیال کرے گا کہ بس اس میں تو میرا دین ایمان ضائع ہو جائے گا یا میری جان کام آجائے گی۔

ہدایات

یہاں تک جو حالات آپ ﷺ نے بیان فرمائے وہ تکوین پر مشتمل ہیں۔ روایت کے آخر میں تشریع کا بیان ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پیش گوئیوں کی اکثر روایات میں تکوین اور تشریع ساتھ ساتھ چل رہے ہیں کہ یوں ہو گا اور تمھیں ایسا کرنا ہے۔

اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان

حدیث میں تشریعی ہدایت کے ضمن میں فرمایا کہ جس کو جہنم سے ہٹا دیا جانا اور جنت میں داخل ہونا پسند ہو، اس کو چاہیے کہ اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ گویا دورِ فتن میں سب سے اہم چیز اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ واضح رہے کہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان وہی معتبر ہے جو رسول کے ذریعے ہم تک پہنچا اور جس کی تفصیل ہمیں پیغمبر ﷺ نے بتا دی۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ ایمان کو مضبوط کرنے کی سعی کرے۔

جیسا اپنے لیے چاہتے ہو، دوسروں کے لیے بھی ویسا ہی پسند کرو

پھر فرمایا کہ وہ شخص لوگوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جیسا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا جائے۔ یہ بات ایک دوسری حدیث میں یوں بیان ہوئی: «لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ». (بخاری) ''تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ نہ چاہے جو اپنے نفس کے لیے چاہتا ہے''۔ یہ بہت عظیم حدیث ہے اور جوامع الکلم میں سے ہے۔ اس کے معنی کی بہت سی پرتیں ہیں لیکن ایک بڑا مفہوم وہی ہے جو ہماری زیرِ بحث حدیث میں بھی بیان ہوا کہ جو تم اپنے لیے چاہتے ہو وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرو۔ تم چاہتے ہو کہ تمھاری جان، مال، آبرو پر کوئی حملہ نہ ہو، تمھاری خیر خواہی برتی جائے، تمھاری غیر موجودگی میں تمھاری برائی نہ کی جائے، تمھارا مال نہ لوٹا جائے، تم پر تہمت نہ لگائی جائے تمھیں، کم تول کر نہ دیا جائے، تمھیں ملاوٹ والا مال نہ دیا جائے وغیرہ، تو تمھیں چاہیے کہ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرو۔

استطاعت کے مطابق امام کی اطاعت ضروری ہے

اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک اہم ہدایت دی جو ایمان سے متعلق ہے کہ جس نے کسی امام سے بیعت کی اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور اپنے جسم و جاں اس کے سپرد کر دیے تو پھر اپنی استطاعت کے مطابق اس کے احکامات مانے اور اطاعت کرے۔ تاہم اس میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ: «لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ». (مسندِ احمد) ''اللہ تعالیٰ کی معصیت ہوتی ہو تو مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی''۔ مزید آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک حکمران یا خلیفہ مقرر ہے اور اقتدار اس کے ہاتھ ہے اور کوئی دوسرا شخص اٹھے جو اس سے کھینچ تان کرے اور اس کے خلاف خروج کرے تو یہ فتنہ گر ہے اس کی گردن مار دو۔ اس روایت میں نبیٔ کریم ﷺ نے اپنی بنیادی ذمے داری پوری کرتے ہوئے خیر و شر کی بابت بھی بتا دیا، امت کے بارے میں پیش گوئی فرمائی اور یہ بھی بتا دیا کہ جب ایسے حالات آئیں تو تمھیں کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔

معرفتِ شر اور احادیثِ فتن

رسول اللہ ﷺ نے عبادت کے طور طریقے، معاشرت، تجارت اور سیاست کے اصول وآداب سمیت بہت ساری چیزیں جو دینی معاملات میں داخل ہیں، رہنمائی کی، جن میں کچھ تو اوامر ہیں اور کچھ مناہی ہیں۔ جبکہ ان کے علاوہ معاملات میں رہنمائی کی ایک صورت مستقبل کے شرور وفتن سے آگاہی ہے، جس پر احادیثِ فتن مشتمل ہیں۔ یہاں بھی رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کی رہنمائی فرمائی ہے، اس کی یہاں چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «كُنَّا قُعُودًا عِنْدَ رَسُولِ اللهِ، فَذَكَرَ الْفِتَنَ فَأَكْثَرَ فِي ذِكْرِهَا». (ابوداود) ”ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے تو آپ نے فتنوں کا ذکر کیا اور بہت سارے فتنوں کو بیان کیا“۔ ایک دوسرے موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تَكُونُ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا». (ترمذی) ”قیامت سے پہلے بہت سے فتنے ہوں گے جیسے اندھیاری راتیں، ان میں بندہ صبح کرے گا حالت ایمان میں اور وہ شام کرے گا حالت کفر میں“۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا: «فَوَاللهِ مَا الْفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ وَلَكِنِّي أَخْشَى أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ». (بخاری) ”اللہ کی قسم! مجھے تمھارے متعلق محتاجی سے ڈر نہیں لگتا، مجھے تو اس کا خوف ہے کہ دنیا تم پر بھی اسی طرح کشادہ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلوں پر کشادہ کی گئی تھی، پھر پہلوں کی طرح اس کے لیے تم آپس میں حسد کرو گے اور جس طرح وہ ہلاک ہو گئے تھے تمھیں بھی یہ چیز ہلاک کر کے رہے گی“۔ ان مثالوں سے بات واضح ہوتی ہے کہ احادیثِ فتن کے مطالعے کی ایک وجہ در حقیقت اس علمِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام سے آگاہی حاصل کرنی ہے جو مستقبل کے شرور کے حوالے سے آپ ﷺ نے سکھایا ہے۔ احادیث میں فتن کے لیے شر کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ شر کی اقسام کا بیان اگلے صفحات میں قدرے تفصیل سے آئے گا، سرِ دست یہ جان لینا چاہیے کہ اس کی دو بڑی اقسام ہیں: اخلاقی شر اور تکوینی شر، اخلاقی شر سے برائیوں کا ظہور مراد ہے، مثلاً بدکاری، شراب

نوشی عام ہو جائے۔ سود خوری، رشوت خوری اور خیانت و جہالت کا رواج ہو جائے۔ تکوینی شر سے مراد ہے کہ خارج کے حالات ساز گار نہ رہیں، مثلاً خشک سالی اور قحط پیدا ہو جائے، زلزلے ہونے لگیں اور آندھیاں چلنے لگیں۔ یہ دو طرح کے شرور ہیں جن کا تذکرہ نبی اکرم ﷺ کی ان احادیث میں ہے۔

اب یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ہم علمِ شرور یا فتن کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس تحصیل سے ہماری نیت کیا ہے؟ تو پہلی بات یہ ہے کہ تحفظِ دین کے لیے بھی علمِ شرور اور امورِ جاہلیت سے واقفیت ضروری ہے، اس لیے کہ کسی چیز کو خالص رکھنے کے لیے اس کے نقیض اور ضد سے اسے بچانا ضروری ہے۔ جبکہ یہ اسی صورت ہو سکتا ہے جب ہم اس کے نقیض کو پہچان لیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول منسوب ہے جسے کئی اکابرین نے نقل کیا ہے، جس میں آپ رضی اللہ عنہ اسلام کے زوال کی ایک وجہ جاہلیت سے ناواقفیت کو قرار دیتے ہیں: إِنَّمَا تُنْقَضُ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً إِذَا نَشَأَ فِي الْإِسْلَامِ مَنْ لَمْ يَعْرِفْ الْجَاهِلِيَّةَ (المجموع القیّم: ص، ۶۸۴، مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ) ”اسلام کی کڑیاں ایک ایک کر کے بکھر جائیں گی جب اسلام میں ایسے لوگ پروان چڑھیں گے کہ جو جاہلیت کو نہیں جانتے“۔ یعنی جو بندہ شر سے واقف ہوگا اس میں شر سے بے زاری اور اجتناب کا جذبہ زیادہ پایا جائے گا اور اس میں نیکی کی محبت و قدر اور اس کی طرف لپک بھی زیادہ پائی جائے گی۔ ایک بہت مشہور شاعر ہیں ابو فراس الحمدانی، ان کا ایک قِطعہ بہت معروف ہے، وہ کہتے ہیں:

عَرَفْتُ الشَّرَّ لا لِلشَّرِّ لَكِنْ لِتَوَقِّيهِ

وَمَنْ لَمْ يَعْرِفِ الشَّرَّ مِنَ الناسِ يقعْ فيهِ

اس کا مطلب ہے کہ میں شر کی پہچان حاصل کرتا ہوں شر کے لیے نہیں کہ مجھے شر کو اختیار کرنا ہے بلکہ میں شر کو اس لیے جاننا چاہتا ہوں تاکہ میں اس سے اپنے آپ کو بچا سکوں اور جو شر کو نہیں پہچانتا اور خیر کو شر سے ممتاز نہیں سمجھتا اس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ اس شر میں ملوث ہو جائے گا۔

معرفتِ شر کی داخلی اہمیت

اگر ہم غور کریں تو دین کا ایک بڑا مقصود تزکیۂ نفس ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ تزکیے کا ایک پہلو سلبی ہے، جس کو تخلیہ یا اَلتَّخَلِّي کہا جاتا ہے، اس کا لفظی مطلب ہے خالی کرنا، لیکن اس سے مراد ہے اپنے آپ کو کچھ چیزوں سے پاک کرنا۔ تزکیے کا ایک ایجابی پہلو ہے جس کو تحلیہ یا اَلتَّحَلِّي کہا جاتا ہے، اس کا لفظی مطلب ہے آراستہ کرنا اور اس سے مراد ہے خود کو اچھے اوصاف سے متّصف کرنا، ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ تزکیے کے سلبی پہلو کو "ترکِ رذائل" کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے ایجابی پہلو کو "کسبِ فضائل" کہا جاتا ہے۔ تو "ترکِ رذائل" کے لیے بھی شرور اور بطور خاص اخلاقی شرور کی معرفت ضروری ہے تاکہ انھیں ترک کیا جاسکے۔ امام ابو عبد اللہ الحارث بن اسد المحاسبی رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے صاحبِ علم ہیں۔ آپ تیسری صدی ہجری کے ہیں، ۲۴۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ آپ بڑے غیر معمولی آدمی تھے، اللہ نے ان کو نفس اور نفس کی باریکیوں کی بہت بصیرت دی تھی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی "احیاء علوم الدین" کا ایک بڑا ماخذ حارث المحاسبی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں ہیں۔ ان کی کتاب "الرعایۃ لحقوق اللہ" بہت معروف ہے، "رسالة المُسْتَرشِدين" بھی ان کی ایک معروف کتاب ہے۔ اسی طرح ان کی ایک کتاب "آدابُ النفوس" کے نام سے ہے۔ اسی کتاب "آدابُ النفوس" کا ایک باب "التطهير والعمل" ہے۔ اسی باب کا ایک ذیلی عنوان "أهَمِّيَّةُ التطهر من الآفات قبل العمل" ہے، یعنی عمل سے پہلے آفات و شرورِ نفس سے خود کو پاک کرنے کی اہمیت۔ انھوں نے تطہیر کی تعریف یوں کی ہے: الانتقال عن الشر إلى الأساس الذي يُبنى عليه الخير. "شر سے منتقل ہو کر اُن (فطری) بنیادوں پر آجانا جن پر نیکی کی بنیاد رکھی جاتی ہے"۔ آگے کہتے ہیں کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ عمارت گر جائے اس کی دیواریں گر جائیں لیکن بنیادیں باقی رہ جائیں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اساس گر جائے اور عمارت باقی رہے۔ اس کا مطلب ہے اساس کی اہمیت زیادہ ہے اور اساس ہے کہ شر کو چھوڑ کر خیر کی پوزیشن اختیار کی جائے، یہ اصل بنیاد ہے۔ اور اگر آپ شر کو جان کر اسے چھوڑ نہیں چکے تو پھر وہ اساس کہاں سے میسر آئے گی۔

کہتے ہیں کہ نفس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تطہیر کے عمل سے گھبراتا ہے اور نیکی کی طرف جاتا ہے۔ لہذا یہ بہت غیر معمولی بصیرت ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو پڑھ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جیسے وہ بھی یہی بیان کرتے ہیں۔ ہمارے قریب کے دور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ پڑھ لیں تو اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ وہ بھی انھیں بنیادوں پر اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ بہر حال، جتنے بھی ہمارے بڑے لوگ ہیں وہ بار بار یہی کہتے ہیں کہ تہجد پڑھنا، مجاہدہ کرنا اور صدقات اور خیرات کرنا بھی اہم ہے، لیکن ان سے زیادہ اہم گناہوں کا ترک کر دینا ہے۔ یعنی آپ حرام سے تو بچ نہیں رہے، حرام کمائی کر رہے ہیں، لیکن آپ انفاق بھی بے تحاشا کر رہے ہیں، تو وہ تو قبول ہی نہیں ہے: «إِنَّ اللّٰه طَيِّبٌ لاَ يَقْبَلُ إِلاَّ طَيِّبًا». (مسلم) ”بے شک اللہ طیب و پاک ہے اور وہ پاکیزہ چیز ہی قبول کرتا ہے“۔ یہ حدیث اس پر نص ہے کہ پہلے پاکیزگی حاصل کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ چیز کو قبول کرتے ہیں۔ امام حارث المحاسبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب سا مسئلہ ہے کہ نفس تطہیر سے گھبراتا ہے اور نیکیوں کی طرف جاتا ہے، کیونکہ تطہیر بھاری عمل ہے اور بغیر طہارت کے نیک عمل کرنے میں سہولت ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر یہ بات واضح ہو جائے کہ طہارات، طاعات پر مقدم ہیں، اس کا مطلب ہے کہ جو خیر والی چیزیں ہیں جن کے ذریعے خیر کو طلب کیا جا سکتا ہے، یعنی خیر کے ذرائع تو ان کی ضرورت انسان کو بہت زیادہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو آدمی بھی اپنے نفس پر غور کرے گا تو اس کو معلوم ہو گا کہ نفس انسان کو کیسے کیسے برباد کرتا ہے، پھر وہ اس پر غور کرے گا اور جانے گا کہ نفس اور خواہشاتِ نفس کی معرفت کی کیا اہمیت ہے، دشمن کی معرفت کی کیا اہمیت ہے۔ اگر وہ سمجھدار آدمی ہے تو اس کو پتا چل جائے گا کہ شر کی معرفت سب سے ضروری چیز ہے۔ پھر آگے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: لانه ليس العمل بكل الخير يلزم العبد الشر كُله لازمُ لِلعبد تركه. ”یہ اس لیے کہ ہر نیکی پر عمل کرنا بندے کے لیے ضروری نہیں ہے، البتہ ہر ایک شر سے اجتناب بندے کے لیے ضروری امر ہے“۔ یہ بات انھوں نے اس لیے فرمائی کہ خیر کے سارے اعمال لازمی نہیں ہیں کچھ فرض ہیں، کچھ واجب ہیں، کچھ مستحب ہیں، ان کے مراتب ہیں، لیکن شر سارے کا سارا ترک کرنا لازم ہے۔ کہتے ہیں کہ: ومن ترك الشر، وقع في الخير. ”جو آدمی شر کو چھوڑ دیتا

ہے وہ خود بخود خیر میں جا پڑتا ہے"۔ کہتے ہیں کہ: مَعْرِفَة العَبْد للشر فِيهَا علم الْخَيْر وَالشَّر. "بندے کا شر کی معرفت حاصل کرنا گویا اسے شر اور خیر دونوں کا علم دے دیتا ہے"۔ تو یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم شر کو کم از کم جانیں تو سہی تا کہ اس سے بچ سکیں۔

معرفتِ شر کی خارجی اہمیت

عام طور پر جب أَمْر بِالْمَعْرُوْفِ و نَهْيِ عَنِ الْمُنْكَر سے متعلق بات ہوتی ہے تو کچھ حلقوں کی طرف سے یہ بات آتی ہے کہ بھائی مثبت کام کرنا چاہیے، ایجابی کام کرنا چاہیے اور خیر کی بات کرنی چاہیے۔ امر بالمعروف پر زور زیادہ دینا چاہیے لیکن نہی عن المنکر پر توجہ ذرا کم ہو۔ اس طرح کے جملے بھی بعض اوقات عوام کی طرف سے سننے کو ملتے ہیں کہ نہی عن المنکر سے اور لوگوں کو برائی سے روکنے سے توڑ پیدا ہوتا ہے اور امر بالمعروف سے جوڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بہت مغالطہ آمیز جملے ہیں، ہو سکتا ہے کہ معروف کے امر و اختیار میں آپ سچے ہوں لیکن آپ کا اختیار کردہ معروف ہے بھی کہ نہیں ؟ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیونکہ آپ کے پاس جب منکر کا علم نہیں ہے، اس کے ازالے اور مناہی کا تصور نہیں ہے تو یہ بذاتِ خود ایک منکر ہے، جو آپ کی معروف کی دعوت پر ایک ایسا دھبہ ہے جو اسے داغ دار کر دیتا ہے۔ تو ہر حال میں منکر اور شر کا علم ضروری ہے، تا کہ اس سے اجتناب ہو اور یوں مناہی سے اجتناب؛ خیر کے اکتساب کی تکمیل میں معاون ہے۔ امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک بہت خوب صورت قول ہے: مَنْ لَمْ يَعْرِفْ إِلَّا الْخَيْرَ فَقَدْ يَأْتِيهِ الشَّرُّ، فَلَا يَعْرِفُ أَنَّهُ شَرٌّ، فَإِمَّا أَنْ يَقَعَ فِيهِ وَإِمَّا أَنْ لَا يُنْكِرَهُ. "جو صرف خیر ہی کو جانتا ہے وہ کبھی انجانے میں کسی شر کا ارتکاب بھی کر جاتا ہے، کیونکہ اس کے شر ہونے سے وہ واقف ہی نہیں ہوتا، تو اس ناواقفیت کی وجہ سے کبھی تو وہ شر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کبھی لوگوں کو اس سے منع کرنے میں کوتاہی کرتا ہے"۔ اس کے بعد امام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فَالْقَلْبُ السَّلِيمُ الْمَحْمُودُ، هُوَ الَّذِي يُرِيدُ الْخَيْرَ لَا الشَّرَّ، وَكَمَالُ ذَلِكَ بِأَنْ يَعْرِفَ الْخَيْرَ وَالشَّرَّ، فَأَمَّا مَنْ لَا يَعْرِفُ الشَّرَّ فَذَاكَ نَقْصٌ فِيهِ لَا يُمْدَحُ بِهِ. "قابلِ تعریف قلب سلیم وہ ہے جو خیر کو چاہے نہ کہ شر کو، جبکہ

اس کا کمال یہ ہے کہ وہ خیر اور شر دونوں کو پہچانتا ہو۔ جو شخص شر کو نہیں پہچانتا تو یہ ایک بڑا نقص ہے اس کی مدح نہیں کی جائے گی"۔ تو انسان کو چاہیے کہ وہ خیر کے ساتھ ساتھ شر کو بھی پہچانے، اپنے زمانے کے شر اور فتنوں کو بھی پہچانے تاکہ شر سے خود کو بچا سکے۔ تو یہ ایک حکمت ہے جس کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کو فتن اور شرور کے بارے میں آگاہ کیا۔ چنانچہ ایک اسرائیلی روایت میں مختلف انبیاے کرام کی کتابوں کی خاص خاص حکمتوں کا بیان ہوا ہے۔ یہ روایت کئی کتابوں میں نقل ہوئی ہے، جو ابنِ حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کی ہے اور الترغیب والترھیب میں بھی ہے۔ اسی طرح دیگر لوگوں نے بھی اس روایت کو مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔

اس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کی حکمت کے حوالے سے بیان ہوا ہے: وَعَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ، مُقْبِلًا عَلَى شَأْنِهِ، حَافِظًا لِلِسَانِهِ، وَمَنْ حَسَبَ كَلَامَهُ مِنْ عَمَلِهِ قَلَّ كَلَامُهُ إِلَّا فِيمَا يَعْنِيهِ "عاقل کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کی بصیرت رکھتا ہو، اپنے معاملات کی طرف متوجہ ہو، اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو، (آگے بہت خوبصورت جملہ ہے) جو آدمی اپنے کلام کو اپنا عمل شمار کرتا ہے اس کا کلام بہت کم ہو جاتا ہے، مگر اسی معاملے میں جو بامعنی ہو"۔ یہ بہت اہم بات ہے، یعنی ہم عام طور پر کلام کو عمل نہیں سمجھتے، کہتے ہیں یہ تو گپ شپ ہے، ہم کوئی گناہ تھوڑی کر رہے ہیں، ہم تو بس لطف لے رہے ہیں، اپنی ذہنی عیاشی کا بندوبست کر رہے ہیں۔ حالانکہ زبان کی بھی ایک لذت ہے اور کانوں کی بھی ایک لذت ہے، تو یہ کہہ رہے ہیں کہ جو آدمی کلام کو عمل سمجھتا ہے، پھر وہ الرٹ رہتا ہے اور اس کا کلام کم ہو جاتا ہے۔ امام ابنِ عابدین رحمۃ اللہ علیہ جو کہ غیر معمولی فقاہت رکھنے والے حنفی فقیہ تھے، ان کا یہ قول بھی بہت معروف ہے: مَنْ جَهِلَ بِأَهْلِ زَمَانِهِ، فَهُوَ جَاهِلٌ. جو اپنے زمانے والوں سے، ان کے طور اطوار سے، ان کے افکار و اعمال سے واقف نہیں، گویا وہ جاہل ہے۔ لہٰذا ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کی بصیرت اور اپنے زمانے کے شر اور فتنے کا علم رکھنا کتنا ضروری ہے۔

احادیثِ فتن اور آخرت کی تیاری

پیش گوئیوں والی احادیث میں سب سے بڑی حکمت تو یہ پیغام ہے کہ اس دنیا پر جو سب سے بڑا واقعہ ہونے والا ہے وہ اس دنیا کی موت ہے۔ جیسے ہر انسان کی زندگی کا جو سب سے اہم ایونٹ ہے وہ اس کی موت ہے۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا ایونٹ ہے کہ جو انسان کی زندگی کے لیے بہت بنیادی چیز ہے۔ اسی طرح سے اس کائنات کے حوالے سے بھی یہ چیز بہت اہم ہے کہ اس کائنات پر ایک دن موت آئے گی۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑا واقعہ ہے جسے قرآنِ کریم میں الحاقہ اور الواقعہ کہا گیا ہے، اس کی یاد دہانی سورۂ واقعہ کی شروع کی آیات میں ہے۔ پھر سورۃ الفجر میں فرمایا: ﴿يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ﴾ (الفجر: ۲۳) ''اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟''، لہذا ہر دم یہ یاد دہانی ہوتی رہے کہ دنیا کا خاتمہ ہو گا، اس گھڑی کے آنے کو ہمیشہ سامنے اور مستحضر رکھنا چاہیے کہ اپنے مخلوق ہونے اور اپنے فانی ہونے کا جو تصور ہے اس کو کبھی نہ بھلانا اور اسی طرح اس کائنات کے مخلوق ہونے اور اس کائنات کے فانی ہونے کے آئیڈیا کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں تو جو اہلِ مغرب اور جدیدیت کا شکار لوگ ہیں ان کا خیال ہے کہ جیسے یہ دنیا ہمیشہ رہے گی۔ قرآنِ مجید میں آیا ہے: ﴿يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ﴾ (الهمزة: ۳) ''وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا''۔ یعنی وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ ہمیشہ رہے گا یا اس کا مال اس کو خلود عطا کر دے گا۔ حالانکہ اصل بات تو یہ ہے کہ انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ نہ مجھے ہمیشہ رہنا ہے، نہ ہی اس دنیا کو ہمیشہ چلنا ہے، مجھے بھی یہاں سے جانا ہے اور دنیا کا بھی خاتمہ ہونا ہے اور اس دنیا کے خاتمے کے بعد آخرت میں انسان کی اللہ کے سامنے پیشی ہوگی۔ لہذا اس اہم مقصد کے لیے استعداد پیدا کرنے اور اس کے لیے بھرپور تیاری کرنے کی ضرورت ہے تا کہ انسان اس بات کا اہتمام کرے کہ کسی بھی وقت یہ دنیا ختم ہو سکتی ہے، مجھے اس کے لیے محنت کرنی ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟'' اس نے

کہا:ما أَعْدَدْتُ لَهَا مِن كَثِيرِ صَلَاةٍ وَلَا صَوْمٍ وَلَا صَدَقَةٍ، وَلَكِنِّي أُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ''میں نے زیادہ نمازوں، روزے اور صدقے کے ساتھ قیامت کی کوئی تیاری نہیں کی! سوائے اس کے کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا:«أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ».(بخاری) ''تم روزِ قیامت انھی کے ساتھ ہو گا جن سے تم محبت رکھتے ہو''۔ یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ اَلسَّاعَة تو ہو کر رہنی ہے وہ تو شُدنی ہے، اصل سوال یہ ہے کہ تم نے اس کے لیے تیاری کب کی ہے؟ تو آخرت کی یاد دہانی اور علاماتِ قیامت کا بیان گویا اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ انسان اس بڑے واقعے کو یاد رکھے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ حدیث «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ». کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث اور حدیثِ جبرائیل میں یہ الفاظ آتے ہیں:«إِنْ يَعِشْ هَذَا الْغُلَامُ فَعَسَى أَنْ لَا يُدْرِكَهُ الْهَرَمُ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ». ''اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو قریب ہے کہ اس کے بڑھاپے سے پہلے قیامت آجائے''۔ بظاہر پہلی اور دوسری حدیث میں تناقض ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث میں کوئی منافات نہیں ہیں، گویا قطعی وقتِ قیامت کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا، لیکن اس کی کچھ علامتیں ہیں، جو اس سے پہلے واقع ہوں گی اور وہ نبی ﷺ نے بیان کی ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کے اپنے ظہورِ مسعود کو قربِ قیامت کی نشانی بتانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ قیامت کے وقت کا تعین فرمارہے ہیں۔ دراصل قیامت سے پہلے رونما ہونے والے مختلف واقعات کا آپ ﷺ کی طرف سے خبر کا دیا جانا بقول حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ غافلوں کو بیدار کرنے اور ان کو توبہ کی طرف مائل کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ قیامت کی کچھ تیاری کریں۔ قرآنِ مجید میں ایک جگہ فرمایا:﴿أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ﴾ (الفاطر:۳۷) ''کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمھارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آچکا تھا''۔ یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ کیا تمھیں اتنی عمر نہیں دی گئی تھی کہ جس نے خیال کرنا ہو وہ خیال کر لے جبکہ تمھارے پاس نذیر بھی آگیا؟ تو گویا اسی طریقے سے نبی اکرم ﷺ نذیر ہیں اور وہ نذیر ہیں جو انسان کی موت کے لیے بھی خبردار کر رہے ہیں اور اس کائنات کی موت کے لیے بھی لوگوں کو

خبردار کر رہے ہیں۔ تو احادیث اشراط الساعۃ کا ایک بڑا فائدہ مستقبل کے سب سے بڑے واقعے قیامت کی حاضری کی تیاری اور اس کے لیے توبہ کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

احادیثِ فتن اور دلائل النبوۃ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

احادیثِ فتن کی اہمیت ایک اور پہلو سے بھی ہے اور وہ ہے دلائل النبوۃ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام یعنی نبی کریم ﷺ کی نبوت کی نشانیاں۔ قرآنِ مجید بھی آپ کی دلائل النبوۃ میں سے سب سے بڑی دلیل ہے۔ قرآنِ مجید نے ماضی کی خبریں بھی دی ہیں، مستقبل کی باتیں بھی بتائی ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ». (ترمذی) "اس میں تم سے پہلے کی باتیں بھی ہیں اور بعد کی خبریں بھی ہیں"۔ قرآن مجید کے بعد نبی کریم ﷺ نے مستقبل کے حالات و حادثات کے بارے میں بہت ساری خبریں دی ہیں، جن پر ہمارے اکابرین نے بہت کام کیا ہے اور بہت سے لوگوں نے تو اس پر باقاعدہ پوری پوری کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "دلائل النبوۃ" ہے، پھر امام فریابی رحمۃ اللہ علیہ کی "دلائل النبوۃ" ہے، اسی طریقے سے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی "دلائل النبوۃ" بہت معروف کتاب ہے۔ لہٰذا دلائل النبوۃ ایک اہم موضوع ہے اور سیرت کی اہم کتابوں میں ضرور بیان ہوتا ہے۔ سیرت کی معروف کتاب "الشفاء بتعریفِ حقوقِ المصطفیٰ ﷺ" میں جہاں نبی اکرم ﷺ کی شان، آپ کا خَلق اور خُلق بیان ہوا ہے وہاں آپ کی نبوت کے دلائل بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ تو ان دلائلِ نبوت میں سے ایک نبی کریم ﷺ کی وہ پیش گوئیاں بھی ہیں جو آپ ﷺ نے مستقبل کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں۔

مستقبلِ قریب کے بارے میں نبوی پیش گوئیاں

نبی کریم ﷺ نے کچھ ایسی پیش گوئیاں ارشاد فرمائیں جو مستقبل قریب کے بارے میں تھیں، جو فوری یا پھر آپ ﷺ کے حینِ حیات ہی میں بالکل سامنے آگئیں۔ ان کی چند مثالیں یہ ہیں؛ جب تبوک کا معاملہ تھا اور نبی اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب تبوک کی طرف جا رہے تھے تو آپ ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا ہوا تھا،

اس موقعے پر آپ ﷺ نے فرمایا: «سَتَهُبُّ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَةَ رِيحٌ شَدِيدَةٌ، فَلَا يَقُمْ فِيهَا أَحَدٌ مِنْكُمْ فَمَنْ كَانَ لَهُ بَعِيرٌ فَلْيَشُدَّ عِقَالَهُ». (مسلم) ’’رات آنے والی ہے، اس میں شدید جھکڑ چلے گا، شدید آندھی آئے گی تو تم میں سے کوئی آدمی بھی علیحدہ سے کھڑا نہ ہو اور جس کے پاس کوئی اونٹ ہے تو وہ اس کو بھی اچھی طرح باندھ لے‘‘۔ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ البتہ ایک صاحب نے شاید توجہ نہیں دی یا کیا ہوا کہ وہ ایک دم کھڑے ہوئے اور پھر اتنی تیزی سے ہوا آئی کہ وہ پہاڑوں سے جا کر ٹکرائے۔ روایت میں الفاظ آتے ہیں: «فَهَبَّتْ رِيحٌ شَدِيدَةٌ، فَقَامَ رَجُلٌ فَحَمَلَتْهُ الرِّيحُ حَتَّى أَلْقَتْهُ بِجَبَلَيْ طَيِّئٍ». یہ مسلم کی روایت ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: هَذَا الْحَدِيثُ فِيهِ هَذِهِ الْمُعْجِزَةُ الظَّاهِرَةُ مِنْ إِخْبَارِهِ ﷺ بِالْمَغِيبِ وَخَوْفِ الضَّرَرِ مِنَ الْقِيَامِ وَقْتَ الرِّيحِ وَفِيهِ مَا كَانَ عَلَيْهِ ﷺ مِنَ الشَّفَقَةِ عَلَى أُمَّتِهِ وَالرَّحْمَةِ لَهُمْ وَالِاعْتِنَاءِ بِمَصَالِحِهِمْ وَتَحْذِيرُهُمْ مَا يَضُرُّهُمْ فِي دِينٍ أَوْ دُنْيَا. (المنہاج، شرح صحیح مسلم) ’’اس حدیث میں بالکل ظاہری اور جلی معجزہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غیب کی جو خبر دی ہے کہ جب یہ آندھی آئے تو اس وقت قیام کرنے میں اندیشہ ہے اور اس روایت میں آپ ﷺ کی امت پر شفقت و رحمت اور ان کے مصالح کا خیال رکھنا اور دین و دنیا کے معاملات میں نقصان دہ چیزوں سے خبردار کرنے کا بیان ہے‘‘۔ اسی طرح سورۃ الممتحنہ میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے ایک کوتاہی ہو گئی اور انھوں نے ایک خاتون کے ذریعے ایک خط قریش کو پہنچانے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا زبیر اور سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھیجا اور فرمایا: «انْطَلِقُوا حَتَّى تَأْتُوا رَوْضَةَ خَاخٍ، فَإِنَّ بِهَا ظَعِينَةً، وَمَعَهَا كِتَابٌ فَخُذُوهُ مِنْهَا». (بخاری) ’’چلتے جاؤ یہاں تک کہ تم باغِ خاخ (ایک خاص مقام) پہنچو تو وہاں ایک خاتون ملے گی جو سوار ہو کر جا رہی ہے اور اس کے پاس وہ خط ہے تو تم اس سے وہ لے لو‘‘۔ اور بالکل ایسا ہی ہوا، جب وہ وہاں گئے ہیں اور خاتون کو وہاں پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ وہ خط نکالو تو اُس نے انکار کر دیا، تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا فرمایا ہے تو بات غلط ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا خط تمھارے ہی پاس ہے اگر تم نہیں دو گی تو ہم تمھیں بالکل

برہنہ کر کے تم سے خط برآمد کرلیں گے۔ بہر حال خط نکل آیا، یہ بھی دلائل النبوۃ میں سے ہے، پیش گوئی ہے اور یہ بالکل نزدیک ہی ظہور پذیر ہوگئی۔ اسی طرح کی ایک روایت اُمِّ حرام رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک موقعے پر فرمایا: «أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ البَحْرَ قَدْ أَوْجَبُوا». قَالَتْ أُمُّ حَرَامٍ: قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ أَنَا فِيهِمْ؟ قَالَ: «أَنْتِ فِيهِمْ». ثُمَّ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ». فَقُلْتُ: أَنَا فِيهِمْ يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «لاَ». (بخاری) ”میری امت کا وہ پہلا لشکر ہے جو ایک جنگی لشکر ہوگا جو سمندری ہوگا اس پر اللہ تعالیٰ کی جنت یا رحمت واجب ہو جائے گی۔ تو سیدہ اُمِّ حرام رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا میں اُن میں ہوں گی (یا میں اُن میں شامل ہو سکتی ہوں)؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس لشکر میں سے ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا جو پہلا لشکر قیصر کے شہر کے اوپر حملہ کرے گا، اس کی بھی مغفرت کر دی گئی ہے۔ پھر اُمِّ حرام رضی اللہ عنہا نے عرض کی کیا میں اُن میں ہوں گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں“۔ چنانچہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو پہلا لشکر گیا تھا یعنی جو سمندری مہم تھی اس میں اُمِّ حرام رضی اللہ عنہا شامل ہوئیں اور پھر جب وہاں سے واپس آئیں تو آکر جب اپنی سواری پر بیٹھنے لگیں تو وہاں سے گر گئیں اور وہیں پر ان کی شہادت ہوگئی۔ یہ سب دلائل النبوۃ میں سے ہیں۔ اسی طرح سے نبی اکرم ﷺ جو غیب کی خبریں بتاتے تھے وہ بھی دلائلِ نبوت میں سے ہیں۔ ایک غیب وہ ہوتا ہے جو مطلقاً غیب ہوتا ہے جو کبھی شہود نہیں ہوگا، آخرت میں جا کر شہود ہوگا اور دوسرا غیب وہ ہوتا ہے جو اضافی غیب ہوتا ہے۔ تو اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ اسی طرح مطلق غیب کے بارے میں بھی آپ ﷺ بتا رہے ہیں یعنی ہمارے لیے جنت جہنم اور اللہ کی ذات خاص معنوں میں مطلق غیب ہے۔ لیکن نبی ﷺ نے ان کے بارے میں بھی ہمیں بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن چیزوں کا مشاہدہ اپنے پیغمبر ﷺ کو کروایا ہے۔ جنگِ موتہ کے موقعے پر سیدنا زید، سیدنا جعفر اور سیدنا ابنِ رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر نبی اکرم ﷺ مدینہ میں بیٹھ کر صحابہ کو دے رہے ہیں اور کتنی ہی روایتیں ہیں جو اس مدعے کی شاہد ہیں۔ ایک روایت میں نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی چھے نشانیاں بیان کیں جن میں

آپ ﷺ کا انتقال فرمانا اور بیت المقدس کی فتح بھی شامل تھی۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَفِيهِ أَشْيَاءُ مِنْ عَلَامَات النُّبُوَّة قد ظهر أَكْثَرهَا. (فتح الباري، ج:٦،ص:٢٧٨)''اس میں سے کتنی ہی چیزیں نبوت کے دلائل میں سے ہیں جو ظاہر ہو چکی ہیں''۔ بہر حال جب ہم احادیثِ فتن اور نبوی پیش گوئیوں کو پڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ کس طرح وہ پیش گوئیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس طرح اس سے ہمارے ایمان ویقین میں بھی یقیناً اضافہ ہوگا۔ پھر جب ہم ان احادیث کو سمجھ کر اپنے خاص حالات میں ان سے فائدہ اٹھائیں گے تو اس سے نبی اکرم ﷺ کی احسان مندی اور آپ کی محبت وتعلق میں اضافہ ہوگا۔

مستقبلِ بعید کے متعلق پیش گوئیاں

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے مستقبلِ قریب کے متعلق جو پیش گوئیاں فرمائیں اور وہ اسی زمانے میں ہی ظہور پذیر ہوئیں، اسی طرح آپ ﷺ نے کچھ ایسی پیش گوئیاں بھی ارشاد فرمائیں جو مستقبلِ بعید یعنی قربِ قیامت میں رونما ہوں گی۔ چنانچہ علاماتِ قیامت، ملاحم اور فتن کی اخبار، دجال اور یاجوج ماجوج کے متعلق ارشادات اسی قسم میں شامل ہیں۔ جبکہ یہی ہماری گزارشات کا مرکزی موضوع ہے۔ آنے والے مباحث میں انھی پیش گوئیوں کے فہم کے اصول سمیت بہت ساری جزئیات پر بات ہوگی اور ضمناً اس موضوع کی کچھ احادیث کا مطالعہ بھی کیا جائے گا۔ اب تک ہم نے احادیثِ فتن کے مطالعے وفہم کی اہمیت مختلف اعتبارات سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اب ہم اس اہم موضوع کی ترکیب وترتیب پر کچھ بات کریں گے۔

فتن کا مفہوم

فتن، فتنہ کی جمع ہے اور فتنہ کا بنیادی مفہوم ہے ابتلا، یعنی آزمائش یا جانچ، ابتلا اور فتنہ آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ قرآنِ مجید میں سورۃ الانبیاء میں فرمایا: ﴿وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ﴾ (الانبیاء:۳۵)''اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے''۔ اس آیت میں شر اور خیر، سیاق وسباق کے لحاظ سے تکوینی شر اور خیر ہے۔

تکوینی خیر و شر

قرآنِ مجید میں خیر و شر، حسنہ و سیئہ اور اس طرح کے جوڑے تکوینی معنوں میں بھی آتے ہیں اور تشریعی معنوں میں بھی۔ یعنی تکوینی شر کا مطلب ہے برے حالات، تکلیف، پریشانی، بیماری، فقر و فاقہ، جان و مال، عزت و آبرو کا کوئی نقصان۔ جیسے قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾(البقرة:١٥٥)"اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمھاری آزمائش کریں گے"۔ یعنی یہ تکوینی شر کی مثال ہے کہ اس طرح کے آزمائش والے حالات، تکلیف و پریشانی والے حالات سے ہم تمھاری آزمائش کریں گے۔ اب اس کے مقابل میں تکوینی خیر یہ ہے کہ انسان بھلا چنگا ہو، کھانے کو روٹی مہیا ہو، مال میسر ہو، عزت آبرو محفوظ ہو، اس کی اولاد ہو، جو محنت کش ہو اور پھل پھول رہی ہو۔

تشریعی خیر و شر

تکوینی خیر کے برعکس اخلاقی یا تشریعی خیر یہ ہے کہ نیک اعمال یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ، سچائی، امانت، دیانت، جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہوں۔ اسی طرح تشریعی یا اخلاقی شر کی مثالیں شرک، کفر، گمراہی، جھوٹ، غیبت، قتل، بدکاری وغیرہ ہیں۔ گویا سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہم تمھاری جانچ کریں گے برے حالات سے بھی اور اچھے حالات سے بھی۔ یعنی خیر اور شر اصل میں ایک جانچ ہے، "لنبلوکم" اور "فتنة" ان دونوں الفاظ کا مفہوم قریب قریب ہے اور فتنہ گویا ابتلا کو ہی کہتے ہیں۔ انسان مخلوق ہے اور مخلوق ایک آزمائش کی صورتِ حال میں ہی رہے گی، یہ ہمارے قیاس کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلامِ مجید میں ہم پر یہ بات واضح کر دی ہے۔ چنانچہ سورۃ الملک کی دوسری آیت میں ہے:﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾(الملک:٢)"اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے"۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قانون بتا دیا کہ موت و حیات کو خلق کرنے کا

مقصد ہی یہ ہے کہ وہ تمھیں جانچے کہ تم میں سے کون عمل کے اعتبار سے بہتر ہے۔ اسی طرح سورۃ الانبیاء میں اس کا طریقہٗ کار بتادیا کہ یہ ابتلا کیسے ہوتی ہے، یعنی شر اور خیر کے ذریعے سے اور یہ دونوں معنوں یعنی تکوینی اور تشریعی میں شر اور خیر ہے، کیونکہ آزمائش یہی ہے۔ سورۃ الدہر میں فرمایا: ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (الدہر: ۳) ''ہم نے اسے راستہ دکھادیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا''۔ یہاں شاکراً اور کفوراً در حقیقت تشریعی یا اخلاقی خیر و شر ہے۔ انسان پر ہر طرح کے خشک و تر حالات آئیں گے تاکہ جانچا جائے کہ وہ اس میں کیا روّیہ اختیار کرتا ہے۔ ایک بہت ہی خوبصورت روایت ہے: «عَجَباً لأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَلِكَ لأَحِدٍ إِلاَّ لِلْمُؤْمِنِ: إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْراً لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْراً لَهُ». (مسلم) ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر کام میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ اگر اسے آسودہ حالی ملتی ہے اور اس پر وہ شکر کرتا ہے تو یہ شکر کرنا اس کے لیے باعثِ خیر ہے اور اگر اسے کوئی تنگی لاحق ہوتی ہے اور اس پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر کرنا بھی اس کے لیے باعثِ خیر ہے''۔ اس سے بخوبی یہ بات پتا چلتی ہے کہ مومن کے سوا کسی اور کے لیے یہ معاملہ ہے ہی نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اگر معاملہ تشریعی ہے تو اس میں دو رویے ممکن ہیں: ایک ناشکری کا، دوسرا شکر گزاری کا، ایک کفر کا، دوسرا شکر کا۔ پھر حدیث میں بیان کیا کہ انسان پر تکوین کے حوالے سے جو بھی وارد ہوتا ہے اس میں آزمائش یہی ہے کہ اگر اس کو کوئی خوشگوار چیز پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے، فَكَانَ خَيْرًا له، یعنی یہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف یا ضرر پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی مآل کے اعتبار سے اس کے لیے بہتر ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ جانچ کر رہے ہیں کبھی اچھے حالات سے، کبھی برے حالات سے، کبھی سخت حالات سے تو کبھی خوشگوار حالات سے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایک قول منسوب ہے: الدَّهْرُ يَوْمان، يَوْمٌ لَکَ و يَوْمٌ عَلَيْکَ، إنْ کان لَکَ فَاشْکُرْ وإن کان عَلَيْکَ فَاصْبِر. ''دنیا دو دن کا مجموعہ ہے، کوئی دن تمھارے حق میں ہے کوئی دن تمھارے خلاف ہے۔ جو دن تمھارے حق میں ہے اس میں شکر کرنا ہے اور جو دن تمھارے

خلاف ہے تو اس میں تمھیں صبر کرنا ہے"۔ اگر ہم غور کریں تو قرآنِ مجید میں سورۃ الفجر میں اس بات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ انسان کا عجیب حال ہو جاتا ہے: ﴿فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ، وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ﴾ (الفجر: ۱۵-۱۶) "مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"۔

دنیاوی خوشحالی اللہ کی رضا کی علامت نہیں

ماقبل مذکورہ آیات میں انسان کے ایک عجیب معاملے کا بیان ہے کہ جب اس کا رب نعمتوں کے ذریعے اس کی جانچ کرتا ہے، تو اس کو نوازتا اور عزت دیتا ہے، اسے فتنۂ سرّاء یعنی خوشحالی اور صحت کے فتنے میں میں مبتلا کرتا ہے تو انسان اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ دنیا کے اچھے حالات اللہ تعالیٰ کی رضا کی لازمی علامت ہیں اور کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے نوازا۔ پھر جب وہی اللہ اس کی تکالیف و پریشانیوں سے آزمائش کرتا ہے، اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب وہ فتنۂ ضرّاء میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے رسوا کر دیا۔

یہ ایک غلط فہمی ہے جس کی طرف قرآن نے توجہ دلائی ہے کہ جو افراد یا قومیں دنیا میں پھل پھول رہی ہیں اور دیگر اقوام پر سبقت لے جا رہی ہیں ان سے شاید اللہ راضی ہے اور جو افراد، جماعتیں، گروہ یا قومیں دنیا میں پِسی ہوئی ہیں، دبی ہوئی، مظلوم اور ذلیل و رسوا ہیں، ان کے بارے میں یہ تصور قائم کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہے۔ حالانکہ یہ ایک صریح غلط فہمی ہے جس کو دور کیا گیا ہے۔ لہذا یہ بات واضح ہو گئی کہ: ﴿فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ﴾ اور ﴿فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ﴾ دونوں ابتلا ہیں۔ چنانچہ اب یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ ایک میں فتنے کی ایک نوعیت ہے دوسرے میں فتنے کی دوسری نوعیت ہے۔ اسی لیے سیدنا عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک

موقعے پر تابعین کے سامنے اپنا ایک تاثر بیان کیا: ابتُلِینا مع رسولِ اللهِ ﷺ بالضَّرَّاءِ فصَبَرْنا، ثم ابتُلِینا بعدَه بالسَّرَّاءِ فلم نَصْبِرْ. (ترمذی) "رسول اللہ ﷺ کی معیت اور صحبت میں ہماری جانچ کی گئی ضرا کے ساتھ، (یعنی ناگوار، تکلیف دہ، پریشان کن حالات کے ذریعے) لیکن ہم ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد پھر ہمیں خوشحالی اور کشائش کے ساتھ آزمایا گیا لیکن ہم ثابت قدم نہیں رہ پائے"۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اتنا ہی اپنے بارے میں اونچا گمان قائم نہیں کرتا، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یوں بیان ہوتا ہے: أبرّها قلوبـًا و أعْمَقَها عِلمـًا و أقلّها تكلُّفـًا. "دل انتہائی پاکیزہ، انتہائی ستھرے تھے، اور علم انتہائی گہرا، اور ان میں بناوٹ اور تصنع بالکل نہیں تھا"۔ اپنے بارے میں کوئی بڑے بڑے دعوے نہیں تھے۔ اسی کی ایک مثال سیدنا عبدالرحمن ابنِ عوف رضی اللہ عنہ کا یہی مذکورہ قول ہے۔ واضح ہوا کہ صحابہ اپنے آپ کو امتحان کی جگہ پر رکھتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت کے مطابق سیدنا حنظلہ رضی اللہ عنہ کو اپنے بارے میں نفاق کا شبہہ ہو گیا اور ان کو تو جو ہوا سو ہوا، جو أفضل البشر بعد الأنبياء بالتحقيق ہیں یعنی سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کو بھی اپنے بارے میں منافقت کا اشکال پیدا ہو گیا۔

لہذا جاننا چاہیے کہ خوش حالی کا فتنہ زیادہ خطرناک ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کا ایک قول ہے جو غالبًا آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں، فتحِ مکہ کے بعد ارشاد فرمایا: «فَوَاللهِ مَا الْفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ وَلَكِنِّي أَخْشَى أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا وَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُم». (متفق علیہ) "اللہ کی قسم! مجھے تمھارے متعلق محتاجی سے ڈر نہیں لگتا، مجھے تو اس کا خوف ہے کہ دنیا تم پر بھی اسی طرح کشادہ کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلوں پر کشادہ کی گئی تھی، پھر پہلوں کی طرح اس کے لیے تم آپس میں رشک کرو گے اور جس طرح وہ ہلاک ہو گئے تھے تمھیں بھی یہ چیز ہلاک کر کے رہے گی"۔ یعنی مشکلات، فقر اور تکلیفوں کا وقت گزر گیا، وہ مکے کا دور تھا یا وہ مدینے کا ابتدائی دور تھا، اب تو خوشحالی، فتوحات اور غنائم ہیں۔ اور اب مجھے اندیشہ ہے کہ دنیا تم پر کشادہ کر دی جائے گی جیسے تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کر دی گئی مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں تم بھی اسی طریقے سے دنیا کے لیے

مسابقت، دوڑ اور تنافس میں ہلکان نہ ہو جاؤ اور تمھیں بھی اس طرح ہلاک نہ کر دیا جائے جس طرح پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح ان اقوام کے اندر جب مال، پیسہ، خوشحالی اور فتوحات آگئیں تو وہ غافل ہو گئے: ﴿الْهٰكم التكاثر﴾ وہ لہو کا شکار ہو گئے اور خدا سے غافل ہو گئے۔ تو قرآنِ مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم: ۵۹) ''پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کی''۔ اسی طرح سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ﴾ (الاعراف: ۱۶۹) ''پھر ان کی جگہ ان کے بعد وہ ناخلف آئے کہ کتاب کے وارث ہوئے، اس دنیا کا مال لیتے ہیں اور کہتے اب ہماری بخشش ہوگی اور اگر ویسا ہی مال ان کے پاس اور آئے تو لے لیں''۔ یہ دنیا کی تھوڑی سی پونجی در حقیقت پوری دنیا بھی ہے یعنی پوری دنیا بھی لے لی جائے تو اس کی وقعت ایک حقیر پونجی سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح قرآن پاک نے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ (البقرۃ: ۱۷۴) ''ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) حاصل کرتے ہیں''۔ ثَمَنًا قَلِيلًا کا مطلب یہ نہیں کہ دس ہزار روپے میں بیچ دیا اور اگر دس ارب لے لیتے تو ٹھیک ہوتا بلکہ مراد یہ ہے کہ پوری دنیا اپنے تمام مال و متاع سمیت بھی مل جائے تو اللہ کی ایک آیت، ایک کلام اور ایک کلمہ اس سے کہیں برتر اور بڑھیا ہے۔ تو گویا نبی اکرم ﷺ مندرجہ بالا حدیث میں بتا رہے ہیں کہ تمھارے لیے فتنے کی صورت پہلے کچھ اور تھی، اب اور ہے اور یہ فتنہ کسی طور بھی چھوٹا نہیں بلکہ یہ فتنہ زیادہ خطرناک ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

ہماری تاریخ میں Inquisition کا ایک افسوسناک واقعہ ہوا۔ انکیوزیشن کی اصطلاح یورپی تاریخ میں پادریوں کے ہاتھوں ایک خاص اِستبداد سے منسوب ہے جس میں کلیسا کی مخالفت پر تعذیب کی جاتی تھی۔

ہماری تاریخ میں بھی ایسا ایک واقعہ معتزلہ کا ”خلقِ قرآن“ کے باطل عقیدے کے متعلق پیش آیا ہے، کہ جب مملکت نے اسے جبراً ٹھونسنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس موقعے پر سیدنا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کمالِ استقامت کا مظاہرہ کیا۔ متعدّد جیّد علماے کرام نے اسے اس امت کے قابلِ قدر بڑے واقعات میں شمار کیا۔ اور کہا: أبو بكرٍ يومُ الرِدّة وأحمدُ ابنُ حنبلٍ يومُ المِحْنَة. یعنی جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ ارتداد کے فتنے اور مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جبلِ استقامت بن گئے، اسی طرح سے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اس فتنے کے خلاف کھڑے ہوئے اور ایک رخصت کی گنجائش کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹ گئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنوں سے ایسی مار سہی کہ اگر ہاتھی کو بھی وہ مار لگائی جاتی تو وہ بلبلا اٹھتا۔ جب خلیفہ تبدیل ہوا تو نیا خلیفہ معتقد ہو گیا، اس نے غلط رائے کو چھوڑ دیا۔ پھر تاریخی روایت میں ہے کہ ان کو اَشرفیوں کا ایک تھیلا بھجوایا گیا تو اسے دیکھ کر وہ رونے لگے اور انھوں نے کہا کہ: ”یہ جو آزمائش آن پڑی ہے یہ پہلی آزمائش سے زیادہ بڑی ہے“۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے: By carrot or by stick تو یہ جو سختی والی آزمائش ہے اس کو سمجھنا بھی آسان اور جھیلنا بھی نسبتاً آسان ہوتا ہے لیکن یہ رشوت والی آزمائش ہے جس میں آدمی کو طرح طرح سے خوش کیا جاتا ہے تاکہ اس میں کمزوری پیدا کی جائے اور وہ سمجھوتے پر تیار ہو جائے تو یہ اس سے بڑی آزمائش ہے۔

بہر حال اس ساری گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ فتنہ صرف غربت، تکلیف، پریشانی، بیماری اور غم کا نام نہیں بلکہ صحت مندی، تموّل، اقتدار اور غلبے کا بھی نام ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یوں الفاظ آتے ہیں: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَعَذَابِ النَّارِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنَى وَشَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ». (ابنِ ماجہ) ”اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں (جہنم کی) آگ کی آزمائش اور (جہنم کی) آگ کے عذاب سے، قبر کی آزمائش اور قبر کے عذاب سے، دولت کی آزمائش کے شر سے اور مفلسی کی آزمائش کے شر سے“۔ یہاں بالکل واضح ہو گیا کہ اگر فقر ایک آزمائش یا فتنہ ہے تو تونگری بھی ایک آزمائش ہے۔ ایک معروف روایت جو مستدرکِ حاکم میں اور دیگر کُتب میں بھی مذکور ہے کہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَادِرُوا بِالأَعْمَالِ سَبْعًا: هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا، أَوْ غِنًى مُطْغِيًا، أَوْ

مَرَضًا مُفْسِدًا، أَوْ هَرَمًا مُفَنِّدًا، أَوْ مَوْتًا مُجْهِزًا، أَوِ الدَّجَّالَ وَالدَّجَّالُ شَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ، أَوِ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ». (مستدرک حاکم وترمذی) ''سات چیزوں سے پہلے نیک اعمال کرنے میں جلدی کرو، تمھیں ایسے فقر کا انتظار ہے جو سب کچھ بھلا ڈالنے والا ہے؟ یا ایسی مال داری کا جو طغیانی پیدا کرنے والی ہے؟ یا ایسی بیماری کا جو مفسد ہے (یعنی اطاعتِ الٰہی میں خلل ڈالنے والی ہے)؟ یا ایسے بڑھاپے کا جو عقل کو کھو دینے والا ہے؟ یا ایسی موت کا جو جلدی ہی آنے والی ہے؟ یا اس دجال کا انتظار ہے جس کا انتظار سب سے برے غائب کا انتظار ہے؟ یا اس قیامت کا جو قیامت نہایت سخت اور کڑوی ہے''۔ غور کیجیے تو یہاں دونوں تونگری اور فقر ساتھ ساتھ آگئے۔ یہ بھی آزمائش ہے کہ تونگری آئے اور آدمی آپے سے باہر ہو کر سرکش ہو جائے اور یہ بھی آزمائش ہے کہ اتنی تنگدستی ہو جائے کہ انسان اپنے پیٹ کے چکر میں اللہ ہی کو بھلا دے۔ پھر بیماری، بڑھاپے، موت اور دجّال کا ذکر کیا۔ دجّال کا آنا ہمارے اس موضوع سے بھی متعلق ہے۔ دَجّال کے آنے کا ایک خاص وقت معیّن ہے یعنی یہ تکوین ہے اور جو فرمایا کہ: «بادِرُوا بِالْأعمال» یہ تشریع ہے، یعنی تکوین و تشریع ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ آپ ﷺ ایک تو بتا رہے ہیں کہ دَجّال نے بہر حال آنا ہے، لیکن ساتھ میں توجہ دلا رہے ہیں کہ دجّال جب آجائے گا پھر تم کیا کر پاؤ گے اور کیا نہیں۔ چونکہ ابھی تک تو شخص دجّال ظاہر نہیں ہوا تو اس کو غنیمت جانو اور نیک اعمال میں جلدی کر لو۔ وہ چیزیں جو غائب ہیں، جن کا انتظار کیا جا رہا ہے ان میں سب سے خطرناک چیز دَجّال ہے۔ اور پھر آخر میں فرمایا کہ تم الساعة یعنی دنیا کے خاتمے کی گھڑی کا انتظار کر رہے ہو جبکہ وہ تو بہت ہی سخت اور تلخ وتُرش ہے۔

ایک واقعے سے دو فریقوں کی آزمائش

آزمائش کا طریقہ کار یوں ہے کہ ایک واقعہ ہوتا ہے اور اگر اس کے دو فریق ہیں تو دونوں کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ فتنے کی ایک شکل Human evil یا Moral evil ہے کہ ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم، ایک جارحیت کرنے والا ہے اور دوسرے پر جارحیت کی جاتی ہے، ایک غاصب ہے اور دوسرے کا مال غصب کیا جاتا ہے۔ اصل میں یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بھی فتنہ ہیں۔

قرآنِ مجید میں اس بات کو بہت وضاحت سے بیان کر دیا گیا: ﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا﴾ (انعام:۵۳)''اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے کہ (جو دولت مند ہیں وہ غریبوں کی نسبت) کہتے ہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم میں سے فضل کیا ہے''۔ اس آیت کا پسِ منظر یہ ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے جب توحید کی دعوت دی تو قوم کے سرداروں اور بڑے لوگوں کو اپنے مفادات پر ضرب پڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ابو جہل سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ان صاحب کو جھوٹا سمجھتے ہیں؟ وہ بولا کہ نہیں، میں ان کو جھوٹا نہیں سمجھتا۔ اصل سبب یہ ہے کہ ''سقایا'' ان کے پاس، ''لوا'' ان کے پاس، پانی پلانا بھی اور ندویٰ بھی ان کے پاس، تو اب نبوت بھی انھی کو دے دیں؟ یعنی مسائل؛ حق کے واضح ہونے کے نہیں بلکہ جاہ و منصب وغیرہ کے تھے۔ زیادہ تر لوگ جو ایمان لا رہے ہیں وہ نوجوان اور غلاموں کے طبقے سے ہیں اور ادھر یہ چودھری تکبر میں اکڑے ہوئے ہیں، ان کی فرمائش یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ ان کمتر لوگوں کو ذرا دور کر دیں تو ہم آپ کی محفل میں آکر آپ کی بات سن لیں گے۔ نبیٔ اکرم ﷺ سے کہا گیا: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ (انعام:۵۲)''اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں (اور) اس کی ذات کے طالب ہیں ان کو (اپنے پاس سے) مت نکالو''۔ واضح ہوا کہ یہ وہ تناظر تھا جس میں کہا گیا کہ ہم آزمائش اور فتنے میں بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعے ڈالتے ہیں۔ وہ جو چودھری بنے پھرتے ہیں اور برے لوگ ہیں ان کے لیے یہ صحابہ حق کے راستے کی رکاوٹ بن جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کسی پر احسان کر کے اسے برگزیدہ کرنا تھا تو وہ یہ کمتر لوگ تھے۔ ان کے لیے یہ بات فتنہ بن گئی کہ محمد رسول اللہ ﷺ دعوت دے رہے ہیں کہ اے چودھریو اور سردارو! اگر تم نے میری بات نہیں مانی، تو دنیا میں بھی ذلیل ہوگے اور آخرت میں بھی شدید ترین عذاب کا شکار ہوگے۔ جبکہ میرے پیرو کار بلال، خباب، عمار، جو بظاہر کس مپُرسی کی حالت میں ہیں، لیکن یہ دنیا میں بھی غالب و کامران ہوں گے اور آخرت میں بھی بادشاہوں کی سی زندگی پائیں گے۔ دین کی یہ دعوت ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ اسی کو قرآنِ مجید دو طرفہ فتنہ قرار دے رہا ہے۔ یعنی صحابہ ایمان لانے کے حوالے سے

فتنہ بن گئے مشرکین کے لیے، چودھریوں کے لیے، اور یہ چودھری صحابہؓ کرام کے لیے فتنہ بن گئے کہ انھیں تعذیب کر رہے ہیں اور ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے دین کی دعوت دی تو چند لوگ جو ایمان لائے ان کے بارے میں سورۂ یونس میں بیان ہوا: ﴿فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ﴾ (یونس:۸۳) "تو موسیٰ پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم میں سے چند لڑکے، (اور وہ بھی) فرعون اور اس کے اہلِ دربار سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں وہ ان کو آزمائش میں نہ پھنسا دے"۔ یعنی قوم کے حکمران ان کی تعذیب کریں گے اور مظالم سے دوچار کریں گے۔ تو اب وہ اللہ کے حضور دعا کر رہے ہیں: ﴿فَقَالُوا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (یونس:۸۵) "تو وہ بولے کہ ہم خدا ہی پر بھروسا رکھتے ہیں" اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نہایت خوبصورت ترجمہ کیا: "اے ہمارے رب! تو ہمیں ان ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنا"۔ گویا اب ان سرداروں کے لیے ان کا مال دار ہونا اور اقتدار فتنہ بن گیا: ﴿وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ﴾ (یونس:۸۸) "موسیٰ نے دعا کی، اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے اے رب! کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟" چنانچہ قرآنِ مجید واضح کر دیتا ہے کہ آزمائش اسی طرح ہوتی ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا﴾ (انعام:۱۲۳) "اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا دیا ہے کہ وہاں اپنے مکر و فریب کا جال پھیلائیں"۔ ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ﴾ (الفرقان:۳۱) "ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے"۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کی ایک تکوین کا تسلسل ہے کہ ایک دوسرے کے لیے آزمائش ہو رہی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ جن کے ذریعے تعذیب دی گئی وہ اللہ کے چہیتے یا ماننے والے نہیں تھے۔ جیسے تاتاریوں کے ذریعے مسلمانوں پر بہت ظلم ہوا اور بنی

اسرائیل کی تاریخ میں بھی ایسے واقعات ہوتے رہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں اس کا بیان ہے کہ: ﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ﴾ (بنی اسرائیل:۵) ”ہم نے تمھارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے“۔ اللہ نے اپنے بندے ان پر مسلّط کیے یعنی یہ ایک تکوینی معاملہ تھا۔ لہٰذا ان تکوینی معاملات کو بھی سمجھنا چاہیے کہ کوئی طاقت بھی اللہ تعالیٰ کے بس سے باہر نہیں ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کی ایک بہت خوبصورت دعا میں الفاظ آئے ہیں کہ: ”نَاصِيَتِي بِيَدِكَ“ کہ اے اللہ! میری جو پیشانی کے بال ہیں وہ تیرے ہاتھ میں ہیں۔

خیر و شر کے تمام ذرائع اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں

بعض اوقات ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے معاذ اللہ! کہ شاید اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ابلیس اور ابلیسی قوتوں کے سپرد کر دیا ہے۔ حالانکہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ابلیس بلاشبہ شر کی سب سے بڑی علامت ہے اور اسی طرح بڑے بڑے سرکش لوگ؛ مثلاً فرعون ہے جو وقت کا بہت ہی بڑا فتنہ تھا، اسی طرح ”دجّال“ کا فتنہ ہے جس کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس سے بڑا شر اور فتنہ آدم کی تخلیق سے لے کر دنیا کے خاتمے تک کوئی نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود چاہے ابلیس ہو، فرعون ہو یا دجّال، ان سب کی پیشانی کے بال اللہ کی گرفت میں ہیں اور یہ سب تکوینی معنوں میں اللہ کے بندے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں عبادت بالاجبار یا عبادت بالتسخیر کہ ماسوا اللہ جو کچھ بھی ہے وہ سب بندے ہیں۔ فرشتے ﴿عِبَادٌ مُكْرَمُونَ﴾ ہیں۔ آسمان، زمین، چاند، ستاروں کے بارے میں کہا: ﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَنِ عَبْدًا﴾ (مریم:۹۳) ”زمین اور آسمان کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں“۔ چنانچہ تکوین اور عبادت بالاجبار یا عبادت بالتسخیر کے معنوں میں ابلیس، فرعون اور دجّال بھی عباد اللہ یعنی اللہ کے بندے ہیں، البتہ عبادت بالخیار یا عبادت بالاختیار سے وہ محروم ہیں اور اس وجہ سے یہ شر کے بہت بڑے ایجنٹ بن گئے ہیں۔ بعض اوقات لوگ ناسمجھی میں ایسی بات کر دیتے ہیں کہ جیسے کوئی معرکہ معاذ اللہ! اللہ اور ابلیس کے درمیان بپا

ہے۔ ہم زرتشت کے ماننے والے نہیں ہیں کہ جن کے ہاں دو خدا ہیں ایک خیر کا اور دوسرا شر کا، ہمارے ہاں اگر کوئی جدل ہے تو وہ آدم اور ابلیس کا جَدل ہے نہ کہ اللہ اور ابلیس کا، ابلیس تو اللہ کی حقیر ترین مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ لہٰذا اصل معرکہ آدمیت اور ابلیسیت میں برپا ہے۔ بہر حال اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آزمائش اور فتنہ زندگی سے متّصل ہے، یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، جیسے غالبؔ نے کہا:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

جس طرح غم ایک خاص طرح کا فتنہ ہے اسی طرح راحت، خوشی، تکلیف، بیماری، پریشانی سب اس زندگی کے فتنے ہیں اور کوئی بھی اس سے ماورا نہیں ہے۔ نبی ٔاکرم ﷺ نے ایک موقعے پر فرمایا: «لم يبقَ منَ الدُّنيا إلَّا بلاءٌ و فتنةٌ». (ابنِ ماجہ) ''دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں بچا مگر ابتلا اور آزمائش کے''۔ یعنی آزمائشیں اور فتنے لامحالہ ہیں اور واقع ہو کر رہیں گے۔

مال اور اولاد کے فتنے کی مثال

قرآنِ مجید میں ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (التغابن:۱۵) ''تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں''۔ یعنی یہ دونوں فتنہ وآزمائش ہیں، اگر اس اولاد کی خاطر لاڈ پیار میں اللہ اور آخرت کو بھلا دیا، اس کے لیے حرام کو حلال کر لیا یا اس کی وجہ سے دینی امور میں کوتاہی برتی۔ اسی طرح مال و دولت بھی ایک آزمائش ہے، اگر مال میں ایسے غرق ہوئے کہ عبدُ الدرھم اور عبدُ الدینار بن گئے تو یہ مال شر ہی ہے۔ دوسری طرف اگر ہم جائزہ لیں تو یہی اولاد انسان کا سب سے بڑا سرمایہ بن سکتی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا کہ: «اِذَا مَاتَ ابنُ آدم انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أو عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ». (مسلم) ''جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل موقوف ہوجاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے؛ ایک صدقۂ جاریہ کا، دوسرے علم کا جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، تیسرے

نیک بخت بچے کا جو دعا کرے اس کے لیے"۔ گویا حسب بالا مذکورہ آیت میں جس اولاد کو فتنہ کہا گیا وہ انسان کا سرمایہ بن گئی کہ مرنے کے بعد اب اس کی دعائیں فائدہ پہنچا رہی ہیں۔ اسی طرح مال کے بارے میں کہا گیا: «لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ، رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا». (بخاری) "حسد صرف دو باتوں میں جائز ہے؛ ایک تو اس شخص کے بارے میں جسے اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اس دولت کو راہ حق میں خرچ کر رہا ہو اور ایک اس شخص کے بارے میں جسے اللہ نے حکمت کی دولت سے نوازا ہو اور وہ اس کے ذریعے سے فیصلہ کرتا ہو اور لوگوں کو اس حکمت کی تعلیم دیتا ہو"۔ گویا وہی مال ہے اگر انسان اس کو دین کی راہ میں لٹا رہا ہے تو یہ مال اس کے لیے خیر بن گیا اور اگر گناہ و معاصی کے اسباب و سامان میں خرچ کر رہا ہے تو یہ شر ہے۔ بعینہ یہی مثال اولاد کی ہے، لہذا واضح ہوا کہ ہر چیز من وجہٍ خیر ہے اور من وجہٍ شر ہے اور یہی دراصل آزمائش ہے۔

علم کی مثال

علم کو ہی لے لیجیے، ایک دینی علم ہے جس کی فضیلت اور مرتبہ روایات میں خوب واضح فرمایا گیا ہے: «مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ فِيهِ عِلْمًا سَلَكَ اللهُ بِهِ طَرِيقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ، وَمَنْ فِي الْأَرْضِ، وَالْحِيتَانُ فِي جَوْفِ الْمَاءِ، وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا وَرَّثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ». (ابوداود) "جو شخص کسی راستے میں حصول علم کی خاطر چلا ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کی راہوں میں سے ایک راہ پر چلائے گا۔ بلاشبہ فرشتے طالبِ علم کی رضامندی کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں اور صاحبِ علم کے لیے آسمانوں میں بسنے والے، زمین میں رہنے والے اور پانی کے اندر مچھلیاں بھی مغفرت طلب کرتی ہیں۔ بلاشبہ عالم کی عابد پر فضیلت ایسی ہی ہے جیسے کہ چودھویں کے چاند کی سب ستاروں

پر ہوتی ہے۔ بلاشبہہ علما انبیا کے وارث ہیں اور انبیا نے کوئی درہم و دینار ورثے میں نہیں چھوڑے ہیں بلکہ انھوں نے علم کی وراثت چھوڑی ہے۔ پس جس نے اسے حاصل کر لیا اس نے بڑا نصیبہ (وافر حصہ) پایا"۔ یہ روایت واضح کر رہی ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری فضیلتیں اللہ نے علم اور خاص طور پر علمِ دین سے متعلق کر دیں، لیکن اب ذرا ذیل میں دی گئی روایت ملاحظہ ہو: «مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللهُ النَّارَ». (ترمذی) "جو شخص علم اس واسطے سیکھے کہ اس کے ذریعہ علما کی برابری کرے، کم علم اور بے وقوفوں سے بحث و تکرار کرے یا اس علم کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل فرمائے گا"۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فتنہ جہاں ایک موقع فراہم کر رہا ہے، وہیں ایک خطرہ بھی ہے۔ ہمارے ہاں کاروبار میں ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے کہ بڑا خطرہ مول لیں تو زیادہ منافع اور کم خطرہ مول لیں تو کم منافع۔ تو مال، اولاد، اقتدار، علم وغیرہ اگر صحیح طریقے، صحیح نیت اور آداب کے ساتھ ہوں تو ان سے بڑھ کر کوئی نہیں، لیکن اگر نیت میں کھوٹ آجائے اور بدعت کی راہ سے یہ سب ہونے لگیں تو یہ گویا سرمایہ نہیں بلکہ واجب الادا قرض بن جائیں۔

لفظ 'فتنہ' کے اطلاقات

ابھی ہم نے فتنہ بطور آزمائش اور جانچ اور اس کی کچھ تفصیل سمجھنے کی کوشش کی، اب ہم لفظ فتنہ کے اطلاقات پر بات کرتے ہیں۔ چونکہ عام طور پر تو ہمارے ہاں فتنہ کا لفظ منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اُصولی طور پر فتنہ کا لفظ ایک نیوٹرل لفظ ہے۔ ایسے ہی جیسے "بُو" کا لفظ ہے جو ایک نیوٹرل لفظ ہے لیکن اس کے ساتھ اضافت یا صفت لگتی ہے یعنی خوشبو یا بدبو، لیکن عمومی طور پر جب ہم خالی "بو" بولتے ہیں تو اس سے مراد خوشبو نہیں بلکہ بدبو ہوتی ہے۔ ایسے ہی عام طور پر فتنہ اوپر بیان کردہ حدیث اور آیات کی رو سے، صرف تکلیف دینے والا یا منفی معنوں میں نہیں ہوتا بلکہ مثبت معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی ایک معنی میں پوری زندگی گویا فتنوں سے معمور ہے جس میں کہیں فتنہ، منفی معنوں میں ہے اور کہیں مثبت میں، لہٰذا یہ واضح ہو گیا کہ فتنہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ فتنے کا لفظ اپنے مفہوم میں عمومی معنوں میں نیوٹرل ہے اس کو واضح کرنے کے لیے مزید

کچھ آیات حسبِ ذیل ہیں:﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ، إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا﴾ (الفرقان:۲۰)"اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے، کیا تم صبر کروگے؟ اور تمھارا پروردگار تو دیکھنے والا ہے"۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنادیا۔ انبیاے کرام کے ساتھی فتنہ بن گئے اپنی قوم کے لیے اور قوم نے انبیاے کرام علیہم السلام سے ایسا معاملہ کیا کہ ان کو فتنے میں ڈالنے کی کوشش کی اور انھیں تکالیف دیں۔﴿فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللهِ﴾ (العنکبوت:۱۰)"جب اُن کو خدا (کے رستے) میں کوئی ایذا پہنچتی ہے تو لوگوں کی ایذا کو (یوں) سمجھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب"۔﴿فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾(الزمر:۴۹)"جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے (میرے) علم (ودانش) کے سبب ملی ہے۔ (نہیں) بلکہ وہ آزمائش ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے"۔ غور کیجیے کہ جب اللہ نے انھیں نعمت سے نوازا تو انھوں نے کہا کہ یہ ہمارے علم کی وجہ سے دیا ہے۔ اللہ نے واضح کردیا کہ اس میں تمھارا کوئی استحقاق یا کمال نہیں بلکہ یہ سراسر آزمائش ہے اور جانچ کا ایک طریقہ کار ہے جس میں اللہ تمھیں ڈالتا ہے۔ اسی طرح سورۃ القمر میں، قوم ثمود کے لیے اونٹنی کو اللہ تعالیٰ نے خاص معجزے کے طور پر ظاہر فرمایا، اس بارے میں فرمایا:﴿إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ﴾(القمر:۲۷)"(اے صالح) ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجنے والے ہیں تو تم ان کو دیکھتے رہو اور صبر کرو"۔ ان آیات میں فتنہ جن معنوں میں استعمال ہوا وہ زیادہ تر نیوٹرل ہیں۔ نیوٹرل معنوں میں فتنہ ضروری نہیں کہ تکلیف، پریشانی، مصیبت، بیماری اور فساد کے رنگ میں ہو بلکہ وہ خوشحالی، صحت، غلبے، طاقت اور اچھے حالات میں بھی ہوسکتا ہے۔

لفظ فتنہ کا استعمال منفی معنوں میں

قرآنِ مجید میں کثیر مقامات ایسے ہیں جہاں فتنے کا لفظ سلبی یعنی منفی معنوں میں آیا ہے، خاص طور پر جو معرَّف بِاللَّام "الفتنہ" ہے، یہ قرآنِ مجید میں تقریباً ہر جگہ منفی معنوں میں آیا ہے۔ بہر حال، سیاق وسباق کی مناسبت سے مفہوم بدل بھی جاتا ہے مگر عمومی طور پر قرآن میں فتنہ سلبی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چند آیات حسبِ ذیل ہیں: ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا، وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ (التوبہ:۴۹) "اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجیے اور آفت میں نہ ڈالیے۔ دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے ہیں اور دوزخ سب کافروں کو گھیرے ہوئے ہے"۔ اس آیت میں فتنے کا لفظ منفی معنوں میں ہے۔ اسی طرح سیدنا سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ہاروت اور ماروت فرشتوں کو بھیجا گیا انھوں نے کہا کہ: ﴿وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ﴾ (البقرۃ:۱۰۲) "اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں، تم کفر میں نہ پڑو"۔ ﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (الانفال:۲۵) "اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انھیں لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں گنہگار ہیں اور جان رکھو کہ خدا سخت عذاب دینے والا ہے"۔ ﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرۃ:۱۹۱) "اور (دین سے گمراہ کرنے کا) فساد قتل وخونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے"۔ متعدّد احادیث میں بھی زیادہ تر منفی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا، معروف روایت ہے کہ: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُقْبَضَ الْعِلْمُ وَتَكْثُرَ الزَّلَازِلُ وَيَتَقَارَبَ الزَّمَانُ وَتَظْهَرَ الْفِتَنُ وَيَكْثُرَ الْهَرْجُ وَهُوَ الْقَتْلُ حَتَّى يَكْثُرَ فِيكُمْ الْمَالُ فَيَفِيضَ». (بخاری) "قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک علمِ دین نہ اٹھ جائے گا اور زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے گی اور زمانہ جلدی جلدی نہ گزرے گا اور فتنے فساد پھوٹ پڑیں گے اور "ہرج" کی کثرت ہو جائے گی اور ہرج سے مراد قتل ہے، جبکہ تمھارے درمیان دولت ومال کی اتنی کثرت ہو گی کہ وہ ابل پڑے گا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک معروف دعا ہے، اس میں یہ الفاظ منقول ہیں: «وَإِذَا أَرَدْتَ فِتْنَةَ

قَوْمٍ فَتَوَفَّنِي غَيْرَ مَفْتُونٍ». (ترمذی) ”اور جب تو کسی قوم کو آزمائش میں ڈالنا چاہے، تو مجھے فتنے میں ڈالنے سے پہلے موت دے دے“۔ یہاں واضح ہوتا ہے کہ فتنہ ایسے حالات کے آنے کو کہتے ہیں جو آزمائش سے پُر ہیں اور جس کی وجہ سے لوگوں کے اخلاقی معاملات خراب ہو جائیں یا ان کی عافیت والی حالت جاتی رہے اور تکلیف و پریشانی کی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو اس وقت یہ دعا ہی مانگی جا سکتی ہے کہ مجھے اپنے پاس بلا لینا تاکہ میں فتنے میں پڑنے سے بچ جاؤں۔ اسی طرح جن دعاؤں میں آپ ﷺ نے استعاذہ فرمایا، ان میں بھی فتنے کا لفظ منفی معنوں میں ہے، ظاہر بات ہے جس چیز سے اللہ کے نبی ﷺ نے پناہ مانگی ہے وہ چیز مثبت نہیں ہو سکتی۔ ایک معروف روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو مختلف امور سے تعوذ کی تلقین فرمائی، راوی کہتے ہیں: أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ: «تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ». قَالُوا: نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ. فَقَالَ: «تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ». قَالُوا: نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ. قَالَ: «تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ». قَالُوا: نَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ. قَالَ: «تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ». قَالُوا: نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. (مسلم) ”آپ ﷺ نے ہماری طرف رخِ انور پھیرا اور فرمایا: آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔ سب نے کہا: ہم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، سب نے کہا: ہم قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: (تمام) فتنوں سے جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ ہیں اللہ کی پناہ مانگو، سب نے کہا: ہم فتنوں سے جو ظاہر ہیں اور پوشیدہ ہیں اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگو، سب نے کہا: ہم دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں“۔ اس حدیث میں ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے جیسے جہنم کا عذاب، عذابِ قبر اور فتنۂ مسیح دجال۔ اسی ذیل میں آپ ﷺ نے فرمایا ہر طرح کا وہ فتنہ جو ظاہر ہے یا باطن۔ اس سے کئی طرح کے فتنے مراد ہو سکتے ہیں: ایک وہ فتنہ ہے جو انسان کے ظاہری اعمال میں خرابی کا ذریعہ بنتا ہے جیسے انسان نماز ترک کر دے، خواتین پردہ ترک کر دیں، انسان سود کھانے لگے۔ کچھ فتنے ہیں جن کا تعلق انسان کے باطن سے ہے، جیسے باطن میں بے یقینی پیدا ہو جائے، حسد آ جائے،

تکبر، کینہ اور کفرانِ نعمت پیدا ہو جائے۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو فتنے ظاہر اور جلی ہیں جسے عام آدمی بھی پہچان لیتا ہے اور دوسرے وہ جو باطنی اور چھپے ہوئے ہیں۔ اس موضوع پر آگے چل کر تفصیل سے گفتگو ہو گی۔ ہمارے بہت سے ائمہ اور اسلاف نے فرمایا ہے کہ جب فتنہ آتا ہے تو اس وقت اسے عالِم پہچان لیتے ہیں اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہا ہوتا ہے تو اس وقت اسے جاہل آدمی یا عام آدمی بھی پہچان لیتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان بصیرٌ بالزّمان ہو یعنی زمانے کی بصیرت رکھتا ہو اور ظاہری و باطنی فتنوں کو پہچان لے۔ ایک روایت میں نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ السَّعِيدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ، إِنَّ السَّعِيدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ، إِنَّ السَّعِيدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ وَلَمَنِ ابْتُلِيَ فَصَبَرَ فَوَاهًا». (ابوداود) ”بلاشبہ انتہائی خوش بخت ہے وہ انسان جو فتنوں سے بچا رہا، بڑا خوش بخت ہے وہ انسان جو فتنوں سے بچا رہا، بڑا خوش بخت ہے وہ انسان جو فتنوں سے بچا رہا اور جو ان میں مبتلا کیا گیا پھر اس نے صبر کیا تو اس کے کیا کہنے!“۔ مراد یہ کہ جس کو فتنوں سے بچا لیا گیا اصل میں خوش بخت وہی ہے۔ اسی صورتِ حال کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا کہ اے اللہ! اگر تو اپنے بندوں کے بارے میں بڑی آزمائش کا ارادہ فرمائے تو مجھے اپنے پاس بلا لیجیو، اس حال میں کہ میں غیر مفتون ہوں یعنی فتنوں سے بچ جاؤں۔ سعید یا خوش بخت ہونے کی دوسری صورت یہ بیان کی کہ جس کو آزمائش میں مبتلا کر کے جانچا گیا اور اس نے صبر کیا، ”صبر“ عربی زبان میں استقامت سے قریب قریب ہے۔ صبر سے مراد محض سلبی معنوں میں صبر نہیں کہ برداشت کرو اور جھیلو، بلکہ صبر کا مطلب ہے استقامت یعنی جمے رہو چاہے کیسے ہی حالات ہوں۔ جس طرح فتن کی روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ الصَّابِرُ فِيهِمْ عَلَى دِينِهِ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ». (ترمذی) ”لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ان میں اپنے دین پر صبر کرنے والا آدمی ہاتھ میں چنگاری پکڑنے والے آدمی کی طرح ہو گا“۔

فتنے کی اقسام

فتنہ کئی شکلوں اور قسموں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

معرکہ آرا کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے آخری حصے میں فِتن پر بحث کی ہے، جس میں انھوں نے فتنے کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ اس بحث کا خلاصہ ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

آدمی کے نفس کا فتنہ

فتنے کی پہلی قسم یہ ہے کہ آدمی کا اپنے نفس کے فتنے میں ایسا پڑ جانا کہ اس کا دل سخت ہو جائے اور پھر وہ نہ تو اطاعت کی حلاوت پا سکے اور نہ ہی اللہ سے مناجات اور اللہ سے گفت وشنید کی لذت پا سکے۔ ذرا اس بات کا موازنہ ہمارے روز مرّہ کے فتنے کے تصوّر سے کیجیے کہ جنگ لگ گئی تو کہنا کہ فتنہ برپا ہو گیا یا فلاں وائرس آگیا تو یہ فتنہ ہے۔ یقیناً یہ بھی آزمائشیں اور فتنے ہیں لیکن یہ صورتِ حال کہ عافیت ہے، زندگی کے مزے لوٹے جا رہے ہیں کوئی بیماری یا تکلیف نہیں، امن وسکون کا سماں ہے، محض دل سخت ہو گیا، دل اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا، تو شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بہت بڑا فتنہ قرار دیا۔

اہل وعیال کا فتنہ

پھر اگلا فتنہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدمی کا اپنے گھر والوں کے معاملہ میں فتنے میں پڑ جانا جس کی شکل یہ ہے کہ تدبیرِ منزل میں فساد برپا ہو جانا۔ تدبیرِ منزل کی اصطلاح ہماری روایت میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ چونکہ معاشرے کی بنیادی اینٹ گھر ہے، اگر گھر بگڑ جائے تو پورا سماج بگڑ جائے گا۔ پھر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ: «إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيءُ أَحَدُهُمْ، فَيَقُولُ: فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، فَيَقُولُ: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا، قَالَ: ثُمَّ يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ: مَا تَرَكْتُهُ حَتَّى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ امْرَأَتِهِ، قَالَ: فَيُدْنِيهِ مِنْهُ وَيَقُولُ نِعْمَ أَنْتَ». (مسلم) ”ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر وہ اپنے لشکر روانہ کرتا ہے۔ اس کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ ڈالتا ہے۔ ان میں سے ایک آکر کہتا ہے: میں نے فلاں فلاں کام کیا ہے، وہ کہتا ہے: تم نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ان میں سے ایک آکر کہتا ہے: میں نے اس شخص

کو (جس کے ساتھ میں تھا) اس وقت تک نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کرادی، کہا: وہ اس کو اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے تم سب سے بہتر ہو"۔ یعنی ابلیس کی باقی کارگزاریاں یا کارنامے جو بیان کیے گئے وہ بہت چھوٹے ہیں اس کی نسبت کہ گھر کے معاملے کو برباد کر دیا جائے۔ تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسری طرح کے فتنے وہ ہیں جو گھر میں پیدا ہوتے ہیں، جیسے حدیث میں آیا ہے کہ وہ فتنہ جو آدمی کے اہل و عیال اور مال میں آتا ہے۔

بلد کا فتنہ

یہ وہ فتنہ ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایسے آتا ہے کہ جیسے سمندر کی لہریں آتی ہیں اور پھر اس شہر یا بلد میں فساد آجاتا ہے۔ پہلے فساد آدمی کی ذاتی زندگی میں آیا، پھر اگلے مرحلے میں وہ آدمی سے نکل کر اس کے گھر میں آگیا، اب تیسرا مرحلہ یہ کہ فتنہ ایک بلد یا شہر میں آگیا۔ خاص طور پر اس کی شکل بیان کی کہ لوگوں کا ناحق خلافت کی طمع رکھنا، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَلَكِنْ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ». (مسلم) "شیطان اس بات سے ناامید ہوگیا ہے کہ جزیرۃ العرب میں نماز پڑھنے والے اس کی عبادت کریں گے، لیکن وہ ان کے درمیان لڑائی جھگڑے کرانے سے مایوس نہیں ہوا"۔ یعنی شیطان ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور فساد و دنگا کروانے کی کوشش کرتا رہے گا۔

ملت کا فتنہ

آگے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگلا مرحلہ ملّت اور امت کی سطح پر فتنہ ہے، یعنی فتنے کا دائرہ مزید وسیع ہوگیا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور حواری دنیا سے چلے گئے اور معاملات نااہل لوگوں کے سپرد ہو گئے، ایک ملوکیت کی شکل پیدا ہوگئی، جو راہب اور احبار ہیں یعنی علما اور صوفیا وہ تامل میں پڑ گئے۔ بعض اوقات علما و فقہا بہت باریکیوں میں چلے گئے اور کشف، زہد اور تزکیے کے نام پر انھوں نے عجیب ڈھنگ اختیار کر لیا۔ بادشاہوں نے بھی دین کے معاملے میں ہلکے پن اور لاپروائی کا رویہ اختیار کیا، جاہلوں نے بھی دین کو ہلکا

لیا۔ احبار و رہبان، بادشاہ اور عوام نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام چھوڑ دیا، نتیجتاً زمانۂ جاہلیت کے سے حالات پیدا ہو گئے۔ یہی بات نبی ﷺ نے فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجے ان کی امت میں کچھ حواری ہوتے ہیں کچھ اصحاب ہوتے ہیں وہ ان کی سنت کو پکڑتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے بعد ناخلف لوگ آجاتے ہیں کہ وہ جو کہتے ہیں مگر کرتے نہیں اور جو کرتے ہیں اس کا انھیں حکم نہیں دیا گیا۔

ہر شعبۂ زندگی کو محیط فتنہ

پھر اگلا فتنہ الفتنة المستطيرة ہے، یہ بالکل پھیلا ہوا فتنہ ہے جو ہر شعبۂ زندگی کا احاطہ کر لے۔ اس فتنے کے اثرات یہ ہوں گے کہ لوگ انسانیت سے نکل جائیں گے۔ یہ نہایت گہری بات ہے۔ آج ۲۰۲۰ء میں ایک وبا پھیلی ہوئی ہے جس کا نام Dehumanization ہے، جو جدید مفکرین کہتے ہیں کہ Death of God ہوئی ہے (معاذ اللہ)، وہ اصل میں Death of Man ہے۔ بہر حال، اس سے مزید خرابیاں وجود میں آگئیں۔ سب سے پاکیزہ اور زاہد لوگوں نے انسانوں کی ضرورتوں اور نفس کے معاملات سے توجہ ہٹا دی اور اصلاح کی راہ ترک کر دی۔ وہ Abstraction میں چلے گئے۔ بڑے بڑے فلسفے، نظریات اور معرفت کی باتیں کرنے لگے، اللہ کے لیے رونا دھونا اختیار کر لیا اور خارج کے حالات سے غیر متعلق ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں عوام بالکل حیوانوں کی سطح پر اتر گئے اور کچھ درمیان میں رہے جو نہ یہاں تھے نہ وہاں تھے۔

الوقائع الجوّیہ

چھٹا اور آخری فتنہ وہ ہے کہ جو فضاؤں میں ہو، برباد اور ہلاک کرنے والا ہو اور عمومی ہو جیسے طوفان، وبائیں، خسف اور پھیلی ہوئی آگ۔ خاص طور پر انھوں نے اَلْوَقَائِعُ الْجَوِّيَّة یعنی نیم کائناتی یا عالمی سطح پر ظہور پذیر ہونے والے فتنوں کا ذکر کیا۔ بہر حال یہ فتنے کی ان اقسام کا خلاصہ تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔

* * * * *

وقوعِ قیامت کا تصور اور علاماتِ قیامت

گزشتہ باب میں ہم فتنے اور اس کی اقسام کا تفصیل سے جائزہ لے چکے ہیں، اب ہم أَشْرَاطُ السَّاعَة یعنی علاماتِ قیامت کی طرف آتے ہیں، جنھیں عَلَامَاتُ السَّاعَة یا أَمَارَاتُ السَّاعَة بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک بنیادی بات پر غور کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ دین کا بنیادی مقدمہ کیا ہے؟ تو ذہن نشین رہنا چاہیے کہ دین کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ انسان مخلوق اور فانی ہے اور اسی طرح سے یہ مکمل کائنات بھی مخلوق اور فانی ہے۔ اس کائنات کا خالق اللہ ہے، اس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور اس کے اندر انسان اور دیگر مخلوقات کو بھی خلق کیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی فنا کے ساتھ ساری مخلوقات تخلیق کے بعد فنا ہونے والی ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس موت اور حیات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ پورا نظام کیوں تخلیق کیا؟ جب ہم قرآن وسنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ آتا ہے کہ موت اور حیات کی تخلیق اس لیے ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جانچے اور ان کی آزمائش کرے۔ تاکہ اس دنیا کے خاتمے کے بعد جو اصل اور حقیقی دنیا وجود میں آئے گی اس میں وہ بندے اپنا استحقاق ثابت کریں۔ ظاہر بات ہے کہ استحقاق ان معنوں میں ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اعمال کے بدلے جنت کے حق دار قرار دیے جائیں گے، اس لیے کہ استحقاق جنت کا نہیں ہو سکتا۔ البتہ استحقاق محدود معنوں میں اللہ کی رحمت کا ہو سکتا ہے کہ کون لوگ ہیں کہ جو قابلِ رحم قرار پائیں گے اور کون لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائیں گے۔ تو یہ بنیادی مقدمہ ہے کہ اس دنیا کو ہمیشہ نہیں رہنا ہے، یہ خاص وقت میں اللہ نے خلق کی اور ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کو ختم کر دیں گے۔ قرآنِ کریم میں واضح کر دیا گیا ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمن:۲۶) ''اس زمین میں جو کوئی ہے، فنا ہونے والا ہے''۔ یہاں مذکور ''ہ'' ضمیر زمین کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی جو

کچھ زمین پر ہے، کرۂ ارض پر ہے وہ سب فنا ہونے والا ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ القصص میں آیا ہے: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ ”ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے ذات باری تعالیٰ کے“۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ہر چیز ختم اور ہلاک ہونے والی ہے، یعنی ہر عمل اکارت ہونے والا ہے سوائے اس عمل کے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے۔ لہذا واضح ہوا کہ جو عمل اللہ کی رضا کے حصول کے قصد سے کیا جائے گا بس وہی عمل آخرت میں بچے گا اور مقبول ہوگا، اس کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہو جائے گی۔ لیکن اس کی دوسری تفسیر جو زیادہ معروف ہے وہ ہے: ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اللہ کے، یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے سب مخلوقات کی Physical ہلاکت ہوگی۔ اصل میں جو ”الحق“ ذات ہے وہ تو اللہ ہے، یعنی انسان تو مخلوق ہے اس کے ہونے یا نہ ہونے کا مدار تو اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ”الحی“ ہے، خود زندہ ہے، سب کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، ”القیوم“ ہے، خود سے قائم ہے، وہ سب کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ معروف شاعر لبید کے دو مصرعے ہیں:

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللهَ بَاطِلُ

وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَامَحَالَةَ زَائِلُ

ان دو مصرعوں کو نبیٔ اکرم ﷺ نے حکایتاً بیان فرمایا کہ: إِنَّ أَصْدَقَ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ: بے شک سچی بات ہے جو شاعر نے کہی ہے: كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللهَ بَاطِلُ، آگاہ ہو جاؤ کہ ہر چیز جو اللہ کے سوا ہے وہ باطل ہے، اور وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَامَحَالَةَ زَائِلُ، اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے سامنے اشعار کا جتنا بھی لٹریچر تھا اس میں سے آپ ﷺ نے چھانٹ کر ان مصرعوں کا انتخاب فرمایا۔ یوں سمجھ لیں کہ اس آیت: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (سورۃ القصص: ۸۸) ”ہر شے ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کے چہرے کے“۔ اس کی ایک شرح مذکورہ شعر ہے۔ جیسے پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ: مَا خَلَا اللهَ سے مَاسِوَى الله مراد ہے، یعنی انسان، کائنات وغیرہ۔ ایک لحاظ سے آپ دیکھیں تو اصل میں Antithesis دو ہی ہیں، ایک اللہ ہے اور دوسرا ماسِوی اللہ ہے۔ اللہ اور ماسِوی اللہ میں ایک ہی تعلق ہے اور وہ خالق اور مخلوق، عبد اور معبود، حاکم اور

محکوم، رب اور مربوب، عالم اور معلوم، قادر اور مقدور کا تعلق ہے۔ اصلًا یہ تعلق ہے اللہ اور ماسِوی اللہ میں ہے، جیسے کہ علمِ کلام کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ "واجب الوجود" ہے، یعنی جس کا ہونا لازمی اور نہ ہونا ممکن نہ ہو۔ عام طور پر اس موقعے پر تین اصطلاحات بیان ہوتی ہیں: "واجب الوجود"، "ممتنع الوجود" اور "ممکن الوجود"۔ "واجب الوجود" کا مطلب ہے، جس کا ہونا لازمی اور نہ ہونا ممکن نہ ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ "ممتنع الوجود" کا مطلب ہے، جس کا ہونا امتناعی، ناممکن ہے، وہ اللہ کا شریک، اللہ کا ساجھی، اللہ کا ند اور ضد ہے۔ جبکہ "ممکن الوجود" کا مطلب ہے، جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، وہ کائنات اور مخلوقات ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ "واجب الوجود" ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ممکن الوجود ہے، چنانچہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے، جو ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا، جو نہیں تھا، پھر ہوا اور پھر نہیں رہے گا۔ لہذا اس تمام گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان جو "ممکن الوجود" ہے، اسے بھی مرنا ہے، اس کائنات پر بھی موت آنی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ السَّاعة کائنات کی اجل ہے، یہ کائنات کی موت ہے، جس طرح انسان کی موت کو اجل کہا گیا ہے، اسی طرح اجتماعی طور پر پوری کائنات کی جو موت کی گھڑی ہے اس کو السَّاعة کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اس تفصیل کے بعد ہم یہاں الساعۃ کی حقیقت جاننے کی کوشش کریں گے کہ الساعۃ بنیادی طور پر ایمان بالآخرۃ کا ایک جزو ہے، اس کی ایک فرع ہے، یعنی جو أَشْرَاطُ السَّاعَة ہیں یا عَلَامَاتُ السَّاعَة ہیں یا أَمَارَاتُ السَّاعَة ہیں اور ان کا جو پورا علم ہے یہ دراصل ایمان بالآخرۃ کی فرع ہے۔ مشہور روایت ہے کہ نبیِّ اکرم ﷺ نے فرمایا: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَيُؤْمِنُوا بِي وَبِمَا جِئْتُ بِهِ». (المعجم الاوسط) "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ایمان لائیں مجھ پر اور اس پر بھی جو میں لے کر آیا ہوں"۔ یہاں سے ایمان بھی واضح ہو گیا کہ ایمان کا مطلب ہے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، اللہ کے وجود کی گواہی دینا، اس کی تصدیق کرنا، اس کو ماننا اور اس کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کی عبدیت و رسالت کی تصدیق کرنا، اس کو تسلیم کرنا، اس کو ماننا۔ رسول ﷺ پر ایمان لانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر اُس چیز پر ایمان لانا، اس کی

تصدیق کرنا جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ لہذا آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے علم کی بنیاد پر جو خبریں دی ہیں، ان کی تصدیق بھی ایمان میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو جو علم دیا ہے، اس میں سے ہی اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی امت کو تلقین و تعلیم فرمائی۔ چنانچہ یہ جو أَشْرَاطُ السَّاعَة ہیں یہ دراصل ایمان بالآخرۃ کی تفصیلات ہیں، گویا کہ یہ اس کا حصہ ہیں۔ لہذا جس موضوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں یہ کوئی خالص Academic موضوع نہیں ہے، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ لطف لینے یا تلذذ کے لیے ہم اس کا مطالعہ کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور ایک لحاظ سے گویا ہمارے عقیدے کا حصہ ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو عقیدہ مرتب کیا ہے، اس میں یہ الفاظ آتے ہیں: وَنُؤْمِنُ بِأَشْرَاطِ السَّاعَةِ مِنْ خُرُوجِ الدَّجَّالِ وَنُزُولِ عِيسَى ابنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ السَّمَاءِ، وَنُؤْمِنُ بِطُلُوعِ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَخُرُوجِ دَابَّةِ الأرض من موضعها. (متن الطحاوية) ''ہم ایمان رکھتے ہیں أَشْرَاطُ السَّاعَة پر اور اس کی علامات میں سے دجال کا خروج، سیدنا مسیح علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہے اور ہم سورج کے مغرب سے طلوع ہونے اور زمین سے متعیّن مقام سے دَابَّةُ الْاَرْض کے خروج پر ایمان رکھتے ہیں''۔

اس بحث کے بعد یہاں ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ دنیا کا آغاز ہوا ہے اور اس کا خاتمہ ہوگا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو خلق کیا، کب خلق کیا، کب ارادہ کیا، کیوں ارادہ کیا، سبب کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔ ایک روایت جو صوفیا کے حلقے میں بہت معروف ہے، اس روایت کو حدیثِ قدسی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، اس میں آتا ہے: «كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِأُعْرَفَ». ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا تو میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے تو میں نے پھر مخلوق کو پیدا کیا''۔ لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے، اس روایت کا ثبوت نبی اکرم ﷺ کی طرف نہیں ملتا۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کیوں پیدا کیا اور ایک مخصوص وقت میں کیوں پیدا کیا؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کسی خاص وقت کا انتخاب کیوں فرمائیں گے اور اس کے خاتمے کے لیے کیا کریں گے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ

ہماری رسائی سے باہر کی چیز ہے اور نہ ہی ہمیں اس میں کوئی غور وخوض کرنا ہے نہ اس میں کوئی کرید کرنی ہے اور نہ ہی اس میں ہمیں کوئی بحث کرنی ہے۔ یہ نوعیت متشابہات کی ہے اور متشابہات میں پڑنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے: ﴿فَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ، وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ﴾ (آلِ عمران:۷) ''جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ ان متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان آیتوں کی تاویلات تلاش کریں، حالانکہ ان آیتوں کا ٹھیک ٹھیک مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔ لہٰذا ہمیں اس میں کلام نہیں کرنا، اس میں تو ہمیں سکوت ہی اختیار کرنا ہے، کیونکہ یہ دنیا ایک خاص وقت میں اللہ نے پیدا کی اور اس کے بعد ایک خاص وقت میں اس کو ختم کریں گے، یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔

دنیا کے خاتمے کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا تھا کہ یہ دنیا جو چل رہی ہے، ایک دم سے بالکل اچانک سوئچ آف کر کے اسے ختم کر دیا۔ ظاہر بات ہے یہ ہمارے ریفرینس سے اچانک ہے، اللہ تعالیٰ کے حوالے سے تو اس کے اچانک خاتمے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز اچانک نہیں ہے، کوئی چیز Random نہیں ہے، کوئی چیز اتفاق سے نہیں ہو رہی۔ لہٰذا یہاں بھی ایک خاص طریقے سے اس دنیا کا خاتمہ ہوگا، اس کی ہمیں خبر خود قرآنِ مجید میں اشارات کے ذریعے دی گئی ہے اور پھر نبی اکرم ﷺ کے ذریعے اس کی تفصیل بیان فرمائی دی گئی ہے۔ یہ جو پرانے آسمانی صحائف ہیں ان میں بھی یہ ایک موضوع رہا ہے کہ اس دنیا کا خاتمہ کیسے ہوگا، کچھ مراحل سے گزر کر اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس دنیا کا خاتمہ ہونا ہے، اس سوال کا جواب ہر مذہب نے دینے کی کوشش کی ہے۔

الہامی مذاہب اور کائنات کے خاتمے کا تصور

تین مذاہب (اسلام، یہودیت اور عیسائیت) جن کو Abrahamic religion یعنی براہیمی مذاہب کہا جاتا ہے یا Monotheistic religion کہا جاتا ہے، اُن میں یہ موضوع بہت اہم رہا ہے اور خاص طور پر جو کرسچن روایت ہے اس میں پورا ایک علم ہے جس کو Eschatology کہتے ہیں اور

Eschatology کا مطلب ہے دنیا کے خاتمے کا علم۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ دنیا کے خاتمے سے پہلے کیا ایونٹس ہوں گے، تو اس سے جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس کی بہت تفصیلات ہیں جو یہودیت میں بھی ہیں، عیسائیت میں بھی ہیں اور اسلام میں بھی ہیں۔ ہم نے ان تین مذاہب کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کیونکہ یہ الہامی مذاہب ہیں اور اصلاً توحید پر قائم ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں کفر و شرک کے داخل ہونے کے باوجود قرآنِ مجید میں بھی انھیں مشرکین میں شمار نہیں کیا گیا، بلکہ اہلِ کتاب کی ایک الگ قسم بنائی ہے۔ جو بنی اسماعیل تھے یعنی مشرکینِ مکہ وہ تو کھلے اور جلی مشرک ہیں، اُن کو قرآن نے مشرک کہا ہے، مگر ان (اہلِ کتاب) کو اگرچہ کافر کہا گیا ہے مگر باوجود ان کے شرک کے انھیں مشرک نہیں کہا گیا۔ بہرحال، الہامی مذاہب میں کائنات کے خاتمے کا پورا ایک علم موجود ہے۔

علمِ موجود و مفقود کا فرق

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم تک ایک علم پہنچا ہے کہ یہ کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا، مثلاً، نماز ہے، روزہ ہے، حج ہے، زکوۃ ہے، امر بالمعروف ہے نہی عن المنکر ہے اور جہاد ہے۔ اسی طریقے سے حقوق الناس (لوگوں کے حقوق) ہیں تو ان اعمال کو بجالانا ہے اور ان کو ترک نہیں کرنا یہ تشریع ہے اور اسے تشریع کا علم کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ میرے ساتھ کل کیا ہونا ہے، پرسوں کیا ہونا ہے، میری شادی ہوگی یا نہیں ہوگی، اولاد ہوگی یا نہیں ہوگی، میں آگے جاکر کامیاب ہوں گا یا نہیں اور کتنا عرصہ زندہ رہوں گا اور کیا حالات ہوں گے۔ مجھے کب مرنا ہے، کائنات کو کب ختم ہونا ہے وغیرہ، تو یہ علمِ تکوین ہے، اسے تکوینی امور کا علم کہا جاتا ہے۔ یہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر ظاہر نہیں کیا۔ بحیثیتِ مسلمان ہمیں چاہیے کہ جس چیز کا علم ہمیں دیا گیا ہے صرف اُس پر توجہ دیں اور جس چیز کو مخفی رکھا گیا ہے اس کے درپے نہ ہوں۔ ان معاملات کے درپے ہونا نہ صرف حماقت بلکہ خطرناک ہے اور اس سے ایمان میں خلل آسکتا ہے اور اس سے عقیدے میں کمزوری آسکتی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے عقیدۂ طحاویہ میں اس پر عمدہ کلام فرمایا ہے۔ پہلے انھوں نے اللہ کی ذات کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں، پھر رسول اللہ ﷺ کے بارے میں، پھر قرآن کے بارے میں اور پھر تقدیر

کے حوالے سے گفتگو کی۔ ایک خاص مقام پر پہنچ کر وہ کہتے ہیں: فَهَذَا جُمْلَةُ مَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ مَنْ هُوَ مُنَوَّرٌ قَلْبُهُ مِنْ أَوْلِيَاءِ اللهِ تَعَالَى، وَهِيَ دَرَجَةُ الرَّاسِخِينَ فِي الْعِلْمِ؛ لِأَنَّ الْعِلْمَ عِلْمَانِ: عِلْمٌ فِي الْخَلْقِ مَوْجُودٌ، وَعِلْمٌ فِي الْخَلْقِ مَفْقُودٌ، فَإِنْكَارُ الْعِلْمِ الْمَوْجُودِ كُفْرٌ، وَادِّعَاءُ الْعِلْمِ الْمَفْقُودِ كُفْرٌ، وَلَا يَثْبُتُ الْإِيمَانُ إِلَّا بِقَبُولِ الْعِلْمِ الْمَوْجُودِ، وَتَرْكِ طَلَبِ الْعِلْمِ الْمَفْقُودِ. (متن الطحاوية) "یہ من جملہ وہ چیز ہے جو کہ درکار ہے ان حضرات کو جو اللہ تعالیٰ کے اولیا ہیں، جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے منور کر دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو علم میں رسوخ کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم وہ ہے جو مخلوق میں موجود ہے اور دوسرا علم وہ ہے جو مخلوق میں مفقود ہے۔ وہ علم جو موجود ہے اس کا انکار کفر ہے اور وہ علم جو مفقود ہے اس کا دعویٰ یعنی اس کے پیچھے پڑنا کفر ہے۔ ایمان ثابت نہیں ہوتا جب تک علمِ موجود کو قبول نہ کیا جائے اور علمِ مفقود کی طلب ترک نہ کی جائے"۔

اگر ہم عقیدۂ طحاویہ کا مطالعہ کریں تو اس میں بہت سی چیزیں قابلِ غور ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر سب سے زیادہ گفتگو ہے، پھر تقدیر پر سب سے زیادہ گفتگو ہے۔ چونکہ وہ بھی اللہ کی ذات ہی کے حوالے سے ایک معاملہ ہے، چنانچہ علما نے بیان کیا ہے کہ تقدیر بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں: ایک صفتِ علم ہے اور دوسری صفتِ قدرت ہے۔ لہٰذا جو اَلرَّاسِخِينَ فِي الْعِلْمِ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں پر مذکورہ تفصیل کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ اس تفصیل کے بعد ہم امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی طرف آتے ہیں کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے: عِلْمٌ فِي الْخَلْقِ مَوْجُودٌ، وَعِلْمٌ فِي الْخَلْقِ مَفْقُودٌ. "ایک علم وہ ہے جو مخلوق میں موجود ہے اور دوسرا علم وہ ہے جو مخلوق میں مفقود ہے"۔ یہ اہم بات ہے، فرماتے ہیں کہ جو علمِ موجود ہے اللہ نے اس کو وجود بخشا اور بندوں تک پہنچایا اور اس کا انکار کفر ہے۔ مثلاً، اللہ نے کائنات کو پیدا کیا، اس نے انسان کو پیدا کیا، پھر وہ انسان کو دنیا سے لے جائے گا، وہ کائنات کو ختم کر دے گا، وہ ایک اور عالم کو برپا کرے گا اور وہاں حساب کتاب ہو گا، وہاں حشر ہو گا، نشر ہو گا، وہاں شفاعت ہو گی، وہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقامِ محمود ہو گا، وہاں پر صراط ہو گی، وہاں پر میزان ہو گا، وہاں اعمال تولے جائیں

گے، وہاں پر حوض ہوگا، وہاں جنت اور جہنم ہوگی۔ یہ سب در حقیقت وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو عطا کیا ہے، یعنی علمِ موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ علم جو مفقود ہے یعنی جو مخلوق کے لیے نہیں ہے، مثلاً، مجھے کب پیدا ہونا ہے؟ یہ آدمی کو نہیں معلوم کہ اس نے کب پیدا ہونا ہے، کس دور میں پیدا ہونا ہے، کیسے پیدا ہونا ہے، دنیا سے اس کو کب جانا ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ کتنا رزق اس کو پوری زندگی میں کمانا ہے، کتنا علم اس کو حاصل کرنا ہے اور کیسے اعمال اس کو کرنے ہیں؟ یہ بھی اس کو پہلے سے معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس کو اپنی آخرت کا بھی نہیں پتا کہ أَمْ سَعَیْدٌ أَوْ شَقِیٌّ کہ وہ خوش بخت ہوگا، جنّتی ہوگا یا بد بخت ہوگا، جہنمی ہوگا۔ البتہ اس کو معیارات بتا دیے گئے ہیں لیکن متعیّن طور پر اپنی ذات کے بارے میں اُس کو علم نہیں ہے، یہ دراصل وہ علم ہے جو مخلوقات میں مفقود ہے اور یہی علم تکوین کہلاتا ہے۔ تو فرمایا کہ وہ جو علمِ موجود ہے، جس کی مثالیں ذکر کی گئیں، اس کا انکار کرنا کفر ہے اور اسی طرح جو علمِ مفقود ہے اس کا ادّعا کفر ہے۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ مجھے پتا ہے کہ دنیا کا خاتمہ کب ہوگا، تو ظاہر بات ہے کہ یہ ایک ایسے علم کا دعویٰ ہے کہ جو اس کے پاس نہیں ہے، چنانچہ سورۂ لقمان کی آخری آیات میں فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان: ۳۴) یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس اَلسَّاعَة کا علم ہے۔ لہٰذا ایسا دعویٰ باطل ہے اور اس سے کفر لازم آتا ہے۔ چنانچہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَلَا يَثْبُتُ الْإِيمَانُ إِلَّا بِقَبُولِ الْعِلْمِ الْمَوْجُودِ. ”ایمان ثابت نہیں ہوتا مگر جو موجود علم ہے اس کو قبول کرکے اور جو مفقود علم ہے اس کی طلب کو ترک کرکے“۔ یہ ایک بہت اہم نکتہ ہے۔ لہٰذا جو لوگ بہت قطعیت کے ساتھ اطلاقات کرتے ہیں، پورے کے پورے ٹائم ٹیبل دینا شروع کر دیتے ہیں، پورا کیلنڈر بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس سال یہ ہوگا، پھر اگلے سال یہ ہوگا، پھر اس سے اگلے سال وہ ہوگا، پورا ایک نقشہ اور منظر بیان کرتے ہیں، یہ بہت ہی غلط اور خطرناک بات ہے۔ یعنی بات صرف یہ نہیں ہے کہ آپ نے ایک اٹکل لگایا تھا اور وہ ناکام ہو گیا، بلکہ یہ تو عقیدے کا مسئلہ ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ایمان نام ہے اس چیز کا کہ جو علمِ موجود ہے اس کو قبول کریں، اس کی قبولیت میں کوئی کوتاہی نہ کریں، اور جو علمِ مفقود ہے اس کے درپے نہ ہوں، اس کے پیچھے نہ لگیں۔ اور جو چیز اللہ نے اپنے بندوں سے مخفی رکھی ہے اس کی کُرید نہ کریں، اس کی کھوج میں نہ پڑیں۔

وقوعِ قیامت کا علم، علمِ مفقود

الساعۃ یعنی وقوعِ قیامت کے بارے میں جو سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ:﴿إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان:۳۴)"اللہ تعالیٰ ہی کے پاس الساعۃ کا علم ہے"۔یعنی اس کا جو مدار ہے وہ اللہ کی طرف ہے اور اس کے علم کا تعین اور مدار اللہ کے پاس ہے۔پھر ایک اور مقام پر فرمایا:﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا، فِيمَ أَنْتَ مِنْ ذِكْرَاهَا، إِلَى رَبِّكَ مُنْتَهَاهَا﴾(النازعات:۴۲تا۴۴)"اے نبی!آپ سے قیامت کے بابت سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہو گا،آپ ﷺ فرما دیجیے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے"۔ایک اور جگہ اس طرح واضح طور پر فرمایا:﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا، قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي، لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ، ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، لَاتَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً، يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا، قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾(الاعراف:۱۸۷)"(اے رسول)لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب برپا ہوگی؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے۔وہی اسے اپنے وقت پر کھول کر دکھائے گا،کوئی اور نہیں۔وہ آسمانوں اور زمین میں بڑی بھاری چیز ہے، جب آئے گی تو تمھارے پاس اچانک آجائے گی۔یہ لوگ تم سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے تم نے اس کی پوری تحقیق کر رکھی ہے۔کہہ دو کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے،لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے"۔

اب اس میں ایک بات تو واضح ہو گئی کہ قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔زیرِ بحث موضوع کی اہمیت کا اندازہ یہاں سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حدیث کے لٹریچر میں وہ حدیث جسے اُم السنۃ کہا جاتا ہے،جو مرتبہ قرآنِ مجید میں سورۂ فاتحہ کو حاصل ہے،قریب قریب ویسا ہی مرتبہ حدیث و سنت کے مجموعے میں اس حدیث کو حاصل ہے،اس حدیث کو حدیثِ جبرائیل یا حدیثِ احسان بھی کہا جاتا ہے۔وہاں پر بالکل بنیادی سوالات اسلام،ایمان اور احسان کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کیے گئے ہیں۔ان بنیادی سوالات کے بعد جو سوال کیا گیا ہے،وہ ہے:«فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ».(مسلم)"اے نبی ﷺ! الساعۃ کی بابت کچھ ارشاد

فرمائیے"۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ». (مسلم) "جس چیز کے بارے میں یعنی الساعۃ کی بابت جس سے سوال کیا جارہا ہے وہ اس معاملے میں سائل سے زیادہ نہیں جانتا"۔ یعنی جو سوال کرنے والا ہے اس سے زیادہ مسئول نہیں جانتا۔ اب آپ دیکھیے کہ سائل کون ہیں؟ سائل ہیں جبرائیل علیہ السلام، جبکہ جبرائیل علیہ السلام کا تعارف قرآن کی زبانی دیکھیے: ﴿مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ (التکویر:۲۱) "وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے"۔ یعنی وہ مُطاع ہے یعنی فرشتوں میں پیشوا ہے اور ہے بھی امین۔ گویا ہمارا اِن کے بارے میں تصور ہے یہ ہے کہ وہ سید الملائکہ ہیں، فرشتوں کے سردار ہیں۔ اسی طرح مسئول کون ہیں؟ مسئول ہیں محمد رسول اللہ ﷺ، جو کہ سید البشر ہیں۔ تو سید الملائکہ، سید البشر سے سوال کررہے ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ فرمارہے ہیں کہ میرا اور آپ کا علم برابر ہے۔ لہذا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس بات کا علم کہ الساعۃ کب برپا ہوگی، دنیا کا خاتمہ کب ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ کے غیب کے خزانوں میں سے ہے، بلکہ اس حدیث کے ایک طریق میں یہ آیت بھی پڑھی گئی: ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ﴾ (الانعام:۵۹) "غیب کی کنجیاں اسی (اللہ) کے پاس ہیں انھیں نہیں جانتا مگر وہی"۔ تو گویا وقوعِ قیامت کا وقت بھی اُن چیزوں میں سے ہے جو مفاتح الغیب ہیں ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور پھر ایک اور روایت میں یہ ہے کہ «فَذَاكَ مِنْ أَشْرَاطِهَا فِي خَمْسٍ مِنَ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللهُ». (مسلم) "یہ اُن پانچ امورِ غیب میں سے ہے جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا"۔ پھر آپ ﷺ نے سورۂ لقمان کی تلاوت کی جس میں مفاتیح الغیب کا ذکر ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ علم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے نہ کسی ملکِ مقرب کو مطلع فرمایا اور نہ کسی نبیِ مرسل کو اس کی اطلاع دی۔

چنانچہ حدیثِ جبرائیل میں الساعۃ کے بارے میں سوال کیا جانا اس موضوع کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے، اس لیے کہ حدیثِ جبریل وہ ہے جس میں دین کی تعلیمات کا خلاصہ ہے اور جس کے بارے میں آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: «هَذَا جِبْرِيلُ، أَرَادَ أَنْ تَعَلَّمُوا إِذْ لَمْ تَسْأَلُوا». (مسلم) "یہ جبرائیل تھے اور یہ آئے تھے تمھارے پاس تاکہ تمھیں تمھارا دین تعلیم فرمائیں"۔ ایک روایت کے مطابق الساعۃ کے بارے میں

جبریل علیہ السلام کے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: «سَأُحَدِّثُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا». (مسلم) ”میں اس کی کچھ علامات آپ کو بتاتا ہوں“۔ اور اس روایت کا جو زیادہ معروف طریق ہے، اس میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے قیامت کے وقت سے لاعلمی کا اظہار کیا، تو اگلا سوال جبرائیل علیہ السلام نے کیا: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَتِهَا (مسلم) کہ ٹھیک ہے آپ اس کے بارے میں علم نہیں رکھتے کہ یہ کب وقوع پذیر ہوگی تو اب آپ اس کی کچھ علامتیں بتائیے! تو پھر آپ ﷺ نے جواب دیا: «أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ». (مسلم) ”یہ کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنے اور تم دیکھو ننگے پاؤں ننگے بدن، بکریوں کے چرواہے اونچی اونچی عمارتیں بنایا کریں گے“۔ تو اس سوال جواب سے بھی اس موضوع کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تُتَّخَذَ الْمَسَاجِدُ طُرُقًا». (مستدرک حاکم) ”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسجدوں کو لوگ راستہ (گزرگاہ) بنالیں گے“۔ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اچانک حادثاتی موت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ ایکسیڈینٹ ہم آج کل کے زمانے میں بھی دیکھتے ہیں کہ بم دھماکوں کے ذریعے لوگ چلے جاتے ہیں اور اسی طریقے سے ایک دم بیٹھے بیٹھے دل کس دورہ پڑتا ہے اور آدمی مرجاتا ہے۔ یہ اچانک آنے والی موت ہے۔

قیامت کا وقوع اچانک ہوگا

قرآنِ کریم سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قیامت اچانک آئے گی اور جس وقت وہ برپا ہوگی کوئی اس کو قبول نہیں کر رہا ہوگا، یعنی ذہنی طور پر اس کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا: ﴿لَا تَأْتِيكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ (الاعراف:۱۸۷) ”وہ تم پر نہیں آئے گی مگر اچانک“۔ دوسری طرف ہمیں نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی بہت سی علامات بتائی ہیں، احادیث کے ذخیرے میں یہ بحث کافی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ ان احادیث سے ہمیں ایک خاص ترتیب بھی معلوم ہوگئی ہے کہ بڑے بڑے ایونٹس ہوں گے، مہدی ہیں، اُس کے بعد دجال ہے، اس کے بعد مسیح ہیں، اس کے بعد یاجوج ماجوج ہیں، اس کے بعد دَابَّةُ الْاَرْض ہے۔ اس ترتیب

کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ بہت متوقع ہو گا کہ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس کے بعد لوگوں کو قیامت کا اندازہ ہو جانا چاہیے، لیکن قرآن بتا رہا ہے:﴿لَا تَأْتِيكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ (الاعراف:۱۸۷) ''وہ قیامت تم پر نہیں آئے گی مگر اچانک''۔ اسی حوالے سے نبی ﷺ نے فرمایا: «وَلَتَقُومَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ نَشَرَ الرَّجُلاَنِ ثَوْبَهُمَا بَيْنَهُمَا، فَلاَ يَتَبَايَعَانِهِ وَلاَ يَطْوِيَانِهِ، وَلَتَقُومَنَّ السَّاعَةُ وَقَدِ انْصَرَفَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ لِقْحَتِهِ فَلاَ يَطْعَمُهُ، وَلَتَقُومَنَّ السَّاعَةُ وَهُوَ يُلِيطُ حَوْضَهُ فَلاَ يَسْقِي فِيهِ، وَلَتَقُومَنَّ السَّاعَةُ وَقَدْ رَفَعَ أُكْلَتَهُ إِلَى فِيهِ فَلاَ يَطْعَمُهَا». (بخاری) ''قیامت ضرور بالضرور قائم ہوگی اور دو لوگ اپنا کپڑا پھیلائے ہوئے ہوں گے تو نہ ہی ان کو اس کی خرید و فروخت کا موقع ملے گا اور نہ ہی وہ اس کو واپس لپیٹ سکیں گے۔ قیامت قائم ہو جائے گی اور ایک آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ دھولے گا لیکن اس کو پینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ قیامت قائم ہو جائے گی اور ایک آدمی اپنے جانوروں کا حوض درست کر رہا ہو گا لیکن موقع نہیں ملے گا کہ اس میں سے وہ اپنے جانور کو پلا سکے اور قیامت ضرور بالضرور قائم ہوگی اور ایک شخص جو اپنا نوالہ اپنے منھ کی طرف لے جائے گا لیکن اس کو کھا نہیں پائے گا''۔ اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اچانک ہو گا اور لوگ بالکل اس کی توقع نہیں کر رہے ہوں گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نبی ﷺ نے اتنی وضاحت سے اور بعض اوقات بہت تفصیل سے قیامت کی نشانیاں بیان کی ہیں تو یہ حادثہ لوگوں کے لیے اچانک تو نہ ہونا چاہیے۔ اس میں سمجھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ لوگ اندازے لگا رہے ہوں گے کہ قیامت اب آیا چاہتی ہے، لیکن اس کی آمد کے بارے میں ان کے اندازے دس، بیس، پچاس سال یا سو ڈیڑھ سو سال تاخیر پر مبنی ہوں اور اسی دوران قیامت اچانک آجائے۔ لیکن ایک دوسری اہم بات بھی ہے جو اس سوال کے جواب میں پوشیدہ ہے کہ قیامت قائم کن لوگوں پر ہوگی اور الساعۃ کا حادثہ کون لوگ جھیلیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «مِنْ شِرَارِ النَّاسِ مَنْ تُدْرِكُهُمُ السَّاعَةُ وَهُمْ أَحْيَاءٌ». (بخاری) ''انسانوں میں بدترین لوگ وہ ہوں گے، جو اُن میں سے الساعۃ کو پائیں گے''۔ یعنی بدترین خلائق پر الساعۃ قائم ہوگی۔ اسی کی مزید وضاحت نبیٔ اکرم ﷺ کے اس فرمان میں ہوتی ہے: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اللهُ، اللهُ».

(مسلم) ”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمین میں اللہ اللہ نہیں کہا جائے گا“۔ یعنی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہنے والے، اللہ اللہ کرنے والے، یعنی اللہ کو یاد کرنے والے، اللہ پر ایمان رکھنے والے موجود ہوں گے توقیامت قائم نہیں ہوگی۔ اب یہ خرابی کیسے پیدا ہوگی، کیا ایسا ہوگا کہ مہدی اور سیدنا مسیح علیہما السلام کے غلبے کے بعد پھر بتدریج اور آہستہ آہستہ خرابی آئے گی کہ سارے لوگ ہی خراب ہوجائیں گے؟ ظاہر ہے ایک خاص وقت میں اہلِ ایمان کی موت سے یہ صورتِ حال پیش آئے گی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ: «إِذْ بَعَثَ اللهُ رِيحًا طَيِّبَةً، فَتَأْخُذُ هُمْ تَحْتَ آبَاطِهِمْ، فَتَقْبِضُ رُوحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَكُلِّ مُسْلِمٍ، وَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ، يَتَهَارَجُونَ فِيهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ، فَعَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ». (مسلم) ”قیامت برپا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا بھیجے گا جو لوگوں کی بغلوں کے نیچے تک پہنچ جائے گی، پھر ہر مسلمان اور ہر مومن کی روح قبض کر لی جائے گی اور برے لوگ ہی باقی رہ جائیں گے، جو گدھوں کی طرح کھلے بندوں جماع کریں گے، پس انھی پر قیامت قائم ہوگی“۔ اس ہوا کا حال یہ ہوگا کہ جہاں اس کو ایمان ملے گا وہ وہاں پہنچ جائے گی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ وہ اہلِ ایمان کے بغل کے نیچے ٹکرائے گی اور ہر مومن پر گویا موت واقع ہوجائے گی۔ اس کے بعد پھر روایت میں آتا ہے: «وَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ، يَتَهَارَجُونَ فِيهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ، فَعَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ». ”اور پھر بدترینِ خلائق باقی رہ جائیں گے اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے گدھوں کی طرح تعلق قائم کریں گے اور ان پر الساعۃ قائم ہوگی“۔ ایک روایت میں ہے: «إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ رِيحًا مِنَ الْيَمَنِ أَلْيَنَ مِنَ الْحَرِيرِ فَلَا تَدَعُ أَحَدًا فِي قَلْبِهِ -قَالَ أَبُو عَلْقَمَةَ- مِثْقَالُ حَبَّةٍ، -وَقَالَ عَبْدُ الْعَزِيزِ- مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ إِيمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ». (مسلم) ”اللہ تعالیٰ یمن سے ایک ہوا چلائیں گے جو حریر سے زیادہ نرم ہوگی اور وہ ہوا نہیں چھوڑے گی کسی بھی ایسے شخص کو جس میں ایک ذرے کے برابر بھی ایمان ہوگا مگر یہ کہ اس کی جان وہ قبض کر لے“۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اصل میں جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں وہ سب چلے جائیں گے، یعنی دنیا سے رخصت ہوں گے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ وہ ہوا ہر جگہ داخل ہوگی، یعنی اگر کوئی مومن پہاڑ کی کھوہ میں ہے یا سمندر کی گہرائی میں ہے تب بھی وہ ہوا پہنچ جائے گی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتَّى تُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزَّى». فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنْ كُنْتُ لَأَظُنُّ حِينَ أَنْزَلَ اللهُ: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ أَنَّ ذَلِكَ تَامًّا قَالَ: «إِنَّهُ سَيَكُونُ مِنْ ذَلِكَ مَا شَاءَ اللهُ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللهُ رِيحًا طَيِّبَةً، فَتَوَفَّى كُلَّ مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ، فَيَبْقَى مَنْ لَا خَيْرَ فِيهِ، فَيَرْجِعُونَ إِلَى دِينِ آبَائِهِمْ». (مسلم) ''دن اور رات نہیں ٹلیں گے، دنیا کا خاتمہ نہیں ہوگا یہاں تک کہ دوبارہ لات و عزّٰی کی پوجا شروع ہوجائے گی''۔ سیدہ نے عرض کی: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (سورۂ توبہ: ۳۳) ''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ وہ اسے غالب کردے کل ادیان پر''۔ اس آیتِ مبارکہ کے نازل ہونے پر میرا گمان تھا کہ جب دین کا غلبہ ہوگا تو یہ غلبہ تام دنیا کے خاتمے تک رہے گا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ غلبہ رہے گا جب تک اللہ چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا چلائیں گے اور ہر اُس شخص کو وفات دے دیں گے جس کے دل میں ایک دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا۔ پھر وہ لوگ رہ جائیں گے جن میں کوئی خیر نہیں ہے، تو وہ اپنے پرانے آبا و اجداد کے دین کی طرف لوٹ جائیں گے''۔ یعنی وہی لات و عزّٰی کی پوجا دوبارہ شروع ہوجائے گی۔ یہ تو ہوئی قیامت کے اچانک وقوع کی تفصیل، البتہ یہاں ایک طالب علمانہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کا اچانک ظہور کیسے ہوگا، جبکہ اس کی علامات تو بتائی گئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت مومنین نہیں ہوں گے، حالانکہ جن لوگوں کو علامات بتائی گئی ہیں وہ تو اہلِ ایمان ہیں، قیامت کا خوف اور اس کی فکر بھی انھی اہلِ ایمان کو ہوگی۔ مومنین کو قیامت کی علامات بتانے کا فائدہ ہوگا، وہ قیامت کے وقوع سے پہلے ان کے ذریعے اپنی آخرت کی طرف متوجہ ہوں گے۔ جبکہ جن لوگوں پر الساعۃ یعنی قیامت قائم ہورہی ہے، وہ تو غافل ہیں، بالکل جانوروں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں، انھیں نہ کوئی خوفِ خدا ہے نہ فکرِ آخرت و قیامت، وہ تو نہ نشانیاں دیکھیں گے نہ آخرت کو سوچیں گے تو ان کے لیے قیامت اچانک رونما ہونا والا حادثہ ہوگا۔

وقوعِ قیامت کو سمجھنے کا دوسرا زاویہ

السّاعۃ کا ترجمہ عموماً قیامت سے کیا جاتا ہے جو کہ ٹھیک ہے اور یہی علما میں بھی معروف ہے اور عوام وخواص میں بھی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اصل میں تو جو لفظ ''نفخۂ اولیٰ'' ہے اس کو عام طور پر قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ وہ عظیم حادثہ ہے جس میں بڑا ہنگامہ ہو گا، ستارے جھڑ جائیں گے، سورج چاند آپس میں مدغم ہو جائیں گے، سمندر کھولائے جائیں گے، انسان پتنگوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ یہ وہ منظر ہے جس کے لیے الساعۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا کے خاتمے کا ذکر سورۃ الحج کے شروع میں یوں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ، إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ﴾ (الحج:۱) ''لوگو! اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے''۔ لہٰذا وہ پہلا بڑا زلزلہ، بڑی کپکپی، بڑا رجفہ ہو گا، وہ اصل میں الساعۃ ہے۔ جب پہلا نفخہ پھونکا جائے گا اور اس کی کچھ مدت کے بعد دوسری مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا، تب قیامت قائم ہوگی۔ ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ﴾ (النحل:۸۵) ''ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ اُن کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انھیں لمحے بھر کی مہلت دی جائے گی''۔ یعنی لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور وہ اللہ کی جناب میں حاضر ہوں گے۔ اسی کے بارے میں قرآنِ مجید کہتا ہے: ﴿لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً﴾ (الاعراف:۱۸۷) ''وہ تم پر نہیں آئے گی مگر اچانک''۔

السّاعۃ کے متعلق مختلف تعبیروں کا استعمال

علما نے قیامِ قیامت کی مختلف تعبیرات کی تقسیم یوں کی ہے کہ ایک ہے الساعۃ الکبریٰ، جس میں دنیا کا خاتمہ ہو گا، یعنی یہ الساعۃ بھی ہے اور القیامۃ بھی ہے۔ یہ وہی ہے جس کا تذکرہ احادیث میں ہوتا ہے کہ نبیٔ اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک یہ واقعات نہ ہوں۔ لہٰذا جس کو ہم قیامت سے تعبیر کرتے ہیں یا معروف معنوں میں جس کو ہمارے ہاں ''قیامتِ کبریٰ'' کہا جاتا ہے۔ اسی مذکورہ الساعۃ کے علاوہ

ایک اور الساعۃ بھی ہے جس کو ''الساعۃ الوسطیٰ'' کہا جائے گا یعنی یہ ایک درمیانی قیامت ہے۔ یہ دراصل ایک عہد کے لوگ اور ایک نسل کے لوگوں کا خاتمہ ہے، اس کے لیے بھی اس طرح کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر دریافت کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ''محمد'' نامی ایک انصاری لڑکا موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سوال کے جواب میں فرمایا: «إِنْ يَعِشْ هَذَا الْغُلَامُ فَعَسَى أَنْ لَا يُدْرِكَهُ الْهَرَمُ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ». (مسندِ احمد) ''اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو قریب ہے کہ اس کے بوڑھا ہونے سے پہلے پہلے قیامت قائم ہو جائے''۔ اس لڑکے کی عمر اگر بہت طویل ہوئی تو یہ نہیں مرے گا یہاں تک کہ الساعۃ قائم ہو جائے گی۔ اس سے بھی لوگوں کو لگا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ایک بچے کی عمر کے بقدر یہ دنیا قائم رہے گی، اس کے بعد دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ نہیں تھی۔ اس کی وضاحت فتح الباری میں بیان کردہ دوسری روایت سے ہوتی ہے، اس میں یہ الفاظ آتے ہیں: «لَا يَبْقَى مِنْكُمْ عَيْنٌ تَطْرِفُ». ''تم میں سے کوئی جھپکنے والی آنکھ باقی نہ رہے گی''۔ مطلب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کائنات کے خاتمے کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ اُس عہد کے، اس وقت کے لوگوں کی زندگی کے خاتمے کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا۔ ایک اور حدیث ہے جس میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک ماہ پہلے کا واقعہ ہے کہ تم لوگ مجھ سے الساعۃ (قیامت) کے بارے میں پوچھتے ہو جبکہ اس کا حقیقی اور متعیّن علم اللہ ہی کے پاس ہے کہ وہ کب آئے گی، کس گھڑی کس ساعت میں یہ حادثہ ہو گا۔ لیکن میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جتنے لوگ زمین میں موجود ہیں، ایک سو سال بعد ان میں سے کوئی بھی نہیں ہو گا۔ تو اس روایت سے بھی کچھ صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ آج سے سو سال کے بعد دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حالانکہ بات وہی ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتا رہے تھے کہ سو سال کے عرصے میں یہ ایک پوری پیڑھی یا پوری نسل ختم ہو جائے گی۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال دس ہجری کا ہے اور آخری صحابی ابو طفیل عامر رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۷ھ یا ۱۱۰ھ میں انتقال کر گئے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتا رہے تھے کہ اس

وقت جتنے انسان زمین پر موجود ہیں، ایک سو سال بعد ان میں سے کوئی بھی نہیں ہو گا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آپ لیکچر دینے جائیں اور وہاں آپ کہیں کہ دیکھیں بھئی! آج یہاں جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، آج سے نوے سال بعد ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہو گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی انسان زندہ نہیں ہو گا، بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں وہ نہیں ہوں گے۔ یہاں پر بھی آپ ﷺ یہ بتا رہے تھے کہ یہ جو نسل ہے ساری کی ساری ختم ہو جائے گی۔ اس کو کچھ علما نے الساعۃ الوسطیٰ کہا ہے کہ کسی ایک خاص عہد کے سب لوگ ختم ہو جائیں، تو وہ گویا ان کی قیامت آ گئی۔ جبکہ تیسری قیامت یا الساعۃ وہ ہے جس کو الساعۃ الصغریٰ یا ''قیامتِ صغریٰ'' کہتے ہیں۔ اصل میں تو ہمارے ہاں قیامتِ صغریٰ اردو میں ایک محاورہ ہے، کہ جب ہمارے ہاں کوئی بڑا حادثہ ہوتا ہے، کوئی بڑا بم دھماکہ ہوتا ہے، کوئی زلزلہ آتا ہے یا کوئی سونامی، تو اس موقعے پر ہم یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ جناب یہ تو قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ لیکن یہاں ہم محاورے سے ہٹ کر علمی طور پر ذکر کر رہے ہیں کہ الساعۃ الصغریٰ جس کو ہم قیامتِ صغریٰ کہتے ہیں، وہ انسان کی موت ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ، حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ، أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ﴾ (الانعام:۳۱) ''نقصان میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اپنی ملاقات کی اطلاع کو جھوٹ قرار دیا، جب اچانک وہ گھڑی آ جائے گی تو یہی لوگ کہیں گے: افسوس! ہم سے اس معاملے میں کیسی تقصیر ہوئی۔ اور ان کا حال یہ ہو گا کہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ دیکھو! کیسا برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں''۔ چنانچہ یہاں پر جس الساعۃ کا تذکرہ ہے، وہ گویا انسان کی موت ہے۔ ایک اور جگہ سورۃ المنافقون میں فرمایا: ﴿وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ (المنافقون:۱۰) ''جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اُس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب! کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں

شامل ہو جاتا"۔ تو یہاں پر بھی مراد قیامتِ صغریٰ ہے گویا ہر انسان کی موت اس کے لیے قیامت ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ. ہر مرنے والا شخص جب مرجاتا ہے تو اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ یہ جملہ ہمارے ہاں حدیث کے طور پر بھی معروف ہے لیکن اس طرح کی کوئی مرفوع حدیث ثابت نہیں ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ایک لحاظ سے جو بندے کی مہلتِ عمل ہے، اس کا اختتام بھی قیامت ہے کہ لوگوں کو جی اٹھایا جائے گا اور پھر حساب کتاب ہو گا۔ تو خاص معنوں میں آپ کی مہلتِ عمر یعنی "مہلتِ عمل" ختم ہو گئی۔ البتہ اس مہلتِ عمل سے چند اعمال مستثنیٰ ہیں، مثلاً صدقۂ جاریہ ہے اس کا خیر بہر حال جاری رہتا ہے، لیکن جو بڑا معاملہ ہے وہ تو ختم ہو جاتا ہے، تو گویا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ یہاں پر جو قیامتِ صغریٰ ہے وہ گویا ہر انسان کے ساتھ خاص ہے کہ جب اس کے جسم سے اس کی روح نکل جاتی ہے، وہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کی تمام سعی و جدوجہد منقطع ہو جاتی ہے، تو اس کی قیامت آگئی۔ یہ قیامتِ صغریٰ انفرادی موت ہے اور وہ جو قیامتِ کبریٰ ہے وہ اجتماعی موت ہے اور وہ سب کے اوپر آتی ہے۔ غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات ایسے ہیں، جہاں پر دونوں طرح کی قیامتوں کا تذکرہ ہے: سورۃ الواقعہ میں یہ بہت جلی طور پر بیان ہوا ہے، اس سورت کے آغاز میں الساعۃ الکبریٰ یعنی بڑی قیامت کا تذکرہ ہے اور اس سورت کے اختتام پر الساعۃ الصغریٰ یعنی ہر شخص کی موت کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ اسی سورت کے آغاز میں آتا ہے: ﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ، لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ، خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (الواقعہ: ۱ تا ۳) "جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا، تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہو گا۔ وہ تہہ و بالا کر دینے والی آفت ہو گی"۔ آپ دیکھ لیجیے کہ یہاں پر جو الواقعہ ہے یہ جیسے ایک بڑے حادثے کا بیان ہے اور اس میں دونوں نفخے ذکر ہو گئے۔ بہر حال، اسی نفخۂ اولیٰ کا منظر کچھ یوں ہو گا: ﴿إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا، وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا، فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا﴾ (الواقعہ: ۴ تا ۶) "زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے"۔ اور پھر ایک دم منظر تبدیل ہوتا ہے اور نفخۂ ثانیہ کے بعد کی صورتِ حال کا

بیان شروع ہو جاتا ہے: ﴿وَكُنتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً، فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ، وأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ، وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ، أُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ، فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ﴾ (الواقعہ:۷ تا ۱۲) "تم لوگ اُس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے: دائیں بازو والے، سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔ اور بائیں بازو والے، تو بائیں بازو والوں (کی بد نصیبی کا) کا کیا ٹھکانا! اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں، وہی تو مقرب لوگ ہیں، نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے"۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں یہ جو الواقعہ ہے یہ سب سے حقیقی واقعہ ہے، اس واقعے کے بھی دو حصے ہیں: الساعۃ اور القیامۃ، ان دونوں کو "الواقعۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں فرمایا: ﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ* وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ* وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ﴾ (الواقعہ:۸۳ تا ۸۵) "تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اُس وقت تمھاری بنسبت ہم اُس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے"۔ تو یہاں پھر انسان کی قیامتِ صغریٰ یعنی انفرادی قیامت کا تذکرہ ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ قیامِ قیامت کو اگر اس زاویے سے دیکھیں تو اس کی تقسیم اس طرح ہے کہ اصل میں الساعۃ الکبریٰ وہ قیامت ہے جس میں ساری کائنات کا خاتمہ ہو گا۔ ایک قیامتِ وسطیٰ ہے کہ کسی خاص عہد کا خاتمہ یعنی ایک پوری پیڑھی ختم ہو گئی۔ ہر شخص یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ جیسے ہر آدمی کی عمر بڑھ رہی ہے، وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کے ساتھ کے لوگ دنیا سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ پوری نسل ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک انفرادی قیامت ہے جو ایک انسان کی موت کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا قیامت کے وقوع کی نوعیت سمجھنے کے بعد ہم "قیامتِ کبریٰ" کی علامات کی طرف توجہ کریں گے جو کہ ہماری بحث کا مرکزی موضوع ہے۔

علاماتِ قیامت کی اقسام

اب تک جتنی روایات علاماتِ قیامت کے متعلق ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں کبھی "اشراط" کا لفظ آیا

ہے اور کبھی ''امارات'' کا لفظ آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس حوالے سے جو تفصیل ارشاد فرمائی ہے، اس کی بھی ایک تقسیم پائی جاتی ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ احادیثِ علاماتِ قیامت جو نبیٔ اکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں، ان میں مذکور علامات، قیامت سے پہلے واقع ہو کر رہیں گی۔ البتہ یہ علامات کئی قسموں پر مشتمل ہیں، حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ علاماتِ قیامت تین طرح کی ہیں: ایک تو وہ ہیں کہ جو آپ ﷺ نے فرمایا اور ظاہر ہو گئیں۔ آپ غور کریں حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ آٹھویں صدی ہجری کا حال بتا رہے ہیں کہ ان علامات میں سے کچھ تو پوری ہو گئیں۔ دوسری کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ ان کا وقوع شروع ہو چکا ہے، لیکن ان کی تکمیل نہیں ہوئی، وہ ابھی اپنی انتہا تک نہیں پہنچیں۔ جبکہ تیسری قسم کی علامات وہ ہیں جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئیں اور عن قریب وقوع پذیر ہو کر رہیں گی۔ ایک انسان کو کسی بھی چیز میں شبہہ ہو سکتا ہے لیکن ایک ایسی خبر جو نبیٔ اکرم ﷺ نے دی ہے اس پر شبہہ نہیں ہو سکتا۔ گویا انسان اپنی آنکھوں دیکھی چیز پر تو شک کر سکتا ہے، لیکن خبرِ صادق پر شبہے کا کوئی امکان نہیں اور اس کی تکذیب نہیں کی جا سکتی، بس شرط اتنی ہوتی ہے کہ وہ خبر مصدقہ ہو، یعنی اس کا نبی اکرم ﷺ کی طرف نسبت کا صحیح ثبوت ہو۔

اب ذرا مثالوں سے سمجھیے کہ پہلی قسم کی علامتیں جو پوری ہو چکی ہیں وہ کیا ہیں: مثلاً ایک علامت خود آپ ﷺ کی بعثت ہے، سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ وَقَرَنَ بَيْنَ السَّبَّابَةِ وَالوُسْطَى». (بخاری) ''میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، آپ ﷺ نے اپنی تشہد اور درمیانی انگلی کے ساتھ اشارہ فرمایا''۔ تو نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت بجائے خود قیامت کی ایک نشانی ہے، وہ پوری ہو گئی۔ پھر اسی طرح سے نبیٔ اکرم ﷺ کا وصال ہے، وہ بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی روایت نقل کرتے ہیں: «أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ وَهُوَ فِي قُبَّةٍ مِنْ أَدَمٍ، فَقَالَ: اعْدُدْ سِتًّا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ: مَوْتِي، ثُمَّ فَتْحُ بَيْتِ المَقْدِسِ، ثُمَّ مُوْتَانٌ يَأْخُذُ فِيكُمْ كَقُعَاصِ الغَنَمِ، ثُمَّ اسْتِفَاضَةُ المَالِ حَتَّى يُعْطَى الرَّجُلُ مِائَةَ دِينَارٍ فَيَظَلُّ سَاخِطًا، ثُمَّ فِتْنَةٌ لاَ يَبْقَى بَيْتٌ مِنَ العَرَبِ إِلَّا دَخَلَتْهُ، ثُمَّ هُدْنَةٌ تَكُونُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ

بَنِي الأَصْفَرِ، فَيَغْدِرُونَ فَيَأْتُونَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِينَ غَايَةً، تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اثْنَا عَشَرَ أَلْفًا». (بخاری)

"میں تبوک کی جنگ کے موقعے پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ ایک چمڑے کے خیمے میں تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: الساعۃ سے پہلے چھے چیزیں شمار کرلو! فرمایا: میری موت، بیت المقدس کی فتح، پھر ایک ایسی وبا جو تمھارا اس طرح صفایا کردے گی جیسے بکریاں وبا سے مرتی ہیں، پھر مال کی کثرت ہوگی، یہاں تک کہ ایک آدمی کو سو دینار دیے جائیں گے لیکن وہ راضی نہ ہوگا، پھر ایک ایسا فتنہ آئے گا جو عرب کے ہر گھر میں داخل ہوگا، پھر تمھارے اور بنی اصفر کے درمیان صلح ہوگی، لیکن وہ غدر کریں گے اور اسی جھنڈوں تلے وہ تم پر حملہ آور ہوں گے، ہر جھنڈے کے تحت بارہ ہزار سپاہی ہوں گے"۔ یہاں فقط ہمارا استدلال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے آنے سے پہلے پہلے چھے چیزیں ہوکر رہیں گی۔ ان میں سے پہلی چیز میری موت ہے، یعنی میرا دنیا سے اٹھ جانا ہے، تو یہ بھی ایک ایسی علامت ہے جو پوری ہو چکی، جسے حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ پہلی قسم میں بیان فرما رہے ہیں۔

اسی طرح یہاں جھوٹے مدعیانِ نبوت کا ظہور بھی اس کی مثال بن سکتا ہے، اسے پہلی قسم میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور دوسری قسم میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ مسلسل عمل ہے، یعنی یہ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے فوراً بعد ہی شروع ہوگیا اور ابھی تک متنبی پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: «لاتَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُبْعَثَ دَجَّالُونَ كَذَّابُونَ، قَرِيبًا مِنْ ثَلاثِينَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ رَسُولُ اللهِ». (بخاری) "قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تیس کے قریب جھوٹے دجال نکلیں گے ان میں سے ہر ایک گمان کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے"۔ یعنی قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ جھوٹے کذاب کی اٹھان ہوگی اور وہ قریب قریب تیس ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک کا یہ زعم ہوگا، یہ دعویٰ ہوگا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ اسی طرح روایت میں آتا ہے: «لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الحِجَازِ تُضِيءُ أَعْنَاقَ الإِبِلِ بِبُصْرَى». (بخاری) "قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ حجاز کی سرزمین سے آگ نکلے گی جس سے بصریٰ میں اونٹوں کی گردنیں روشن ہوجائیں گی"۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا ظہور ہوگیا ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے یہ پیش گوئی فرمائی کہ قیامت کے قریب مال کی کثرت ہو جائے گی۔ فتحِ مکہ کے بعد مال کی غیر معمولی کثرت ہوگئی، ایران کی فتح اور دیگر فتوحات کے نتیجے میں مال کی فراوانی ہوگئی۔ ان علامات کے بعد پھر بہت سی روایتیں ہیں، جن میں آپ ﷺ نے ایک گروہ کے اوصاف بیان فرمائے کہ ایسے لوگ آئیں گے کہ جن کی نمازوں اور روزوں کے سامنے اپنے لوگوں کو حقیر جانو گے اور وہ خوب قرآن پڑھیں گے، لیکن قرآن ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا۔ بہت بڑی تعداد میں علما و شارحین نے اس طرح کی کئی روایات کا انطباق خوارج پر کیا ہے۔ اسی طرح سے تاتار کا جو فتنہ ہے، اس میں ترکوں کا تذکرہ ہے۔ ان کے چہرے بشرے کا بھی تذکرہ ہے اور اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پیش گوئی پوری ہو چکی ہے۔

علاماتِ قیامت کی دوسری قسم وہ ہے، جس کے مبادی تو ظاہر ہو گئے، لیکن ابھی پوری طرح یہ علامات سامنے نہیں آئیں: جیسے جہالت ہے، بدکاری کا عام ہونا ہے، بیت المال کی لوٹ مار ہے۔ بہت سی احادیث جن میں اس طرح کی باتوں کا تذکرہ ہے، لیکن وہ ابھی پوری طرح عروج پر نہیں آئیں بلکہ جاری ہیں۔

علاماتِ قیامت کی تیسری قسم ان علامات کی ہے جو ابھی واقع بالکل نہیں ہوئی ہیں، لیکن وہ واقع ہو کر رہیں گی۔ ان علامات میں ظہورِ مہدی، خروجِ دجال اور نزولِ مسیح شامل ہیں، اسی طرح یاجوج ماجوج، اس کے بعد دابۃ الارض، سورج کا مغرب سے نکلنا اور زمین کا تین جگہ سے بڑا خسف ہونا ہے۔ اور پھر ایک آگ کا آنا، جو لوگوں کو گھیر کر ان کو محشر کی طرف لے کر جائے گی۔ یہ سارے واقعات وہ ہیں جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ بہت سی قیامت کی علامتیں ہیں، جن میں بعض چھوٹی علامتیں ہیں جنھیں علاماتِ صغریٰ کہا جاتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے اکثر گزر چکی ہیں یا گزر رہی ہیں۔ یہ وہی ہیں جو پہلی اور دوسری قسم میں بیان کی گئی ہیں، مگر جو بڑی علامات ہیں وہ ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوئیں، مستقبل میں آئیں گی۔ کچھ احادیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے ان سب کو جمع بھی فرما دیا ہے۔ حضرت ابو حذیفہ بن اَسید غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، درآں حالیکہ ہم آپس میں مذاکرہ کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا، تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا: ہم روزِ قیامت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت اُس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تم

یہ دس علامات نہ دیکھ لو۔ پھر آپ ﷺ نے یہ دس علامات بیان فرمائیں: «الدُّخَانَ، وَالدَّجَّالَ، وَالدَّابَّةَ، وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَنُزُولَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَيَأَجُوجَ وَمَأْجُوجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ: خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ، وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ، وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ، وَآخِرُ ذَلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ، تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ». (مسلم) ''دھواں، دجال، دابۃ الارض (جو نہایت عجیب و غریب جانور ہو گا)، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ ابنِ مریم کا نزول، یاجوج ماجوج اور تین جگہ زمین کا دھنسنا: مشرق میں زمین کا دھنسنا، مغرب میں زمین کا دھنسنا، جزیرۂ عرب میں زمین کا دھنسنا، ان سب کے آخر میں ایک آگ یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو ہانک کر ان کے محشر کی طرف لے جائے گی''۔ یہ جو بڑی بڑی علامات، بڑے واقعات ہیں، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ وہی علاماتِ کبریٰ ہیں، جنھوں نے بہر حال پورا ہونا ہے۔ احادیثِ فتن کے فہم کے اصول و ضوابط میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ علاماتِ قیامت میں کچھ جگہوں پر ترتیب بھی آپ ﷺ نے متعیّن فرمائی ہے، یعنی کچھ جگہوں میں ہمیں اندازہ نہیں ہوتا کہ واقعہ کب ہو گا، لیکن جب آپ ﷺ نے ایک ترتیب سے جو علامات بتائی ہیں وہاں تو ترتیب واضح ہے۔ یعنی کچھ چیزیں تو بالکل صاف ہیں، مثلاً آپ سمجھ لیجیے کہ مہدی اور دجال ایک طرح سے ہم عصر ہیں۔ اور پھر جب دجال کے ساتھ مہدی کا معرکہ برپا ہو گا تو اسی دوران نزولِ مسیح ہے اور نزولِ مسیح کے بعد دجال کا بھی خاتمہ ہے۔ اس طرح ایک طرف سے یہود و نصاریٰ کے معاملات بھی درست ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر یاجوج ماجوج ہیں اور پھر اس کے بعد آگے دابۃ الارض ہے۔ یہ ترتیب بھی اہم ہے اور کچھ احادیث جن میں وہ ترتیب بھی نبی اکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہے تو اسے اسی طرح رکھنا چاہیے۔ چونکہ یہ بھی ایک ضابطہ ہے کہ جو باتیں پہلے متعیّن ہیں، کہ پہلے یہ ہو گا، پھر یہ ہو گا، پھر وہ ہو گا تو اس کو بھی اسی طرح سے ہمیں ماننا ہے اور اس ترتیب کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا ہے۔

علاماتِ قیامت میں تکوین و تشریع کا فلسفہ اور مثالیں

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ان احادیث میں جو اشراط الساعۃ کے متعلق ہیں تکوین و تشریع دونوں

امور ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہاں تکوین کا بیان بھی ہے کہ دیکھو یہ ہونے جارہا ہے، ایسے ہوگا اور ساتھ تشریع کا بیان بھی ہے۔ کچھ لوگ ان دونوں کو بسا اوقات گڈمڈ کردیتے ہیں، سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی تفصیل پہلے آچکی ہے، لیکن کچھ عملی مثالوں سے اس کو مزید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت برسوں پہلے میں ایک کمپیوٹر سائنس کے بڑے ادارے میں پڑھارہا تھا، تو وہاں پر فیکلٹی روم میں بیٹھے ہوئے معاشیات کے ایک سینئر پروفیسر سے گفتگو شروع ہوگئی۔ وہ کہنے لگے، حدیثیں پتا نہیں کہاں سے اُگی ہیں، حدیثیں لوگوں نے خود بنالی ہیں، ایسی حدیثیں جو قرآنِ مجید سے بھی ٹکراتی ہیں۔ دیکھیں کہ قرآنِ مجید نے تو کہا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلاَ تَفَرَّقُواْ﴾ "تم سب لوگ مل جل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑنا"۔ جبکہ حدیث میں ہے کہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ فرقہ واریت کی دعوت دیں۔ تو اب آپ ان کی عقل پر ماتم کریں، ان صاحب کی سمجھ یہ ہے کہ گویا اللہ کے نبی ﷺ ایک حکم دے رہے۔ یہ صاحب بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح تکوین وتشریع کو گڈمڈ کررہے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ ہونے جارہا ہے، یہ تقدیر ہے، تکوین ہے اور ایک یہ ہے کہ تمھیں کیا کرنا ہے، تو اس کو ذرا الگ الگ سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ اس معاملے میں آیتِ مبارکہ کی رو سے اللہ کا حکم اور تشریع یہ ہے کہ آپس میں اتحاد واتفاق سے رہو اور تفرقے سے بچو اور جو بات آپ ﷺ فرمارہے ہیں کہ امت اتنے اتنے فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ رسول اللہ ﷺ اس کا حکم دے رہے ہیں، بلکہ محض خبر دے رہے ہیں کہ باوجود اتحاد واتفاق کے احکام کے، امت ان احکام کی مخالفت کرتے ہوئے فرقوں میں بٹ جائے۔ تو اتحادِ امت ایک حکمِ شریعت ہے، ایک تشریع ہے، جبکہ افتراقِ امت ایک تکوین اور اس کی خبر ہے۔

یہ حدیث جو تہتر فرقوں کے موجود ہونے کی خبر دے رہی ہے، اس کے کئی طرق ہیں، جو سب سے معروف ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ان میں ایک جماعت ہے جو نجات پائے گی۔ اب اس کا وصف کیا ہے؟ یعنی وہ کون سی جماعت ہے جو نجات یافتہ ہے، تو اس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: «ما أنا عليه اليوم وأصحابي». (ترمذی) "آج، جس راستے پر میں اور میرے صحابہ ہیں"۔ تو گویا آپ ﷺ نے

علامت بھی بتادی، کہ کوئی آدمی اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ طائفۂ منصورہ، نجات یافتہ گروہ میں شامل ہو، تو وہ میرے اور میرے صحابہ کی پیروی کرے۔ اس سے بخوبی واضح ہوا کہ اس حدیث اور قرآن کی آیت میں کوئی تضاد نہیں ہے، جبکہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہلوانے والے لوگ بھی کس طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور لوگوں میں دینی سمجھ کا کتنا فقدان ہے۔ اب ہماری تاریخ سے ایک مثال سمجھ لیجیے کہ جب برصغیر کی تقسیم ہونے جارہی تھی تو برصغیر کے مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ اسی طرح علما میں بھی تقسیم ہو گئی تھی، ان میں ایک بڑا طبقہ تھا جو متفقہ ہندوستان کی بات کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ انگریز کو یہاں سے نکال کر معاملات ہم آپس میں خود طے کریں گے۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فارمولا تھا کہ خاص طرح کا ریاستی اتحاد ہو جائے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کو حکومت دے دی جائے، جہاں ہندو کی ہے وہاں ان کو دی جائے۔ ایک دوسرا گروہ تھا کہ جس کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کے قیام کی ضرورت ہے، ہمیں اس کے لیے جد وجہد کرنی ہے۔ یہ علما اہل اللہ تھے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بہت سی چیزیں سمجھا بھی دیتے ہیں، تو وہ لوگ جو متحدہ ہندوستان کے قائل تھے اور (سیاسی طور پر) کانگریس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اب تو لگ رہا ہے کہ مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور معاملات آگے چل رہے ہیں، لگتا ہے کہ تقسیم کے مخالف ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہیں۔ تو ان مخالف حضرات نے کہا کہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا ہے، کشف کے ذریعے ہم پر بھی یہ بات منکشف ہو گئی ہے اور اب تقدیر یہی ہے کہ پاکستان بننے جارہا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب آپ کو لگتا ہے کہ خارج کے حالات میں بھی ایسا ہے، انگریز بھی یہی چاہتا ہے کہ پاکستان بنے اور وہ غیر منقسم ہندوستان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ اسی طرح آپ حضرات بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ کو گویا تکوینی معاملات میں اللہ تعالیٰ نے سمجھا دیا ہے، تو پھر آپ کیوں متحدہ ہندوستان کی بات کیوں کر رہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہی بنتا ہے کہ ہم تو وہی کام کرنے کے مکلف ہیں، جو قرآن وحدیث میں آیا ہے، جبکہ خارج کے واقعات کے حوالے سے سارا اجتہاد ہے۔ تو اس موقعے پر ہم اس کے مکلف ہیں، جو دلیل پر مبنی ہو، اب چاہے ہمیں پتا لگ رہا ہو کہ بات نہیں چلنے والی، لیکن اس کے باوجود بھی ہم مکلف اسی کے ہیں۔

اس کی ایک مثال دجال کا معاملہ بھی ہے۔ دجال کا ذکر جن احادیث میں آیا ہے اگر آپ ان کا مطالعہ

کریں تو نبی ﷺ نے بہت تفصیل سے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے لے کر دنیا کے خاتمے تک کوئی فتنہ، دجال کے فتنے سے بڑا نہیں ہے۔ فرمایا کہ ہر نبی نے اپنی امت کو مسیح الدجال کے فتنے سے باخبر کیا ہے اور میں تمھیں کچھ ایسی باتیں دجال کے بارے میں بتاتا ہوں کہ جو کسی نبی نے اپنی امت کو نہیں بتائیں۔ پھر آپ ﷺ نے تفصیل بیان کی، کہ ایسا ہوگا، پھر ایسا ہوگا، یعنی یہ ایک واقعہ ہے اور اس کی علامات بتا رہے ہیں، یہ وہی تکوین کا بیان کر رہے ہیں لیکن اس میں ساتھ ساتھ تشریع بھی بیان ہو رہی ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے پناہ مانگنا اور اس سے دور رہنا، اسی طرح سورۃ الکہف کی ابتدائی یا ایک روایت کے مطابق اختتامی آیات پڑھنا تو اس فتنے سے بچ جاؤ گے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ دجال کے پاس ایک آگ ہوگی، ایک اس کا باغ ہوگا اور نہر ہوگی۔ اصل میں اس کا باغ، جہنم ہے اور جہنم اصل میں جنت ہے۔ جب تم میں سے کوئی شخص اس کا دور پائے تو اس کی جہنم کو اختیار کرے کہ وہ اصل میں حقیقتاً یا انجامِ کار کے طور پر جنت ہے۔ اسی طریقے سے جب آپ ﷺ نے بتایا کہ وہ اتنی مدت تک رہے گا۔ چنانچہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایسے حالات میں ایک دن اس طرح کا ہوگا، ایک دن اُس طرح کا ہوگا، تو ہم نماز کیسے ادا کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے اس کی بھی رہنمائی بھی فرمائی۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محض یہ نہیں بتایا کہ یہ ہونے جا رہا ہے، بلکہ آپ ﷺ نے یہ بھی بتایا ہے کہ تمھیں کرنا کیا ہے۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهَا سَتكُونُ فِتَنٌ أَلَا ثُمَّ تَكُونُ فِتنٌ أَلا ثمَّ تكونُ فتنةٌ القاعدُ خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِي فِيهَا وَالْمَاشِي فِيهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِي إِلَيْهَا أَلَا فَإِذَا وَقَعَتْ فَمَنْ كَانَ لَهُ إِبِلٌ فَلْيَلْحَقْ بِإِبِلِهِ وَمَنْ كَانَ لَهُ غَنَمٌ فَلْيَلْحَقْ بِغَنَمِهِ وَمن كَانَت لَهُ أَرضٌ فَلْيَلْحَقْ بِأَرْضِهِ». (مشکاۃ المصابیح) ”عن قریب فتنے ہوں گے، خبردار! پھر فتنے ہوں گے، خبردار! پھر وہ فتنے ہوں گے کہ ان میں بیٹھا ہوا چلتے ہوئے سے بہتر ہوگا اور چلتا ہوا دوڑتے ہوئے سے بہتر ہوگا۔ آگاہ رہو کہ جب وہ فتنے واقع ہوں، تو جس کے اونٹ ہوں وہ اونٹوں سے مل جائے اور جس کی بکریاں ہوں وہ اپنی

بکریوں کو لے کر چلا جائے اور جس کی زمین ہو وہ اپنی زمین میں پہنچ جائے"۔ اسی طرح مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک صاحب بولے، یا رسول اللہ! جس کے پاس نہ اونٹ ہوں نہ بکریاں نہ زمین۔ فرمایا: وہ اپنی تلوار کی طرف رخ کرے اور اس کی دھار کو پتھر سے کوٹ دے، پھر الگ ہونے کی طاقت رکھے، اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا، اس طرح تین بار فرمایا۔ پھر ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے مجبور کیا جائے حتیٰ کہ مجھے دونوں صفوں میں سے ایک صف تک لے جایا جائے، پھر مجھے کوئی اپنی تلوار سے مار دے یا آئے کہ مجھے قتل کر دے۔ فرمایا: وہ اپنا اور تمھارا گناہ لے کر لوٹے گا اور وہ دوزخی ہو گا۔ اس روایت میں اللہ کے نبی ﷺ نے صرف یہی نہیں فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ کہ عن قریب فتنے ہوں گے، بلکہ آپ ﷺ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ان حالات میں تمھیں کیا کرنا ہے۔ تو اس موقعے کی نسبت سے آپ ﷺ ایک پیش گوئی بھی فرما رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہدایت بھی دے رہے ہیں کہ ان حالات میں کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔

ایک اور معروف روایت ہے، سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كَيْفَ بِكُمْ وَبِزَمَانٍ» أَوْ «يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ زَمَانٌ يُغَرْبَلُ النَّاسُ فِيهِ غَرْبَلَةً، تَبْقَى حُثَالَةٌ مِنَ النَّاسِ، قَدْ مَرِجَتْ عُهُودُهُمْ وَأَمَانَاتُهُمْ، وَاخْتَلَفُوا، فَكَانُوا هَكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ». فقالوا: وكيف بنا يا رسول الله؟ قال: «تَأْخُذُونَ مَا تَعْرِفُونَ وَتَذَرُونَ مَا تُنْكِرُونَ وَتُقْبِلُونَ عَلَى أَمْرِ خَاصَّتِكُمْ وَتَذَرُونَ أَمْرَ عَامَّتِكُمْ». (ابوداود)

"تمھارا اس زمانے میں کیا حال ہو گا؟ یا آپ نے یوں فرمایا: عن قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جس میں لوگ بالکل چھلنی میں سے چھن کر نکل آئیں گے، اچھے لوگ سب مر جائیں گے، اور برے لوگ باقی رہ جائیں گے، ان کے عہد و پیمان اور ان کی امانتوں کا معاملہ بگڑ چکا ہو گا، یعنی لوگ بد عہدی کریں گے اور امانتوں کو پامال کیا جائے گا۔ آپس میں اختلاف کریں گے اور اس طرح ہو جائیں گے آپ ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر بتایا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اس وقت ہم کیا کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: معروف کو اختیار کرنا اور نکارت آمیز چیزوں کو

ترک کر دینا اور خاص اپنے آپ کی فکر کرنا اور امرِ عام کو چھوڑ دینا"۔ آپ ﷺ یہاں ایک واقعہ بیان کر رہے ہیں اور صورتِ حال کیا ہو جائے گی کہ ان کے عہد اور ان کی امانتیں بالکل فاسد ہو جائیں گی۔ ان میں آپس میں اختلاف ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ملا کر فرمایا کہ معاملہ مشتبہ ہو جائے گا، لوگ ایک دوسرے سے بھڑ جائیں گے۔ پھر آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ پھر ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ لہذا یہاں پھر وہی بات آجاتی ہے، جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ ہونے جا رہا ہے، ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے اور انسانوں کا اصل جوہر نکال لیا جائے گا اور پیچھے پھر چھاچھ یا جھاگ رہ جائے گی۔ تو سوال کیا گیا کہ ایسا وقت ہمیں مل جائے تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تشریح میں آپ ﷺ ہدایت فرما رہے ہیں کہ جو تمھاری جان پہچان کی چیزیں معروف و متعیّن ہیں ان کو لے لینا اور جو چیزیں تمھارے اندر اجنبیت پیدا کر رہی ہیں ان کو چھوڑ دینا، یعنی معروفات کو اختیار کرنا اور منکرات کو چھوڑ دینا۔

* * * *

احادیثِ فتن اور معاصر عرب مفکرین

معاصر مفکرین کی تشریحات، تاویلات اور مغالطے

دین کی ترجمانی کی اہلیت کا کیا مدار ہے اور کسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دین کے متعلق کلام کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ہر کسی کا میدان نہیں، لہذا جس کسی نے اس میدان میں مہارت حاصل نہیں کی اسے ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ اس میں اپنی رائے کو دخل دے، یہ معاملہ دنیا کی ہر فیلڈ کا ہے۔ دین میں خصوصی طور پر اس ممانعت کی وجہ ہی یہ ہے کہ پھر دین کی اصل شکل بدل جائے گی اور ایک بدعت سامنے آئے گی۔ اسی بحث کے ساتھ چونکہ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ قرآنِ کریم ہو یا حدیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے متون، یہ اسالیبِ عرب اور خاص طور پر قریش کی لغت میں ہیں، تو اس لیے یہاں عربی محاورہ اور خاص طور پر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے کا محاورہ سمجھنا ضروری ہے، تاکہ قرآن ہو یا حدیث اس کے اصل مقصد کی تفہیم میں آسانی رہے۔ اسی طرح بعض اوقات متن کو سمجھنے کے لیے اسی زمانے میں پیش آئے ہوئے واقعے سے واقفیت بھی ضروری قرار پاتی ہے۔ لہذا متون کی تفہیم کے لیے صرف یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا، اور اس خصوصی طریقے کے بجائے جو بھی راستہ اختیار کیا جائے گا، وہ گمراہی کے دروازے کھول دے گا۔

علمِ تفسیر اور معاصر مفکرین

علمِ تفسیر پر ہمارے اکابرین نے غیر معمولی محنت کی ہے اور ان کا یہ مایۂ ناز کام اصولِ فقہ کا ایک بڑا حصہ بنا ہے اور یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ جدید دور میں اس کے لیے Hermeneutics کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور متعدّد جدید مفکرین، جیسے Wilhelm Dilthey، Hans Georg Gadamer اور دیگر نے اس شعبے میں بہت کام کیا ہے۔ یہ علم پروٹسٹنٹ ازم کے عروج اور مارٹن لوتھر اور Kelvin

کے بعد آہستہ آہستہ سامنے آیا جب بائبل کو عام آدمی کی رسائی میں دے دیا گیا اور کہا گیا کہ: Every Christian can be a Saint ''ہر عیسائی پادری بن سکتا ہے''، اور Back to the Scriptur ''ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا مذہبی متن پڑھے اور سمجھے''۔ مزید یہ کہ درمیانی وسائط اور وسائل کا خاتمہ کیا جائے، لہٰذا سب سے پہلے بائبل پر اس کا اطلاق کیا گیا اور اس کے بعد اب عمومی کسی بھی متن کو پڑھنے کے طریقے پر بحث ہوتی ہے۔ بہر حال، یہ علم ہمارے اصولِ فقہ کا ایک اہم حصہ ہے، یہاں ہم علمِ تفسیر کے اصولوں کی روشنی میں بعض معاصر مفکرین کے کام کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

علاماتِ قیامت کی پیش گوئیوں پر مبنی احادیث کا حالاتِ حاضرہ پر کیسے انطباق کیا جاتا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ہم بعض معاصر مفکرین کے خیالات و توجیہات کا مطالعہ کریں گے۔ جدید دور میں مختلف حضرات نے ان احادیث کے حوالے سے مختلف تطبیقات کی ہیں۔ اس مبحث میں نمونے کے طور پر چند لوگوں کا اجمالی تذکرہ اور ان کے کام کا مختصر سا تعارف پیشِ خدمت ہے، جس سے اندازہ ہو گا کہ ان پیش گوئی والی احادیث کو کس کس طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ہم مختصراً سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ یہ جو انطباقات کیے گئے ہیں ان میں کیا مسئلے پیدا ہوئے اور پھر اس کے نتائج کیا نکلے اور ہمارے پاس کیا اصول و ضوابط ہیں، جن کو اگر ہم سامنے رکھیں تو ان پیش گوئیوں والی روایات کے بارے میں ہم فی الجملہ ایک محفوظ راہ اختیار کرنے کے قابل ہو سکیں اور اس میں کسی بڑی غلطی سے بچ سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے سعودی عرب کے دو معاصر مصنفین جنھوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے، ان کے کام کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلے عالم شیخ ابو بکر بن جابر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جبکہ دوسرے ڈاکٹر سفر الحوالی ہیں، جو بڑے صاحبِ عزیمت اور ہر اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ عالمِ دین ہیں۔ وہ ان موضوعات پر کم از کم چالیس سال سے غور کر رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔

شیخ ابو بکر بن جابر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ

شیخ ابو بکر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ کا بنیادی طور پر تعلق الجزائر سے تھا اور انھوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر کالج

اور یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں وہ سعودی عرب آگئے اور سعودی عرب میں یہاں پر انھوں نے کلیۃ الشریعہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد تقریبًا چھبیس سال مدینہ منورہ میں الجامعۃ الاسلامیہ میں تدریس کرتے رہے اور لگ بھگ پچاس برس انھوں نے مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں درس دیا۔ شیخ کا انتقال ۲۰۱۸ء میں ہوا۔ مجھے بھی الحمد اللہ بار ہا حرمین جانے کا اتفاق ہوا ہے اور جب بھی وہاں حاضری ہوئی ہے تو بڑے علما کے دروس میں بیٹھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ شیخ ابو بکر الجزائری رحمۃ اللہ علیہ کے دروس میں بھی شرکت رہی۔ وہ بہت ہی خوبصورت، چھوٹے قد کے آدمی تھے اور گفتگو میں بالکل بے تکلفی اور سادگی ہوتی تھی۔ ان کا چہرہ بشرہ دیکھ کر مجھے اپنے مرحوم نانا مولوی ایوب صاحب یاد آجاتے تھے کہ ان سے بھی ان کی ایک مشابہت تھی۔ بہت معروف واعظ تھے۔ ان کی کچھ کتابیں بھی کافی معروف ہوئیں، مثلاً: ''منہاج المسلم'' کے نام سے ان کی ایک کتاب ہے جو دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے اور بہت بڑی تعداد میں پھیلی ہے۔ اسی طرح نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ''هذَا الْحَبِيْبُ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے ان کی ایک تصنیف ہے، جو انھوں نے بہت محبت سے لکھی ہے، یہ بھی بہت عام ہوئی ہے اور بہت پھیلی ہے۔ لہٰذا شیخ کی بہت سی کتابیں ہیں اور اس کے علاوہ ان کے رسائل بھی بہت زیادہ ہیں، جو زیادہ تر دعوتی اور نصیحت پر مبنی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے دو مختصر رسالے ہمارے موضوع کے حوالے سے بھی ہیں۔ ان کے رسائل کے مجموعے کی کئی جلدیں ہیں اور تیسری جلد میں یہ دو رسالے بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے کی تیسری جلد ۱۹۹۱ء میں پہلی مرتبہ چھپی، اس میں مذکورہ دو رسائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک رسالے کا نام ''اللقطات في بعض ما ظهر للساعة من علامات'' ہے اور دوسرے کا نام ''الأحاديث النبوية الشريفة في أعاجيب المخترعات الحديث'' ہے۔ پہلی کتاب میں شیخ نے اس زمانے تک جو جدید ایجادات ہوئی تھیں، خاص طور پر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے جو کچھ مظاہر سامنے آئے تھے، ان کے حوالے سے کچھ چیزوں کو جمع کیا اور اس پر گفتگو کی۔

قیامت کے متعلق پیش گوئیوں کی تطبیق اور شیخ کا نقطۂ نظر

شیخ اپنی کتاب ”اللقطات في بعض ما ظهر للساعة من علامات“ کے شروع میں کہتے ہیں کہ اس جدید دور میں بالخصوص چودھویں صدی کے آغاز سے عجیب و غریب ایجادات اور مخترعات ہو رہی ہیں، ان کے متعلق اہلِ ایمان کو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کو ان جدید ایجادات کا علم تھا، کیا اللہ کے نبی ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس بارے میں خبر دی تھی؟ اور کیا اصحابِ رسول ﷺ کو پیغمبر ﷺ نے جو باتیں بتائی تھیں، ان کا آپس میں تذکرہ کرتے تھے اور وہ کیسے ان کو سمجھتے ہوں گے اور اِن کے متعلق اُن کا کیا تصور ہو گا؟ اس کے متعلق شیخ لکھتے ہیں کہ اُسی زمانے کے لوگوں کے لیے وہ باتیں جو رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں، وہ ماورائے عقل تھیں۔ پھر انھوں نے ایک مشہور حدیث کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی، نماز کے بعد آپ ﷺ منبر پر تشریف لائے اور ہمیں خطبہ دیا یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا۔ ظہر کی نماز کے لیے آپ اترے اور ظہر پڑھائی، پھر آپ ﷺ دوبارہ منبر پر تشریف فرما ہو گئے اور خطبہ ارشاد فرمایا یہاں تک کہ عصر کا وقت آگیا۔ عصر کی نماز کے لیے آپ ﷺ اترے، عصر پڑھائی، عصر کے بعد پھر آپ ﷺ منبر پر چڑھ گئے اور مزید خطبہ دیا، یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ تو وہ صحابی کہتے ہیں: فأخبرنا بما كان وبما هو كائن. تو نبی ﷺ نے ہمیں بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو پہلے ہو چکی ہیں اور بہت سی ایسی باتیں بتائیں، جو ہونے والی ہیں، یعنی بہت سی ماضی کی باتیں بھی ہمیں ارشاد فرمائیں اور بہت سی مستقبل کے بارے میں بھی باتیں ارشاد فرمائیں۔ اس موقعے پر راوی کہتے ہیں: فَأَعْلَمُنَا أَحْفَظُنَا. ہم میں سے ان باتوں کا زیادہ بڑا عالم وہ ہے، جس نے ان باتوں کو زیادہ محفوظ رکھا۔

ایک اور روایت ہے، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: لَقَدْ خَطَبَنَا النَّبِيُّ ﷺ خُطْبَةً، مَا تَرَكَ فِيهَا شَيْئًا إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا ذَكَرَهُ، عَلِمَهُ مَنْ عَلِمَهُ وَجَهِلَهُ مَنْ جَهِلَهُ، إِنْ كُنْتُ لَأَرَى الشَّيْءَ قَدْ نَسِيتُ، فَأَعْرِفُ مَا يَعْرِفُ الرَّجُلُ إِذَا غَابَ عَنْهُ فَرَآهُ فَعَرَفَهُ. (بخاری) ”آپ ﷺ نے ہمیں یہ خطبہ ارشاد

فرمایا اور کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی قیامت کے قائم ہونے تک مگر اس کا تذکرہ کیا جس نے ان کو یاد رکھا اس نے جان لیا اور جو ان کو بھول گیا وہ بھول گیا۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو میں بھول چکا ہوتا ہوں، مگر جب وہ وقوع پذیر ہوجاتی ہیں، میں اس کو دیکھتا ہوں تو مجھے یاد آجاتی ہے کہ اچھا یہ بات تو وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اس دن ارشاد فرمائی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے انسان نے کسی شخص کا چہرہ بہت مدت سے نہ دیکھا ہو، تو وہ بھول جاتا ہے اور جب اس کو دیکھتا ہے تو اسے پہچان لیتا ہے"۔ کبھی شکل بھی ذہن سے اتر جاتی ہے، پھر آدمی دیکھتا ہے تو اسے یاد آجاتا ہے۔ یہاں پر بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، تو کچھ یاد رہ گئیں اور کچھ بھول گئیں۔ لیکن جب وہ واقعہ ہمارے سامنے آتا تھا، تو پھر ہمیں یاد آتا تھا کہ یہ تو وہی بات ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی تھی۔

چنانچہ شیخ الجزائری نے اپنے رسالے کے آغاز میں بیان کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جو اشراط الساعۃ بیان فرمائی ہیں، وہ دو طرح کی ہیں: ایک نوع تو وہ ہے جس میں فتن ہیں، جس پر ہم ابھی گفتگو کر چکے ہیں۔ دوسری وہ نوع ہے جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے بہت سے عجائب اور نشانیوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ شیخ کہتے ہیں کہ جو جدید آلات اور جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے باتیں ارشاد فرمائی ہیں، یہ نوع انھی کے متعلق ہے۔ یہاں انھوں نے جدید ایجادات کا جائزہ لیا ہے اور ہم بھی انھی کا کچھ تذکرہ کریں گے۔

جدید ایجادات اور نبوی پیش گوئیاں

پہلی چیز جو انھوں نے بیان کی ہے وہ گاڑیوں کے حوالے سے ہے۔ قرآنِ مجید میں آتا ہے:
﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً، وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُونَ﴾ (النحل:۸) "اور گھوڑے، خچر اور گدھے اسی نے پیدا کیے ہیں تاکہ تم ان پر سواری کرو، اور وہ زینت کا سامان بنیں۔ اور وہ بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمھیں علم بھی نہیں ہے۔"۔ یہاں شیخ اس آیت کے حوالے سے تذکرہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے بہت سی اُس زمانے کی جو سواریاں تھیں ان کا تذکرہ کر دیا اور پھر کہا کہ بہت سی اللہ تعالیٰ تمھارے لیے ایسی سواریاں میسر کر دے گا جو ابھی تم نہیں جانتے۔ آگے اس کے متعلق ایک

حدیث لے کر آئے ہیں: «سَيَكُونُ فِي آخِرِ أُمَّتِي رِجَالٌ يَرْكَبُونَ عَلَى سُرُوجٍ كَأَشْبَاهِ الرِّحَالِ يَنْزِلُونَ عَلَى أَبْوَابِ الْمَسَاجِدِ». (ابنِ حبان) یہ حدیث آگے تفصیل سے آرہی ہے، لیکن جو مستدل ہے وہ بس اس روایت کے اتنے حصے سے ہی ہے کہ عن قریب میری امت کے آخری حصے میں ایسے لوگ ہوں گے جو سوار ہوں گے کاٹھیوں پر، یعنی جو گھوڑوں پر زین ڈالی جاتی ہے اور وہ ایسی ہوں گی جیسے رحال، خیمے یا جیسے بڑے بڑے کجاوے ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے جیسے گھر ہوتے ہیں، یعنی گھروں کی طرح کی بڑی سواریاں ہوں گی اور وہ مسجدوں کے دروازوں پر ان کے ذریعے اترا کریں گے۔ چنانچہ یہاں انھوں نے گفتگو کی ہے کہ وہ وقت آگیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مسجد قریب بھی ہوتی ہے، لیکن پھر بھی لوگ سواریوں پر آتے ہیں۔ پھر یہاں جو باتیں ان حضرات کے سامنے بیان کی جاری ہیں، یہ اُس وقت لوگوں کے لیے قابلِ ادراک نہیں تھیں۔ اسی طرح یہ بات کہ ایسی سواریاں ہوں گی، جیسے گھر ہوتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ یہ جو گاڑیاں ہم استعمال کرتے ہیں یہ گاڑیاں بھی ایسی ہیں، مگر جب یہ بات بیان کی جارہی تھی تو کوئی اس کا اس کا ادراک نہیں کر سکتا تھا۔

شیخ نے گاڑی کی مثال کے بعد پھر ریڈیو کی مثال دی ہے۔ ریڈیو کے بارے میں وہ ایک روایت جو حدیثِ قدسی ہے، نقل کرتے ہیں: أَنَّ اللهَ قَالَ: أَبُثُّ الْعِلْمَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ حَتَّى يَعْلَمَهُ الرَّجُلُ وَالْمَرْأَةُ، وَالْعَبْدُ وَالْحُرُّ، وَالصَّغِيرُ وَالْكَبِيرُ. (دارمی) "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں علم کو آخری زمانے میں بہت عام کردوں گا، یہاں تک کہ اس کو جان لے گا مرد بھی، عورت بھی، غلام بھی، آزاد بھی، چھوٹا بھی، بڑا بھی"۔ مذکورہ حدیث سے وہ یہ استدلال کررہے ہیں کہ یہ جو فرمایا ہے کہ أبث العلم کہ علم کو پھیلا دوں گا، اس وقت ریڈیو جسے عربی میں "اذاع" کہا جاتا ہے اس کے ذریعے چیزیں پھیلتی تھیں، شیخ اس سے استدلال کررہے ہیں کہ دیکھیے یہ کہا جارہا ہے کہ علم کا اتنا شیوع ہوجائے گا، اتنا پھیل جائے گا۔ شاید شیخ کے زمانے میں ابھی شاید ٹی وی اتنا عام نہیں ہوا ہوگا، آج کے دن تک تو بات بہت آگے نکل چکی ہے۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن آگیا، ٹیلی ویژن ایک آلے کے طور پر ایک عرصے تک بہت اہم رہا۔ لیکن اب وہ بھی اہم نہیں رہا بلکہ اب تو وائی فائی اور انٹرنیٹ ہے، اسکرین اور

اسمارٹ فون کا دور دورہ ہے، جو یہ تمام چیزیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ شیخ کے زمانے میں ان جدید آلات کی جگہ ٹیلی گرام کا رواج تھا، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے درج ذیل روایت سے استدلال کیا ہے: «إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَفْشُوَ الْمَالُ وَيَكْثُرَ، وَتَفْشُوَ التِّجَارَةُ، وَيَظْهَرَ الْعِلْمُ، وَيَبِيعَ الرَّجُلُ الْبَيْعَ فَيَقُولَ: لَا حَتَّى أَسْتَأْمِرَ تَاجِرَ بَنِي فُلَانٍ، وَيُلْتَمَسَ فِي الْحَيِّ الْعَظِيمِ الْكَاتِبُ فَلَا يُوجَدُ». (نسائی) "یہ بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ مال و دولت پھیل جائے گا اور بہت زیادہ ہو جائے گا اور تجارت بھی پھیل جائے گی۔ علم بھی بہت بڑھ جائے گا۔ اور ایک شخص تجارت کرے گا کسی کے ساتھ یا کسی کے ساتھ ڈیلنگ کرنے لگے گا تو وہ جس سے ڈیل کرے گا وہ کہے گا کہ نہیں میں اب اس ڈیل کو فائنل نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں فلاں گھرانے کا جو تاجر ہے اس سے مشورہ نہ کرلوں۔ اس کے بعد پھر ایک بڑے محلے میں کاتب کو ڈھونڈا جائے گا جو وہ معاہدہ لکھنے والا ہوتا ہے، لیکن وہ پایا نہیں جائے گا"۔ یہاں محلِ استدلال اسْتَأْمِرَ کا لفظ آیا ہے کہ وہ بیع منعقد کرنے کے لیے فلاں تاجر سے مشورہ کریں گے، تو شیخ کہتے ہیں کہ اب یہ مشورہ کیسے ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے زمانے میں ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ انسان مختلف لوگوں سے مشورہ کرے، لیکن بعد کے زمانے میں اب جو ٹیلی گرام آگیا ہے اور فیکس آگیا ہے تو اس کے ذریعے لوگوں سے مشورہ ہو سکے گا اور دور دراز کے لوگوں سے آپ کنسلٹ کر سکیں گے۔ پھر اس کے بعد شیخ ایک اور حدیث جس میں تقاربِ زمان کا تذکرہ ہے استدلال کرتے ہیں۔ نبی اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ زمانہ بہت قریب ہو جائے گا۔ اس کے کئی مطلب لیے گئے ہیں: ایک مطلب یہ ہے کہ وقت بہت تیز ہو جائے گا وقت کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔ وہاں اس مقام پر وہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی الجامع الصغیر کی ایک روایت نقل کرتے ہیں: «مِنِ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ انْتِفَاجُ الْأَهِلَّةِ» اس روایت میں انتفاج کا ترجمہ انھوں نے فجاءة سے کیا ہے۔ عربی کا ایک محاورہ ہے انتفاج الأرنب کہ خرگوش کا ایک دم بھگدڑ میں پڑ جانا یعنی بالکل بگٹٹ ہو کر بھاگنے لگنا۔ تو اس سے وہ یہ نتیجہ نکال رہے ہیں کہ یہ جو چاند ہے یہ بگٹٹ ہو جائے گا، یعنی اس کی رفتار بہت بڑھ جائے گی۔ لگتا ہے کہ یہاں پر شیخ سے کچھ سہو ہوا ہے۔ بہت سی کتابوں میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: «مِنَ اقْتِرَابِ السَّاعَةِ انْتِفَاخُ الْأَهِلَّةِ». (مصنف ابن ابی شیبہ) یہاں "انتفاج" نہیں

ہے بلکہ ”انتفاخ“ ہے اور انتفاخ کا مطلب ہوتا ہے پھولنا، تو اس کا ترجمہ یہ کیا جائے گا کہ قیامت کے قریب چاند پھولا ہوا نکلے گا۔ یوں لگے گا جیسے اس پر کوئی ورم سا آیا ہوا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ: حتی یری الھلال، جب پہلے دن کے چاند کو دیکھا جائے گا، تو لوگ کہیں گے: ھو للیلتین، یہ چاند پہلی تاریخ کا نہیں بلکہ یہ دوسری کا چاند ہے۔ اس حدیث کو بھی شیخ نے قریب قریب اسی معنیٰ میں لے کر اس سے استدلال کیا ہے اور وہاں انتفاخ کی جگہ انتفاج شاید غلطی سے انھوں نے لے لیا ہے۔

شیخ الجزائری رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد پھر ٹیپ ریکارڈر کی مثال لے کر آئے ہیں، کیونکہ یہ اس زمانے کی ایجاد تھی۔ اس کے متعلق شیخ ایک معروف حدیث لے کر آئے ہیں: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تُكَلِّمَ السِّبَاعُ الإِنْسَ، وَحَتَّى تُكَلِّمَ الرَّجُلَ عَذَبَةُ سَوْطِهِ وَشِرَاكُ نَعْلِهِ وَتُخْبِرَهُ فَخِذُهُ بِمَا أَحْدَثَ أَهْلُهُ مِنْ بَعْدِهِ». (ترمذی) ”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ درندے، انسانوں سے کلام کرنے لگیں گے، آدمی سے اس کا کوڑا اور اس کے جوتے کا تسمہ کلام کرنے لگے گا۔ آدمی کی ران اس کو خبر دے گی کہ اس کے بعد اس کے گھر والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوا“۔ یہاں جو بات کی جا رہی ہے کہ کوڑا کلام کرے گا اور انسان کے جوتے کا تسمہ کلام کرے گا، تو اس سے وہ استدلال کر رہے ہیں کہ اب ایسے آلات آ گئے ہیں کہ انسان اگر گھر سے باہر ہے اور ٹیپ ریکارڈر اس کے پاس ہے، اگر وہ اس کی ریکارڈنگ کا بٹن دبا کر چلا جائے اور پھر واپس آئے تو اس کو پتا لگ جائے گا کہ اتنی مدت میں گھر والوں کے ساتھ کیا ہوا، انھوں نے کیا گفتگو کی۔

ایک اور حدیث سے انھوں نے کیمرے کے لیے استدلال کیا، حدیث کے الفاظ ہیں: «وَحُلِّيَتِ الْمَصَاحِفُ، وَصُوِّرَتِ الْمَسَاجِدُ، وَطُوِّلَتِ الْمَنَائِرُ». (حلیة الأولیاء وطبقات الأصفیاء:۳۵۸) ”قیامت سے پہلے ایک وقت آئے گا کہ مصاحف کو بہت منقش کیا جائے گا، مساجد کی تصویر کشی کی جائے گی اور مینار بہت اونچے اونچے ہوں گے“۔ اب یہاں پر جو صورت المساجد مساجد ہے، اس کے کئی مفہوم لیے گئے ہیں۔ ایک مفہوم تو شاید بالکل ظاہر نظر آتا ہے کہ مسجدوں کے اندر تصویریں بننی شروع

ہوجائیں گی اور نقش و نگار بننے شروع ہوجائیں گے۔ جیسے آج کل آپ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ مساجد میں پوری پوری ٹائلوں کے اندر بھی مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تصویریں ہوتی ہیں۔ اسی طرح مساجد کی تصویر کشی کی جاتی ہے یعنی مساجد کی تصویریں لی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان مثالوں کے آخر میں شیخ کہتے ہیں کہ یہ جو چیزیں ہیں ان میں سے اکثر چیزیں کچھ سال پہلے آئی ہیں۔ مثلاً گاڑی، ریڈیو اور ٹیلی گرام کی مثال انھوں ذکر کی ہے اور پھر زمانے کی تیزی کا بیان ہے، پھر ٹیپ ریکارڈر کا بیان ہے۔ لہذا وہ کہتے ہیں کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے صدیوں پہلے یہ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس بحث کے آخر میں شیخ فرماتے ہیں: ''اس سے حجت ظاہر ہوجاتی ہے اور نبی ﷺ کی نبوت کا ثبوت ہوجاتا ہے اور آپ کی سچائی رسالت کی سچائی کا اظہار ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار اور آپ کی رسالت کا جحود اور اس کی تکذیب کرنا گویا ایک حماقت اور سفاہت محسوس ہوتی ہے، جس کا اقرار کوئی عاقل نہیں کر سکتا''۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ جو غیب کی خبریں نبیٔ اکرم ﷺ نے دی ہیں، ان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کو لگے کہ قیامت قریب آنے والی ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ اللہ کی طرف رجوع کریں گے اور توبہ کریں گے، جس کے ذریعے ان کے دلوں میں جو فساد برپا ہو گیا ہے اور ان کے اعمال اور اعتقاد میں جو خرابی پیدا ہوگئی ہے، وہ اپنی اصلاح کرلیں گے۔

شیخ ابو بکر الجزائری کی دوسری تصنیف ''الأحاديث النبوية الشريفة في أعاجيب المخترعات الحديثة'' ہے، اس میں وہ بہت سی نشانیاں ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ آفاقی (آفاق کا مطلب ہے خارج میں، دنیا میں) علامات کا تذکرہ کیا ہے اور کچھ ''انفس'' (یعنی انسانوں کے نفوس) کی نشانیاں انھوں نے نقل کی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آفاق میں رونما ہونے والی جو علامات نقل کی ہیں، وہ اختصار کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں:

ریاستِ اسرائیل کا قیام

شیخ الجزائری نے جو علامات یہاں ذکر کی ہیں، ان میں تین بڑی آفاقی نشانیاں: پہلی، اسرائیل کی ریاست کا قیام، دوسری، ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور تیسری، مسلم حکومتوں کی کثرت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، جبکہ ان کے بعد احادیث کی روشنی میں دیگر علامات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اسرائیل کی ریاست کے قیام کے سلسلے میں

شیخ یہ حدیث لے کر آئے ہیں:«لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُونَ الْيَهُودَ، فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُونَ حَتَّى يَخْتَبِئَ الْيَهُودِيُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ، فَيَقُولُ الْحَجَرُ أَوِ الشَّجَرُ: يَا مُسْلِمُ يَا عَبْدَ اللهِ هَذَا يَهُودِيٌّ خَلْفِي، فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ، إِلَّا الْغَرْقَدَ، فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُودِ» .(مسلم)''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسلمان، یہود سے لڑائی نہ کرلیں اور مسلمان یہودیوں کو قتل کریں گے، یہاں تک کہ یہودی کسی دیوار یا درخت میں چھپیں گے تو وہ درخت یا پتھر کہے گا: اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہاں میرے پیچھے یہودی چھپا ہے، آ، اسے قتل کر، سوائے یہ کہ غرقد درخت ایسا نہیں کرے گا بلکہ وہ یہود کو چھپنے کی جگہ دے گا اس لیے کہ وہ یہودیوں کا درخت ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کے پاس بھی ایک طاقت ہوگی، ان کا بھی ایک جتھا ہوگا، ان کی بھی ایک سلطنت ہوگی اور پھر مسلمانوں کے ساتھ ان کی جنگ ہوگی، جو ظاہر ایک ریاست کی طاقت ہو سکتی ہے۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقا

ڈارون کا نظریۂ ارتقا انسان یا انسانیت کے آغاز کے حوالے سے ایک مسلّمہ حقیقت کا روپ دھار چکا ہے اور مسلم امت کے اکثر تعلیم یافتہ افراد نہ صرف اس کے قائل ہیں بلکہ اس کا پرچار کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ شیخ جزائری کے مطابق ڈارون کی تھیوری دین کے خلاف ہے اور ایک حدیث سے ڈارون کے نظریے کی تردید ہوتی ہے۔ شیخ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ظاہر بات ہے کہ ڈارون انیسویں صدی میں پیدا ہوا اور اس نے اس نظریے کو پیش کیا، لیکن نبی اکرم ﷺ ساتویں عیسوی صدی میں ہمیں ایسی بات بتا گئے ہیں کہ جس کے بعد ہمارے لیے ڈارون کی تھیوری کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الجزائری نے ڈارون کے اس نظریے کے ردّ میں ایک صحیح حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:«إِذَا قَاتَلَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ، فَلْيَجْتَنِبِ الْوَجْهَ، فَإِنَّ اللهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ».(مسلم)''جب تم میں سے کسی شخص کی کسی دوسرے سے لڑائی ہو، یا اپنے کسی بھائی سے لڑائی ہو، تو چہرے سے بچنا یا چہرے کو مارنے سے بچنا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس کی صورت پر پیدا کیا''۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

صُورَتِهِ میں موجود "ہ" ضمیر کس طرف لوٹائی جائے گی۔ اس کے متعلق شیخ کہتے ہیں کہ اس کی کئی تاویلات ہو سکتی ہیں: پہلی تاویل تو یہ ہے کہ مذکورہ ضمیر اللہ کی طرف لوٹائیں گے، کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، چونکہ یہ احتمال عقلاً اور شرعاً محال ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم کسی صورت، کسی جسم کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ، وَهُوَالسَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱) "کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے، اور وہی ہے جو ہر بات سنتا، سب کچھ دیکھتا ہے"۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اس کے جد آدم کی صورت پر پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے چہرے پر تم تھپڑ مار رہے ہو یہ تمھارے بابا آدم کے چہرے ہی کے نمونے پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، تو چہرے پر مارنے سے بچیں۔ اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ: أن يكون الله تعالى خلق آدم على صورة الرجل المضروب. "کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا ہے، رجل مضروب کی صورت پر، یعنی اس کی اپنی صورت پر"۔ یہاں ضمیر کے تین مراجع ممکن ہیں: اللہ کی طرف، آدم کی طرف اور رجل مضروب کی طرف۔ اللہ کی طرف تو ممتنع ہے۔ باقی تاویلات میں سے کوئی درست ہو سکتی ہے۔ اب یہاں تیسری تاویل شیخ کا مستدل ہے، جس کے بارے میں شیخ کہتے ہیں: وهو المعجزة المحمدية وشاهد إبطال النظرية داروينية. "یہ محمد رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے اور اس میں ڈارون کے نظریے کا ابطال ہے۔ پھر یہ تاویل یوں بیان کرتے ہیں: وهو أن الله تعالى خلق آدم على صورته التي ورثها أبنائُه عنه. "اللہ تعالیٰ نے آدم کو اس صورت پر پیدا کیا جو وراثت میں اس کی اولاد میں چلی ہے"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو جس صورت پر پیدا کیا آج بھی جو انسان پیدا ہوتے ہیں وہ اسی سانچے پر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: "ایسا نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کے ہاں ان کی خلقت میں تطور یا Evolution ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جس صورت پر پیدا کیا بالکل اسی صورت پر اس کی اولاد اور اس کے بیٹے اور پوتے اور پوتیاں اور پڑپوتے اور آج تک جو انسان پیدا ہو رہے ہیں، ایک نسل کے بعد دوسری نسل"۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ آج موجودہ انسان اسی شکل پر تھا جس شکل پر اس کے بابا

آدم تھے، یعنی (معاذ اللہ) ایسا نہیں ہے کہ موجودہ انسان کسی حیوان کی بہتر ہوئی شکل ہے، کہ پہلے انسان بندر تھا پھر آہستہ آہستہ اس کی شکل اور ہیئت بدل گئی۔ تو یہ ایک بڑا نادر سا اور لطیف سا استدلال کیا ہے کہ دیکھیے اس حدیث کی روشنی میں گویا ہم یہ کہیں گے کہ ڈاورن کی تھیوری باطل ہے اور ہم اس کو قبول نہیں کریں گے۔

مسلم حکومتوں کی کثرت

علاماتِ قیامت میں سے شیخ کے نزدیک ایک نشانی مسلم حکومتوں کی کثرت ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں مسلم حکومتوں کی کثرت ہے۔ چونکہ پہلے خلافت تھی، وہ اجتماعی تھی، لیکن اب سیکنڈ ورلڈ وار کے بعد نیشن سٹیٹ یعنی قومی حکومتیں وجود میں آئی ہیں۔ قیامت کی اس علامت کے متعلق انھوں نے ایک حدیث کا تذکرہ کیا ہے، جو حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کے طور پر بھی معروف ہے۔ البتہ وہ موقوف روایت ہے لیکن حکماً مرفوع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک فتنے اور خرابی کا ذکر کیا تو لوگوں نے پوچھا ایسا کب ہوگا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: إِذَا قَلَّتْ أُمَنَاؤُكُمْ وَكَثُرَتْ أُمَرَاؤُكُمْ. (الترہیب والترغیب) ''یہ اس وقت ہوگا جب تمھارے امین لوگ کم ہوجائیں گے اور تمھارے امرا بہت زیادہ ہوجائیں گے''۔ یہاں شیخ نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہاں امیر، حاکم اور خلیفہ کے معنوں میں ہے کہ مسلمانوں کے حکمران بہت سارے ہوجائیں گے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت یہی حال ہے کہ مسلمانوں کی اتنی زیادہ ریاستیں ہوگئی ہیں اوران کے حکمران متعدّد ہوگئے ہیں۔

کفّار کا مسلمانوں پر تسلّط

شیخ الجزائری نے ایسی احادیث کا ذکر بھی کیا ہے جن میں آفاق میں ہونے والے ان واقعات کا تذکرہ ہے، جو ظہور پذیر ہو چکے ہیں اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شامل ہیں۔ اس سلسلے میں کفّار کے مسلمانوں پر تسلط حاصل کر لینے کے حوالے سے ایک معروف حدیث ہے جو کئی کتابوں میں رقم ہے: «يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا». فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: «بَلْ

أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ، وَلَكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ! وَلَيَنْزَعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ اللهُ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ». فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ:«حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ». (ابوداود) ”عن قریب ایسا وقت آئے گا کہ دوسری امتیں تمھارے خلاف ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کہ کھانے والے اپنے پیالے پر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ کہنے والے نے کہا: کیا یہ ہماری ان دنوں قلت اور کمی کی وجہ سے ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم ان دنوں بہت زیادہ ہو گے، لیکن جھاگ ہو گے، جس طرح کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے دشمن کے سینوں سے تمھاری ہیبت نکال دے گا اور تمھارے دلوں میں 'وہن' ڈال دے گا۔ پوچھنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہن سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت کی کراہت“۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ کے کئی مظاہر ہیں۔ حال ہی میں کورونا کی وبا پھیلنے کے بعد اس کے مظاہر ہمارے سامنے آئے۔ عربی زبان میں ایک محاورہ ہے کہ عند الامتحان يكرم المرء أو يهان، یعنی امتحان کے نتیجے میں یا تو آدمی کا اکرام کر دیا جاتا ہے اور اسے مرتبہ دے دیا جاتا ہے یا اس کو ذلیل و رسوا کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال غزوۂ احزاب سے سمجھ لیجیے جو ایک غیر معمولی اور دل دہلا دینے والا واقعہ تھا، اہلِ ایمان نے امتحان کی اس گھڑی میں کہا: ﴿هَذَا مَا وَعَدَنَا اللهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا﴾ (الاحزاب:۲۲) ”اور جب مومنوں نے (کافروں کے) لشکر کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے پیغمبر نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے پیغمبر نے سچ کہا تھا۔ اور اس سے ان کا ایمان اور اطاعت اور زیادہ ہو گئی“۔ جبکہ منافقین کا نفاق مزید کھل کر سامنے آ گیا: ﴿وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا﴾ (الاحزاب:۱۲) ”اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہنے لگے کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکے کا وعدہ کیا تھا“۔ گویا ایمان کا امتحان ہو گیا جس میں مومنین کا اکرام اور منافقین کی تذلیل ہوئی۔ کورونا کی اس وبا سے بھی عوام کے ایمان کا امتحان ہو گیا۔ تو بہر حال، یہاں جو حدیث ہے اس سے شیخ کا استدلال و استنباط بالکل ٹھیک ہے۔

پولیس کا نظام

اس کے بعد شیخ نے پولیس اور شرطوں کے نظام کے حوالے سے ایک حدیث بیان کی، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُونَ بِهَا النَّاسَ وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيحَهَا وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا». (مسلم) ''دوزخیوں کی دو قسمیں ہیں، جن کو میں نے نہیں دیکھا: ایک تو وہ لوگ جن کے پاس بیلوں کی دموں کی طرح کے کوڑے ہیں، وہ لوگوں کو اس سے مارتے ہیں، دوسرے وہ عورتیں جو کپڑے پہنتی ہیں، مگر ننگی ہیں (یعنی ان کا لباس ستر چھپانے کے لائق نہیں ہوتا) بہکانے والی اور خود بہکنے والی ہیں اور ان کے سر بختی اونٹ (اونٹ کی ایک قسم ہے) کے کوہان کی طرح ایک طرف جھکے ہوئے۔ وہ جنت میں نہ جائیں گی بلکہ اس کی خوشبو بھی ان کو نہ ملے گی، حالانکہ جنت کی خوشبو اتنی دور سے آرہی ہوگی''۔ اس حدیث میں مذکور دونوں باتیں ثابت ہو چکی ہیں اور دوسری بات جو عورتوں سے متعلق ہے یہ بھی معروف ہے تاہم یہ ہمارا موضوع نہیں۔ شیخ نے اس حدیث کے پہلے حصے (بیلوں کی دموں کی طرح کے کوڑوں والے لوگ) کا انطباق پولیس کے نظام اور سیکیورٹی اہلکاروں پر کیا ہے جن کا عمومی رویہ مار پیٹ ہی ہوتا ہے۔ مسلمان ممالک ہوں یا مغربی دنیا، جس طرح سے لاٹھی چارج، مار دھاڑ اور توہین آمیز سلوک کیا جاتا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے شیخ الجزائری کہتے ہیں کہ پولیس کا پورا نظام اللہ کے نبی ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہے۔ اسی طریقے سے ایک اور روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: «أخاف عليكم ستًّا: إمارةَ السُّفهاءِ، و سفكَ الدَّمِ، و بيعَ الحُكمِ، و قطيعةَ الرَّحِمِ، و نَشْوًا يتخذون القرآنَ مزاميرَ، وكثرةَ الشُّرَطِ». (المعجم الكبير للطبرانی) ''مجھے تمھارے بارے میں چھے چیزوں کا اندیشہ ہے، بیوقوفوں کی حکومت، انسانی خون کی ارزانی، حکام اور فیصلوں کی خرید و فروخت، قطع رحمی، کیف و سرور والے لوگ جو قرآنِ مجید کو سریلی آواز میں پڑھنے کا اہتمام کریں گے اور شُرطوں کی کثرت''۔ اس حدیث میں بھی شرطوں کی کثرت کا بیان ہے اور جیسے جدید دور میں پولیس کا پورا

نظام ترتیب دیا گیا ہے وہ اس کا ایک مظہر ہے۔

الحکم بغیر ما انزل اللہ

شیخ الجزائری نے اگلا عنوان یہ قائم کیا ہے کہ جو احکامات اللہ تعالیٰ نے نازل کیے ہیں ان کو نظر انداز کر کے قانون سازی کرنا۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَتُنْتَقَضَنَّ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً، فَكُلَّمَا انْتَقَضَتْ عُرْوَةٌ تَشَبَّثَ النَّاسُ بِالَّتِي تَلِيهَا، وَأَوَّلُهُنَّ نَقْضًا الْحُكْمُ وَآخِرُهُنَّ الصَّلَاةُ». (مسندِ احمد)

''اسلام ایک ایک کڑی کر کے ٹوٹتا چلا جائے گا، جب ایک کڑی ٹوٹ جائے گی تو لوگ دوسری کڑی کو پکڑ لیں گے، سب سے پہلے جو کڑی ٹوٹے گی وہ ''حکم'' یعنی فیصلہ ہو گا اور آخری ٹوٹنے والی کڑی نماز ہو گی''۔ آج کل مذہبی لوگوں کا رویہ یہ بن گیا ہے کہ جتنا دین بچ گیا ہے، اسی پر اکتفا کر لیں، اگر ریاستی جبر کے تحت فلاں دینی کام ختم ہو گئے تو فلاں چیزیں باقی بھی تو ہیں۔ چنانچہ ایک سمجھوتے سے آغاز ہوتا ہے اور پھر سمجھوتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آج یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ مزید کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ پہلی کڑی جو ٹوٹے گی وہ ''حکم'' کی کڑی ہو گی، یعنی فیصلے اللہ تعالیٰ کے قوانین کے بجائے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہونے لگیں گے۔ مسلمانوں کا دینی نظامِ حکم اور تصورِ قانون ختم ہو جائے گا اور آخری چیز نماز رہ جائے گی۔ غور کریں کہ ہم نے جتنے سمجھوتے کیے ہیں، ان کے نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں کہ نماز بھی ہاتھ سے جا رہی ہے۔ شروع میں جب ہم نے کہا کہ باقی چیزیں لادین قوتوں کے سپرد کر دیں اور ہم اپنے اداروں کا دفاع کر لیں، لیکن اب ان کے بھی لالے پڑ گئے۔ اب تو نماز کے معاملات میں بھی دخل اندازی ہو رہی ہے، یہ نہایت خطرناک صورتِ حال ہے۔

جہاد کے بجائے احتجاج کا راستہ اختیار کرنا

شیخ الجزائری قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ بتلاتے ہیں کہ لوگ جہاد اور قتال کو چھوڑ کر احتجاج کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیں گے اور انھی طریقوں پر اکتفا کر لیں گے۔ طبرانی کی ایک روایت ہے

کہ نبی ﷺ نے فرمایا:«ثَلَاثٌ إِذَا رَأَيْتَهُنَّ فَعِنْدَكَ عِنْدَكَ: إِخْرَابُ الْعَامِرِ، وَإِعْمَارُ الْخَرَابِ، وَأَنْ يَكُونَ الْغَزْوُ رِفْدًا، وَأَنْ يَتَمَرَّسَ الرَّجُلُ بِأَمَانَتِهِ تَمَرُّسَ الْبَعِيرِ بِالشَّجَرَةِ».(المعجم الکبیر للطبرانی) ’’تین چیزیں جب تم دیکھ لوگے تو اس کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی، آباد جگہیں برباد ہو جائیں اور اجاڑ جگہیں آباد ہو جائیں، جنگ ندا پر مشتمل ہوگی، امانت کو لوگ ایسے کھا جائیں گے جیسے اونٹ درخت کو آہستہ آہستہ کھا جاتا ہے‘‘۔ آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں جہاں صحرا تھا اور بے کار اور اجاڑ جگہیں تھیں وہاں اپنے تئیں جنّت تخلیق کی جا رہی ہے۔ دوسری جانب صنعتی ترقی، ڈیم، موٹر ویز اور پلازے بنانے کی آڑ میں بڑی بڑی آبادیاں ختم کی جاتی ہیں۔ اس روایت سے شیخ نے جو استدلال کیا وہ یہ ہے کہ جنگ ندا پر مشتمل ہوگی، یعنی نعرے بازی ہوگی، پکاریں لگائی جائیں گی۔ اس سے انھوں نے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ جہاد اور مقاومت میں لڑنے بھڑنے کی بجائے نعرے بازی رہ جائے گی اور یہی نعرے لگا کر گویا جہاد کا فریضہ نمٹا دیا جائے گا۔

فحاشی وعریانی میں اضافہ

یہ بات عام مشاہدے میں ہے کہ آج کس طرح عریانی اور برہنگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کپڑوں کا کم ہوتے چلے جانا، فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ شیخ نے جو روایت بیان کی ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:«بادیةُ الأفخاذِ في الأسواق».(الفردوس بمأثور الخطاب) ’’ان کی رانیں کھلی ہوئی ہوں گی جبکہ وہ بازاروں میں چل پھر رہے ہوں گے‘‘۔ اگر آدمی گھر میں ہو اور اس کا لباس تھوڑا ہلکا ہو جائے یا ران کھل جائے تو گھر اس کا حرم ہے اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، لیکن انسان بازاروں میں اس حال میں پھرے کہ اس کی رانیں کھلی ہوئی ہوں تو یہ برہنگی اور گھٹیا پن ہے۔ شیخ کہتے ہیں کہ یہ منظر اب اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ عرب ممالک میں فٹ بال کا جنون بہت بڑھ گیا ہے، جس میں عرب کھلاڑی نیکر پہن کر کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اس سے انھوں نے استدلال کیا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے برہنگی

بڑھنے اور لباس کم ہونے کی جو پیش گوئی کی تھی وہ پوری ہوگئی۔

متفرّق علامات

آفاق میں رونما ہونے والی نشانیوں کے بیان کے بعد شیخ الجزائری نے انسانی وجود سے متعلق کچھ علامات بیان کی ہیں، جو انسان کی اپنی ذات میں ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے تمام استنباط درست ہیں۔ ان میں سے: سود کا عام ہو جانا، مردوں کا عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا اور عورتوں کا مردوں کی مشابہت اختیار کرنا، اسی طرح یہود و نصاریٰ کی مشابہت اختیار کرنا اور ان کی شکل و صورت، لباس، تہذیب و تمدن اختیار کرلینا۔ حرام ٹھہرائی گئی چیزوں کو حلال کرتے چلے جانا، ماسوا اللہ کو خوش کرنے اور اس کی رضاجوئی کے لیے علم حاصل کرنا۔ اسی طرح ایک علامت یہ بھی ہے کہ انسانوں کی عقل ہلکی ہو جائے اور انسانوں کی مت ماری جائے، کچھ روایتوں میں ایسا منظر بیان ہوا کہ لوگ بالکل جانوروں کی طرح زندگی گزاریں گے۔

شیخ ابوبکر الجزائری کے نقطۂ نظر کا اجمالی جائزہ

شیخ ابوبکر الجزائری کے رسائل کا ہم نے جو مطالعہ کیا اس سے واضح ہوا کہ ساری تاویلات مسائل کا سبب نہیں بنتیں اور سارے انطباقات و تنزیلات، معاذ اللہ، شہرت کے حصول، سنسنی کے پھیلاؤ یا کسی دوسری بری نیت سے نہیں ہوتے۔ شیخ الجزائری بہت معروف عالم نہیں ہیں، ان کی حیثیت ایک واعظ کی سی ہے اور وہ عوام کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ پہلو اجاگر کر رہے ہیں کہ یہ سب نبیٔ اکرم ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ اور وہ شر کے بڑھتے ہوئے مظاہر بیان کر رہے ہیں تاکہ ہم ان سے خبردار ہوں اور ان کو شیرِ مادر کی طرح اختیار نہ کریں۔ ہمارے معاشرے میں شر کے ان مظاہر کی حسّاسیت ختم ہوگئی ہے۔ شیخ اس حسّاسیت کو جگانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہم ان فتنوں میں مخفی شر کو پہچانیں اور اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر سفر بن عبد الرحمن الحوالی

اب ہم سعودی عرب ہی کے ایک شیخ، ڈاکٹر سفر الحوالی کی کچھ تحریروں کا جائزہ لیں گے۔ آپ بلا شبہہ ایک بڑے عالم ہیں۔ آپ کی تاریخِ پیدائش ۱۹۵۰ء ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ام القری یونی ورسٹی سے انھوں نے شریعہ میں ایم فل کیا اور بعد ازاں ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔ ان کے تحقیقی مقالوں کے عنوانات بہت اہم ہیں اور ان سے ان کے مزاج کا پتا چلتا ہے کہ کس طرح ان کی شخصیت پروان چڑھی، اور مختلف افکار ان کے سامنے آئے۔ ان کے ایم فل کے مقالے کا موضوع تھا: ''العلمانية: نشأتها وتطورها وآثارها في الحياة الإسلامية المعاصرة''یعنی سیکیولرازم کی پیدائش اور ارتقا کیسے ہوا اور عالمِ اسلام پر اس کے کیا اثرات ہیں؟ پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ''ظاهرة الإرجاء في الفكر الإسلامي ''تھا، یعنی ارجا کا دوبارہ ظہور ہونا۔ ارجا کرنے والے لوگ مرجیہ کہلاتے تھے اور ان کے عقائد یہ تھے کہ کلمہ پڑھ لینا اور قلب میں ایمان ہونا کافی ہے عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ نے لکھا کہ یہ تصور عالمِ اسلام میں دوبارہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ام القری میں تدریس شروع کی اور قسم العقيدة والمذاهب الإسلامية کے دو ادوار تک تقریباً آٹھ سال رئیس رہے۔

عرب دنیا میں خلیجی جنگ کا آغاز اور شیخ الحوالی کا موقف

نوے کی دہائی میں جب عالمِ عرب میں ایک بہت بڑا واقعہ ہوا، جس کے عرب دنیا پر دُور رس اثرات پڑے۔ وہ یہ کہ صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا اور ایک جنگ شروع ہوئی جس میں امریکہ بھی شامل ہو گیا۔ امریکی فوج پہلی مرتبہ بلاد الحرمین میں آکر قیام پذیر ہوئی۔ اس واقعے پر وہاں کے لوگوں نے بہت برا محسوس کیا۔ القاعدہ کی تاریخ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعہ القاعدہ کی تحریک میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور ان کی بنیادی فکر کا آغاز یہیں سے ہوا۔ نبی کریم ﷺ کی معروف حدیث ہے: «لَأُخْرِجَنَّ اليَهُودَ وَالنَّصَارَى مِنْ جَزِيرَةِ العَرَبِ، فَلاَ أَتْرُكُ فِيهَا إِلاَّ مُسْلِمًا». (ترمذی) ''میں جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو ضرور

نکالوں گا اور اس میں صرف مسلمان کو باقی رکھوں گا"۔ القاعدہ نے امریکی فوج کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کے لیے مذکورہ حدیث کو بنیاد بنایا۔ شیخ نے بھی تائید کی کہ امریکی افواج کو یہاں سے نکالا جائے اور اس حوالے سے انھوں نے خاصی تنقید کی، جس کی وجہ سے وہ زیرِ عتاب آئے اور یونی ورسٹی کا عہدہ ان سے واپس لے لیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "وعد كيسنجر والأهداف الأمريكية في الخليج" تھا۔ ہنری کسنجر جو اس وقت تک ایک پُراسرار کردار بن چکا تھا، اس کی سفارت کاری اور امریکا کی خلیج میں دہشت گردی پر یہ کتاب لکھی گئی۔ اس وجہ سے وہ پہلے ۱۹۹۴ء اور پھر ۱۹۹۹ء میں جیل میں ڈالے گئے۔ رہائی پانے کے بعد انھوں نے فلسطین کی تحریک کے حوالے سے ایک کتاب لکھی "يوم الغضب هل بدأ بانتفاضة رجب؟" اور اس کتاب میں "قراءة تفسيرية لنبوءات التوراة عن نهاية دولة إسرائيل" یعنی "اسرائیل کی غاصبانہ ریاست کے خاتمے کے متعلق تورات میں کی گئی پیش گوئیوں کا ایک مطالعہ" جیسے عنوانات شامل ہیں۔ اس کے بعد وہ مزید کتابیں بھی لکھتے رہے۔ نائن الیون کے واقعے پر بھی انھوں نے لکھا۔ اسی موضوع پر ان کا ایک رسالہ چھپا، "رسالة من أمريكا: على أي شيء نقاتل" یعنی جو امریکا کہہ رہا تھا کہ ہمیں دہشت گردی کے خلاف مل کر جنگ کرنی ہے، اس پر انھوں نے سوال اٹھایا کہ ہم کیوں لڑیں؟ ۲۰۰۳ء میں دوسری عراقی جنگ شروع ہونے پر انھوں نے "الإنتفاضة والتتار الجدد" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس میں امریکی افواج کو جدید تاتاری اور چنگیزی قرار دیا گیا ہے۔ اس سے قبل "القدس بين الوعد الحق والوعد المفترٰى" کے عنوان سے ان کی کتاب بہت معروف ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ "وعد الحق" وہ ہے جس کا قرآنِ مجید میں تذکرہ ہے: ﴿وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ﴾ (الانبیاء:۹۷) "اور (قیامت کا) سچا وعدہ قریب آجائے"۔ یا اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل سے وعدوں کا جو ذکر ہے۔ جبکہ وعد المفترٰی، جھوٹا گھڑا ہوا وعدہ ہے، جو یہودیوں اور صیہونیوں نے گھڑا ہوا ہے کہ مسیح دنیا میں آئے گا اور تمھیں تمھارا اقتدار واپس دلوائے گا، جیسا داوٗد اور سلیمان علیہما السلام کے دور میں تھا۔ اور اس طرح بنی اسرائیل کی

تاریخ کا سنہری دور دوبارہ زندہ ہو گا۔ ان کی سب سے اہم کتاب: ''المسلمون والحضارة الغربية'' کے عنوان سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے جو تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے مغربی تہذیب، اس کے افکار و عقائد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مسلم تہذیب سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بہت سی تلخ باتیں درج کیں اور آخر میں نصيحة لآل سعود یعنی ''آلِ سعود کے نام ایک نصیحت'' کے عنوان سے ایک کھلا خط تحریر کیا جو پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے بہت سی باتیں بیان کیں اور تذکرہ کیا کہ انھیں کسی سے کوئی ذاتی عداوت یا دشمنی نہیں ہے۔ بتایا کہ اقتدار سے منسلک لوگوں سے وہ بہت قریب رہے۔ شاہ سلمان کا تذکرہ کیا کہ جب وہ ابھی بادشاہ نہیں تھے اور گورنر تھے تو ان سے کیا تعلق تھا وغیرہ۔ یہ کتاب ابھی پوری طرح شائع ہو کر مارکیٹ میں نہیں آئی تھی کہ جولائی ۲۰۱۸ء میں ان کو اور ان کے تین بیٹوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا اور ابھی تک وہ زیرِ حراست ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت ہی حساسیت کی حامل ہے کہ اس میں انھوں نے بہت سی ان کہی کہہ ڈالیں اور بہت سی تلخ باتیں کہیں جو کوئی نہیں کہتا۔ خاص طور پر انھوں نے غلام احمد قادیانی کا ذکر کیا اور ایک بڑا سخت جملہ لکھا کہ: ولو عاش القادياني اليوم لسمّي الجهاد إرهاباً ولأيّدته بعض القنواة في هذه البلدة المباركة وقالت أنه معتدل. ''یعنی اگر ملعون قادیانی آج زندہ ہوتا تو وہ موجودہ جہاد کو بھی دہشت گردی کہتا (جیسے دنیا کہہ رہی ہے اور جیسے اس زمانے میں اس نے جہاد کو منسوخ کیا) تو (بدقسمتی سے) بلادِ مبارکہ میں بہت سے ویب چینلز یا ٹی وی چینلز اس کی تائید کرتے اور کہتے کہ غلام احمد قادیانی نے تو بہت معتدل بات کی ہے''۔ چونکہ میڈیا میں اعتدال پسند لوگوں کو ہی سراہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پرویز مشرف صاحب کا نعرہ بھی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا تھا۔ شیخ کی مراد یہ ہے کہ غلام احمد قادیانی تو آج زندہ نہیں ہے، لیکن اس کے ہم مذہب بہت سے لوگ، جن کا نام لینے کی ضرورت نہیں، میڈیا میں انھی کا بیانیہ پیش کرتے ہیں کہ جہاد و قتال تو دہشت گردی ہے اور اصل اسلام ''معتدل اسلام'' ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ معتدل اسلام الإسلام الأمريكي ہے، یعنی وہ اسلام جو امریکہ کو پسند ہے اور مصر کے السیسی کے بھونپو بھی یہی راگ الاپتے ہیں۔ اسی طرح

انھوں نے کتاب میں جگہ جگہ نام لے کر بہت سخت تنقید کی ہے، مسلمان حکمرانوں کو عموماً، اور متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے حکمرانوں کو خصوصاً سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے کام سے واضح ہے کہ وہ ایک نہایت اہم شخصیت ہیں اور ہر لحاظ سے ایک بہت پختہ کار عالم ہیں۔ ان کا عقیدے پر بھی بہت کام ہے۔ یہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے حامل ہیں۔ بہت سے لوگ صاحبِ علم تو ہوتے ہیں، مگر استقامت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ اگر علم کے ساتھ استقامت بھی ہو تو سونے پر سہاگہ، جیسے تبلیغی جماعت میں ہمارے یہاں ایک جملہ معروف ہے کہ جمنے کا وقت ہو تو کبھی لوگ جم کے بھی دکھائیں۔ تو یہ شیخ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے جم کر دکھایا۔ کھڑے ہوئے مقاومت کی اور اس زمانے کے فتن اور حالات بیان کر دیے۔ جو لوگ نہیں بول رہے ان کے پاس اپنی رخصت ہوگی ہمیں ان پر طعن کرنے ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک آدھ لوگ ہر زمانے میں ایسے چاہیے ہوتے ہیں کہ جو اس محنۃ یعنی آزمائش کو اور ظلم و تعدّی اور تشدد کو برداشت کر سکیں اور صحیح بات بیان کر سکیں۔

یوم الغضب هل بدأ بانتفاضة رجب؟ کا جائزہ

ڈاکٹر سفر الحوالی نے اسرائیل کے خاتمے اور یہودیوں کے مستقبل کے منصوبوں اور آنے والے واقعات کا اس کتاب یوم الغضب هل بدأ بانتفاضة رجب؟ میں جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور پاکستان میں بھی ایک سے زیادہ ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے کئی پیش گوئیوں کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حسبِ ذیل باتوں کا اہتمام کیا ہے:

پیش گوئیوں کے متعلق احتیاط کا مشورہ

چونکہ وہ محتاط آدمی ہیں اس لیے انھوں نے آغاز میں ہی ایسی پیش گوئیوں سے متعلق احتیاط کا ذکر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلی احتیاط ثبوت کی ہے، اکثر نادان لوگ یہ احتیاط نہیں کرتے۔ اس میں دو باتیں اہم ہیں: ایک بات یہ کہ خبر محقق بھی ہے یا نہیں اور دوسری بات کہ اس سے جو فہم لیا گیا وہ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ اسی

طرح اسرائیلیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسرائیلیات تین طرح کی ہوتی ہیں: ایک وہ جن کی دین تائید کرتا ہے، دوسری وہ جن کے دین خلاف ہے اور تیسری جہاں توقف ہے۔

اسرائیلیات سے استفادہ

اس کتاب میں انھوں نے Old testament کو سامنے رکھ کر ان کی تاریخ بیان کی ہے اور مستقبل کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اس پر تفصیل سے انھوں نے کلام کیا ہے۔ کہیں کہیں چند احادیث سے بھی استدلال کیا ہے لیکن زیادہ تر استدلال اسرائیلیات سے کیا۔ نبی کا مطلب غیب کی خبر دینے والا ہوتا ہے۔ چونکہ بائبل میں جگہ جگہ یہ جملہ ملتا ہے کہ فلاں نبی نے نبوّت کی۔ نبوّت کرنا اصل میں پیش گوئی کرنا ہی ہے۔ انھوں نے ایسی پیش گوئیوں کا بڑا حصہ کتاب میں شامل کیا ہے۔ بہر حال، ایک لحاظ سے ان اسرائیلی روایات پر بہت زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال میں ان تمثیلات کو لے لینا مناسب نہیں ہے۔ مثلاً: جب میں نے اس لٹریچر کا مطالعہ کیا، تو اس میں خاص طور پر دانیال کی پیش گوئیاں بہت اہم ہیں، جن میں ایک درندے کا تذکرہ ہے، جس کا ایک نشان بھی ہو گا جسے Mark of beast کہا جاتا ہے جو ٦٦٦ سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس سے بہت عجیب و غریب استدلال کیے گئے کہ اس کی اتنی ٹانگیں ہوں گی، اتنے سر ہوں گے۔ چونکہ عیسائی فرقوں میں بڑی گہری باہمی رقابت ہے اور کیتھولکس، پروٹسٹنٹ اور ایوینجلیکلز ان پیش گوئیوں کو مختلف طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ امریکہ میں اس پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اس درندے کی اتنی ٹانگیں، اتنے ہاتھ ہوں گے۔ پھر استدلال کیا گیا کہ یورپی یونین ہی اصل میں مسیح الدجّال ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ اور برطانیہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ اکثریت میں ہے اور کیتھولک فرقہ اقلیت میں ہے جبکہ باقی یورپ میں زیادہ کیتھولک ہیں۔ حال ہی میں برطانیہ نے یورپین یونین سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ اس کے معاشی اور دیگر اسباب بھی ہیں مگر وہ اس کو یوں بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کیتھولکس پر مشتمل یورپین یونین درندہ ہے اور یہ دجال کے ساتھی ہیں جو دجال کی مملکت کو تشکیل دے رہے ہیں۔ تیس، پینتیس سال سے ایسا لٹریچر بہت زیادہ وہاں چھپ رہا ہے اور بڑا عام ہو گیا ہے۔ شیخ نے اپنی اس کتاب میں بھی یوحنّا اور دانیال کے مکاشفے پر بہت زیادہ اعتبار کیا اور مغربی

شارحین کے بائبل کے اشارات سے کیے گئے استدلال پر بھی بھروسا کیا۔ جبکہ ایسی پرانی کتابیں قدیم زبانوں میں ہوتی ہیں اور غلطی کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور اس میں علم الاعداد سے بھی بہت کام لیا جاتا ہے۔ ان مکاشفات کے جو نتائج نکلے وہ علم الاعداد کی روشنی میں انھوں نے بیان کیے کہ اس پیش گوئی سے فلاں تاریخ نکلتی ہے۔ مثالیں دیں کہ یہ وہ تاریخ ہے جس میں اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی اور پیش گوئی کی کہ یہ ریاست کب ختم ہونے جا رہی ہے۔ یہ تمام تفصیلات بیان کرنے کے بعد آخر میں انھوں نے عنوان قائم کیا: ﴿وَيَقُولُونَ مَتَى هُوَ قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا﴾ یہ عنوان سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵۱ سے لیا گیا۔ یعنی عن قریب وہ پوچھیں گے کہ ایسا کب ہوگا؟ کہہ دو کہ امید ہے جلد ہوگا۔

چونکہ اس وقت ایسا لٹریچر چھپ چکا تھا اور عام بھی ہو رہا تھا کہ یہود کی غاصبانہ، ظالمانہ ریاست ختم ہو جائے گی اور اسلام کا غلبہ ہوگا۔ تو انھوں نے بیان کیا کہ یہ ایک مشکل سوال ہے کہ وہ روزِ غضب کب آئے گا اور یہ منحوس ریاست کب ختم ہوگی اور القدس آزاد ہوگا۔ پھر لکھتے ہیں کہ دانیال کی پیش گوئی میں اس کا جواب موجود ہے۔ پھر انھوں نے علم الاعداد کے مختلف حساب کتاب لگا کر نہایت محتاط انداز میں بیان کیا کہ یہ النهاية او بداية النهاية یعنی خاتمہ یا آغازِ خاتمہ، ۱۴۳۳ ہجری یا ۲۰۱۲ عیسوی میں ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ ایک بڑے عالم ہیں تو محتاط رویہ رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ: هو ما نرجو وقوعه و لا نجزم إلا إذا صدق الواقع، یعنی ہم امید کرتے ہیں کہ ایسا ہوگا لیکن ہم جزم سے کام نہیں لیں گے سوائے اس کے کہ واقعہ اس کی تصدیق کر دے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ خارج کے واقعات کسی بھی پیش گوئی کو ثابت کر دیں گے یا اس کو جھٹلا دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عیسائی بنیاد پرست اور اصولیین ہم سے شرط لگانا چاہیں جیسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رومیوں کے غالب ہونے کے متعلق شرط لگائی گئی، جس کی پیش گوئی قرآن پاک میں سورۂ روم میں دی گئی ہے، تو ہم شرط لگانے کو تیار ہیں اور ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ لازماً یہ شرط ہار جائیں گے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ شرط بغیر اس تحدید کے ہو کہ ایسا کس سال میں ہوگا۔ تمام پیش گوئیوں کا مطالعہ اور علم الاعداد کا حساب کتاب کرنے کے بعد وہ یہ بات کر رہے ہیں کہ یہ ایک مقدر ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہہ دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح

بشارتوں میں ہمیں بتا دیا کہ یہ سب ہو کر رہے گا، سیدنا مسیح علیہ السلام کا ظہور ہو گا، ان کے آنے کے بعد یہودی مار دیے جائیں گے، عیسائیوں پر حقیقت کھل جائے گی اور ان کا ابن اللہ کا عقیدہ ختم ہو جائے گا۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے اور عیسائی مسلمان ہو جائیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے اور جو عیسائی ایسا نہیں کریں گے وہ یہودیوں کے ساتھ ہوں گے۔

بہر حال، ان صاحب نے نبوّات (پیش گوئیوں) پر ایک کتاب لکھی اور اس کے آخر میں ایک تقویم بھی دے دی جو انھیں نہیں دینی چاہیے تھی یا اس کو اس طرح اپنانا نہیں چاہیے تھا کیونکہ اس سے بڑے مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس مثال میں یہ ایک تنبیہ کا پہلو ہے، لیکن بہر حال، انھوں نے ایک محتاط رویہ اختیار کیا اور حتمی بات کہنے سے احتراز کیا۔ کوئی بھی بڑا عالم اور محتاط آدمی گفتگو میں احتیاط کو ملحوظ رکھے گا۔ اسی طرح ان کی کتاب چھپنے کے بعد اردو ترجمہ کے لیے ان کی جو تحریر موصول ہوئی تو اس میں انھوں نے وضاحت کی کہ: إنّ هذا الكتيّب ليس المقصود به تاسيس عقيدة أبدًا للمسلمين فإنّ الله تعالى قد أغنانا بالكتٰب والسنّة. یعنی وہ وضاحت کر رہے ہیں کہ ہم اہلِ کتاب کے کچھ مآخذ سے استدلال کے لیے استیناس کر رہے ہیں لیکن ہم عقائد قرآن وسنت سے ہی لیں گے جہاں وہ جلی اور واضح ہیں۔ اس طرح کی کتابوں سے نہ ہم نے کوئی نیا عقیدہ پیدا کرنا ہے اور نہ کسی عقیدے کی تاسیس کرنی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے جس کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔

*****

احادیثِ فتن اور معاصر مصری مفکرین

اس موضوع پر مصر میں بھی کام ہوا ہے، یہاں ہم اس کا جائزہ لیں گے۔ مصر میں اس کاروبار کی مد میں بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابیں چھپیں۔ کاروبار کا لفظ ازراہِ مذاق استعمال کیا گیا کیونکہ اس طرح کی کتابوں میں ایک خاص قسم کی سنسنی خیزی پھیلائی جاتی ہے کہ کیا ہونے والا ہے، اس سال کیا ہو گا، اگلے سال اور اس سے اگلے سال کیا ہو گا؟ چنانچہ اس ساری بحث کا خصوصیت کے ساتھ آغاز نوے کی دہائی میں خلیجی جنگ سے ہوا۔ اس موضوع پر مصر میں بلا مبالغہ بہت زیادہ لٹریچر چھپا ہے، جس میں ایسی باتیں کہی گئیں کہ نہایۃ العالم یعنی دنیا کا خاتمہ کب ہو گا؟ دجال اور یاجوج ماجوج کون ہیں؟ ان پیش گوئیوں کے حوالے سے لٹریچر کی کھمبیوں کی مانند افزائش ہوئی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر ان لوگوں کی کتابیں معروف ہوئیں، جو بڑے دینی عالم نہیں تھے۔ ان میں سے کوئی صحافی ہے، کوئی دانشور تو کوئی یونی ورسٹی میں استاد ہے۔ ان کا علومِ دینیہ یا علومِ نبوّت سے براہ راست گہرا تعلق بھی نہیں اور رسوخ فی العلم بھی حاصل نہیں، لیکن انھوں نے ان موضوعات پر کلام کیا اور پھر اس میں بڑی بڑی غلطیاں کیں۔ میں اجمال سے دو مصنفین کا ذکر کروں گا: محمد امین جمال الدین اور محمد عیسٰی داؤد۔ ان دو شخصیات کی ایک کتاب کے کچھ ایسے حصوں کا بطورِ نمونہ مطالعہ بھی ہو گا جو بہت زیادہ مشکلات کا باعث بنے۔ ان کی وجہ سے خاصے مسائل پیدا ہوئے اور ایسی بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں جو اس طرح کی غلط تاویلات کے نتائج میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

امین محمد جمال الدین

امین محمد جمال الدین ایک مصری مفکر ہیں۔ ان کی کتاب کے عنوان میں ان کے نام کے ساتھ لکھا ہے: دراسات أوليا في الدعوة والثقافة، كلية الدعوة الإسلامية، جامعة الأزهر، جامعۃ الازہر

سے انھوں نے یہ ڈگری حاصل کی ہے۔ ایک کتاب کے دیباچے میں ان کے نام کے شروع میں مھندس کا لفظ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے انجینیرنگ بھی کی ہو اور دعوت وثقافت کی ڈگری بھی لی ہو۔ ۱۹۹۶ء میں ان کی ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا عنوان "عمر أمة الإسلام وقرب ظهور المهدي عليه السلام" یعنی اس امتِ اسلام کی عمر اور مہدی کے ظہور کا قریب ہونا۔ یہ کتاب کافی معروف ہوئی، پاکستان میں اردو زبان میں بھی چھپی اور دیگر کئی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب پر چند لوگوں نے تنقید کی جس کا جواب انھوں نے اپنی کتاب "ردُ السهام عن كتاب عمر أمة الإسلام وقرب ظهور المهدي عليه السلام" میں دیا۔ دو سال بعد ان کی کتاب "القول المبين في الأشراط الصغرى ليوم الدين" منظرِ عام پر آئی۔ ان ساری کتابوں میں بنیادی مسائل یہ ہیں کہ ایک تو ان میں خاص طرح کی صحافیانہ سنسنی خیزی پائی جاتی ہے، پھر کمزور مراجع اور ضعیف روایات لی گئی ہیں اور مزید یہ کہ ان سے جو استدلال کیا ہے وہ بھی باطل ہے۔ تاہم اس کتاب نے کوئی بہت زیادہ تنازعے پیدا نہیں کیے۔ بلکہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے آخر میں انھوں نے کچھ احادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں ضعیف احادیث بھی شامل ہیں اور خیال ظاہر کیا کہ امتِ مسلمہ کی عمر لگ بھگ پندرہ سو برس ہے۔

امین محمد جمال الدین کی تحقیق کے ذرائع

امین محمد جمال الدین صاحب کی امتِ مسلمہ کی عمر کے حوالے سے جن کتابوں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، ان میں انھوں نے بہت سے ذرائع سے استدلال کیا ہے، جن میں Evangelical لٹریچر سرفہرست ہے۔ ان میں سے چند نام پیشِ خدمت ہیں:

جیری فال ویل

Jerry Falwell ایک مشہور ایوینجلسٹ عیسائی تھا۔ چونکہ علمِ معاد اور اپوکلپس میں دنیا کے خاتمے اور ہونے والی تباہی کی تفصیلات سے بحث ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں بھی مسیح الدجال کا تصور ہے

اور روایتی طور پر مسیحیوں کا تصور یہ تھا کہ مسیح الدجال یہودی ہو گا۔ جیری فال ویل نے مسیح الدجال کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ یہودی ہو گا۔ اس پر بہت طوفان اٹھا اور اس پر یہود دشمنی کا الزام لگایا گیا اور اتنا شدید احتجاج ہوا یہاں تک کہ اسے معذرت کرنی پڑی، اپنے موقف سے رجوع کرنا پڑا۔ اپنی صفائی میں اس نے کہا کہ در حقیقت وہ مسیح علیہ السلام اور مسیح الدجال میں مماثلتیں بیان کر رہا تھا کہ کتنے اوصاف مشترک ہوں گے۔

سائرس انگرسن سکوفیلڈ کی بائبل

اسی طرح Cyrus Ingerson Scofield کی بائبل بہت مشہور ہے جس میں اس نے ایک خاص طرح کی شرح کی ہے۔ اس سے بھی مصنف نے استفادہ کیا ہے۔

جمی سویگرٹ

اسی طرح Jimmy Swaggart ایک مشہور ایونجلیکل عیسائی ہے، جس کا نام احمد دیدات کے ساتھ مناظرے کے بعد بہت مشہور ہوا۔ یہ بھی مصنف کے مصادر میں سے ہے۔

لہذا یہ چند ذرائع ہیں جن سے امین محمد جمال الدین نے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کے آغاز میں تحریر کیا کہ مجھے یہ بات بہت پریشان کرتی ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں کہ اہلِ کتاب، خاص طور پر نصاریٰ گیت گاتے پھرتے ہیں کہ O Jesus Come یعنی وہ تو اپنے مسیح کا انتظار کر رہے ہیں اور ہمیں اپنے مہدی کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ اس کتاب میں جا بجا اہلِ تشیع کا اثر بھی بہت زیادہ ہے۔ کتاب کا زیادہ تر حصہ مہدی کی روایتوں اور ہر مجددون کے بارے میں ہے، جگہ جگہ المہدی المنتظر کا تذکرہ ہے، یہ اصطلاح خاص طور پر اثنا عشری شیعہ کی ہے۔ ان کے ہاں یہ انتظار ایک باقاعدہ عقیدہ ہے، جبکہ ہم اہل السنۃ کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ ایک خبر ہے جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور ایک تکوینی معاملہ ہے جو ہونا ہے۔ لہذا ہمیں کیا کرنا ہے اس کا دار و مدار اس پر نہیں ہے کہ مہدی آئیں گے، ہماری رہنمائی کریں گے اور جب وہ آجائیں

گے تب ہمیں ان کی قیادت میں کام کرنا ہے۔ بلکہ ہم کام کے لیے کسی کا انتظار نہیں کرتے، کیونکہ تکوینی امور کے ہم مکلف نہیں ہیں۔

امین محمد جمال الدین کی کتابوں پر تنقید بھی کی گئی لیکن پھر ان کی خوش قسمتی کہہ لیجیے کہ ۹/۱۱ کا واقعہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ستمبر ۲۰۰۱ء میں ہوا اور اکتوبر ۲۰۰۱ء کے آخر میں ان کی کتاب ''ھر مجدون: آخر بیان یا أمة الإسلام'' منظرِ عام پر آگئی۔ اس کتاب میں انھوں نے ''ہر مجدون'' کی تفصیلات بیان کیں اور امتِ مسلمہ کو مخاطب کرکے کہا کہ یہ بس آخری بیان ہے اور آخری انتباہ ہے۔ آغاز میں انھوں نے طرفۃ بن العبد کا مشہور شعر بھی نقل کیا ہے جو نبی اکرم ﷺ بھی پڑھا کرتے تھے:

سَتُبْدِي لَكَ الْأَيَّامُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا
وَيَأْتِيكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِ

''تیرے لیے زمانہ ان چیزوں کو ظاہر کردے گا، جن سے تو بالکل غافل ہے اور تجھے وہ شخص خبریں لاکر سنائے گا، جس کو تو نے کوئی زادِ راہ نہیں دیا''۔

اس کتاب میں انھوں نے ناقدین پر طعن بھی کی ہے کہ میں کہتا تھا کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے اور ہر مجدون ہونے والی ہے، تیسری عالمی جنگ بالکل قریب لگی کھڑی ہے، لیکن آپ لوگ میری بات کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے اور مجھ پر تنقید کرتے تھے، اب دیکھ لیجیے کہ سب کی تیاری مکمل ہوگئی ہے۔ یوں ۹/۱۱ کے فوراً بعد جو حالات پیدا ہوئے اس میں گویا ''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا'' کی مانند فوری طور پر ایک کتاب لکھ کر انھوں نے اس معاملے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ کتاب بالکل واہیات، منکر اور ردّی کتاب ہے اور اس میں فضول قسم کی ضعیف اور موضوع روایات نقل کی گئی ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں ایک خاص طریقۂ کار ہوتا ہے کہ ایک واقعہ جو اصلاً صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے، اس کی تفصیلات میں خالی جگہوں کو بالکل واہی، منکر اور موضوع احادیث سے پُر کر کے ایک پورا منظر نامہ تشکیل دے دیا جاتا ہے۔ ایک اور طریقۂ کار جو انھوں نے اور دیگر کئی مصنفین نے یہ بھی برتا ہے کہ جناب میرے ہاتھ میں ترکی یا فلاں جگہ سے ایک مخطوطہ آگیا اور اس میں بہت تفصیل سے چیزیں بیان ہیں۔

فرضی کرداروں کا تذکرہ

یہاں ایک کردار سفیانی کے نام سے سامنے آتا ہے، مصنف اپنی مرضی سے اس کا اطلاق بھی بتاتے ہیں۔ اس کے متعلق مصنف جو کہتے ہیں اس سے پہلے اس کا مختصر تعارف ضروری ہے۔ نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے محدث اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں سے تھے۔ انھوں نے "کتاب الفتن" مرتب کی، جس میں ان کے زمانے میں فتن کے حوالے سے جو بھی احادیث پائی جاتی تھیں ان ساری روایات کو انھوں نے جمع کر دیا۔ چونکہ اس دور میں محدثین کا معاملہ یہ ہوتا تھا کہ وہ جب کسی حدیث کو سند کے ساتھ لے آتے تو اس کے بعد گویا اس سے بری ہو جاتے تھے، کیونکہ اس زمانے میں کتابیں طالب العلم کے پاس ہی جاتی تھیں۔ عوام کے لیے نہیں ہوتی تھیں بلکہ خواص یعنی طلبہ کے لیے ہوتی تھیں اور وہی ان کتابوں کو پڑھتے، پڑھاتے تھے۔ نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بہت سی تفصیلات درج ہیں اور اصحابِ جرح و تعدیل کہتے ہیں کہ وہ اچھے اور صالح آدمی تھے، لیکن روایت کے نقل کرنے میں بہت زیادہ محتاط نہیں تھے۔ بہر حال، ان کی روایات میں ایک کردار سفیانی کے نام سے ہے جو مہدی کا دشمن ہو گا۔ یہاں امین محمد جمال الدین نے صدام حسین کو اس سفیانی کا مصداق قرار دے دیا ہے۔ چونکہ اسی طرح کی جھوٹی اور جعلی روایتوں میں اور اہلِ تشیع کے ہاں بھی اس کردار کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس پورے عنوان سے واضح ہو رہا ہے کہ اس میں وضع کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے درمیان جو دشمنی چلی، اس دوران بہت سی احادیث گھڑی گئیں۔ ابو سفیان اور بنو امیہ سے متعلق احادیث گھڑی جانا اور اس کے بعد یہ سفیانی کا کردار گھڑا جانا بہت معنی خیز ہے۔ اسی طرح "رایات السود" یعنی کالے جھنڈوں کا ایک پورا تصور ہے جس کو ابو مسلم خراسانی نے اپنے زمانے میں استعمال کیا۔ اس طرح کی روایات کہ کالے جھنڈے خراسان سے چلیں گے اور مہدی کے لیے میدان ہموار کریں گے وغیرہ، ان کا کئی بار غلط استعمال ہو چکا ہے۔ چونکہ ان معلومات کی فراہمی کے لیے امین محمد جمال الدین کو ایک مخطوطہ ملا ہے، اس کی عبارتیں وہ نقل کرتے ہیں کہ عراق الشّام میں ایک متجدّد شخص ہو گا جو سفیانی ہو گا۔ اس کی ایک آنکھ میں کچھ نقص ہو گا اور اس کا نام صدام میں سے ہو گا۔ جو اس سے لڑائی کرے گا وہ اس کے لیے بہت ہی جنگجو اور

سخت ثابت ہو گا اور پوری دنیا اس کے لیے ”کوت“ یعنی کویت میں جمع ہو جائے گی۔ اور سفیانی میں کوئی خیر نہیں ہو گی۔ چنانچہ امین محمد جمال الدین کی طرف سے ایک مکمل پیش گوئی آ گئی، جس میں صدام حسین کا نام بھی آ گیا اور کویت کا بھی۔ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ اس طرح کی کتابوں اور لٹریچر کے لکھے جانے کا آغاز پہلی خلیجی جنگ کے بعد ہوا تھا۔ میں کچھ مثالوں سے وضاحت کرتا ہوں کہ احادیث سے کس طرح کی تاویلات کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے کہ: علامة خروج المهدي ألوية تقبل من المغرب، عليها رجل أعرج من كندة. (کتاب الفتن، نعیم بن حماد) ”مہدی کے خروج کی ایک علامت یہ ہے کہ مغرب سے بریگیڈ آئیں گے جن میں ایک شخص ہو گا جو لنگڑا ہو گا اور کندہ (ایک معروف عرب قبیلہ) سے ہو گا“۔ اس کی انھوں نے تاویل کی کہ جب یہ جنگ جاری تھی اس دوران ایک امریکی کمانڈر جنرل Richard Myers اخباری نمائندوں کو بریفنگ دینے آیا تو بیساکھیوں کے ساتھ آیا۔ اس واقعے کی ویڈیو بھی بطورِ ثبوت موجود ہے۔ امین جمال الدین صاحب نے کہا کہ جب انھوں نے یہ منظر دیکھا تو سبحان اللہ کہا کہ اللہ کے نبی ﷺ کی کہی بات پوری ہو گئی۔ حالانکہ حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ یہ قول حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں ہے، بلکہ ایک اثر چلا آ رہا ہے جو کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا۔ لیکن امین جمال الدین نے مزید تاویل کرتے ہوئے کندہ کو کینیڈا بنا دیا اور رجل أعرج من كندة کو جنرل رچرڈ مائرز سے جوڑ دیا۔ دیکھیے کہ کس طرح انھوں نے بالکل ایک واہی روایت جس کا کوئی سر، پیر ہی نہیں اس کی تاویلات کر ڈالیں۔ کچھ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ: يهزم الجماعة مرتين (کتاب الفتن، نعیم بن حماد) ”یعنی وہ اپنے مخالف گروہ کو دو مرتبہ شکست دے گا اور غالب ہو گا“۔ اس کی تاویل میں انھوں نے کہا کہ مخالف گروہ جیوش الغربیہ یعنی مغربی اقوام کے لشکر ہیں، جو ۱۹۹۱ء میں بھی آئے تھے ان کو صدام حسین شکست دے دے گا۔ بہر حال، وہ بھی غلط ثابت ہوا اور تاریخ نے ان تاویلات کو بالکل باطل قرار دے دیا۔ انھی دنوں Nostradamus کا بہت چرچا تھا، ان صاحب نے بھی ناسٹریڈیمس کا کافی ذکر کیا اور یہ دعویٰ کر دیا کہ در حقیقت ہماری ہی راز کی کچھ چیزیں ناسٹریڈیمس کے ہاتھ لگ گئیں، اور یہ بھی بتایا کہ کہاں کہاں سے یہ چیزیں اس کے ہاتھ آئیں۔ ان کے بقول ناسٹریڈیمس جو کچھ کہہ رہا ہے وہ

بنیادی طور پر ہماری ہی تراث ہے، جس سے اس نے سَرقہ کیا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جب راشن دیا توان کی پونجی بھی واپس سامان میں رکھوادی۔ جب وہ گھر پہنچے اور سامان کھولا تو غلے کے ساتھ پونجی کو بھی پاکر انھوں نے ایک جملہ کہا: ﴿هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا﴾ (سورۃ یوسف:٦٥) ”یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کردی گئی ہے“۔ امین محمد جمال الدین صاحب یہ جملہ نقل کرکے گویا کہہ رہے ہیں کہ یہ ہماری پونجی تھی جس سے ہم غافل ہوگئے تھے اور یہ ایک فرانسیسی کے ہتھے چڑھ گئی، جس نے اس کو کام میں لاکر پیش گوئیاں کیں جو بہت غیر معمولی طور پر پوری بھی ہوئیں۔ اس کتاب میں وہ کہتے ہیں کہ پہلے میں یہ سب باتیں کرتا تھا کہ ہرمجدون ہونے والی ہے اور ایک بہت بڑا معرکہ الملحمۃ العظمیٰ ہونے والا ہے اور خیال کرتا تھا کہ قسم کھالوں لیکن میں ٹھہر جاتا تھا، مگر اب میں قسم کھاسکتا ہوں کہ ملاحم آخر الزمان یعنی تیسری عالمگیر جنگ ہوا ہی چاہتی ہے۔ بہت سی ردّی قسم کی روایات ہیں جن میں جیسے الرایات السود کا تذکرہ ہے، ویسے ہی الرایات الصفر کا بھی تذکرہ ملتا ہے یعنی زرد رنگ کے پرچم۔ یہ بھی ہے کہ الرایات الصفر مہدی کے لشکر کے ہوں گے اور الرایات السود مخالف لشکر کے ہوں گے۔ اس بارے میں انھوں نے کہا کہ طالبان کے خلاف جو جنگ جاری ہے اس میں کالے جھنڈے طالبان کے ہیں اور ان کی پگڑیاں بھی کالی ہیں اور نیٹو افواج کے جھنڈے زرد ہیں یوں انھوں نے پوری طرح انطباق کردیا، حالانکہ طالبان کے جھنڈے سفید ہیں۔

روایاتِ فتن کے بارے میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ اس کے الفاظ کو ہمیں حقیقت پر محمول کرنا ہے یا مجاز پر۔ بہت سی روایتوں میں تذکرہ ہے کہ آخری زمانے میں جو جنگیں ہوں گی ان میں مہدی کے لشکر گھوڑوں پر سوار لڑیں گے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ آنے والا دور گھوڑوں کا ہی ہوگا اور جو مہدی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں انھیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایک صاحب نے اس بات پر ایک طنزیہ نقد لکھی اور امین محمد جمال الدین صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں پتا لگا کہ فلاں صاحب نے جب ان کی کتاب پڑھی تو بہت متاثر ہو گئے، وہ نئی گاڑی خریدنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے وہ گاڑی نہیں خریدی، بلکہ کہا کہ اب گھوڑے ہی خریدنے ہیں، کیونکہ جو جنگیں ہونی ہیں ان میں وہی کام آئیں گے۔ ان صاحب نے تو طنز و تعریض کیا جبکہ یہ کہہ رہے

ہیں کہ ایسا ہوا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ میرے کام سے متاثر ہو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا: فقد نجح الكتاب في توصيل رسالته إلى النّاس و هذا توفيق من الله. یعنی کتاب اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہے اور یہ اللہ کی توفیق سے ہے۔

محمد عیسٰی داؤد

محمد عیسٰی داؤد ایک مصری مفکر ہیں، ان کی پیدائش ۱۹۵۷ء میں ہوئی ہے۔ انھوں نے قسم اللغات و دراساة الشرقية میں ڈگری حاصل کی اور صحافت سے منسلک ہو گئے۔ مصر میں "جريدة الأخبار" اور "الأخبار اليوم" میں کام کیا۔ پھر سعودی عرب کے مشہور اخبار "جريدة الندوة" سے منسلک ہوئے اور بہت اونچے مرتبے پر پہنچے۔ انھوں نے ان موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں، جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ ان کی ایک عظیم کتاب "الخيوط الخفية بين المسيخ الدجال وأسرار مثلث برمودا والأطباق الطائرة" کے عنوان سے ہے، یعنی المسيخ الدجال، برمودا مثلث کے اسرار اور اڑن طشتریوں کے مابین خفیہ تعلقات اور گہری باتیں۔ اسی طرح ان کی ایک اور کتاب ہے "اِحذروا المسيخ الدجال يغزو العالم من مثلث برمودا؟" یعنی المسیح الدجال سے خبردار رہو جو دنیا کو تاراج کرنے والا ہے یا مثلث برمودا سے دنیا سے جنگ میں مشغول ہے۔ اسی طرح ایک کتاب، "المفاجأة: بشراك ياقدس" ہے۔ ایک کتاب، "المهدي المنتظر على الأبواب" ہے۔ چونکہ اس طرح کے لوگوں میں اہلِ تشیع کے عقائد اور نظریات کا اثر غالب ہوتا ہے، اس لیے معلوم نہیں کہ یہ مسلکاً کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن المهدي المنتظر کا پورا طرزِ بیان اہلِ تشیع کا ہے۔ ان کی ایک اور بڑی دلچسپ کتاب، "حوار صحفي مع الجني المسلم مصطفٰی کنجور" ہے، جس میں انھوں نے بیان کیا کہ ایک جن تھا جس سے ان کا مکالمہ چلتا رہا اور پہلے وہ غیر مسلم اور کافر تھا، ان سے گفتگو کے دوران اس کو اللہ نے توفیق دے دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔

کنجور غالباً اس کا خاندانی نام تھا جب وہ مسلمان ہوا تو اس جن نے مصطفیٰ نام میں شامل کر لیا۔

محمد عیسیٰ داؤد کی تصنیفات کا جائزہ

یہاں ہمارے موضوع سے متعلق ان کی کتابوں میں سے ان کے کچھ ارشادات کا تجزیہ کریں گے۔ انھوں نے بار بار اپنی کتابوں میں المیسح کو المسیخ لکھا ہے جو بجائے خود ایک تحریف ہے۔ قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ضلّ قوم فرأوه المسیخ بالخاء المعجمة. یعنی کچھ لوگوں نے مسیح علیہ السلام اور مسیح الدجال میں تفریق کرنے کے لیے اس ک ''خاے معجمہ'' کے ساتھ و المسیخ الدجال پڑھا۔ جبکہ نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تفریق کی ہے، وہ یہ ہے کہ مسیح مسیح الھدیٰ ہیں اور مسیح الدجال مسیح الضلالة ہے۔ بہر حال، محمد عیسیٰ داؤد نے پہلی تحریف یہ کی ہے کہ نام میں ہی انھوں نے مسئلہ کھڑا کر دیا۔ پھر ان کے ذرائع بھی ویسے ہی مخدوش ہیں اور ضعیف و موضوع احادیث پر ان کا مدار ہے۔ پھر فقط اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کا ایک خاص فن ہے جس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ یہ جو ساری معلومات تم دیے جا رہے ہو اس کے مصادر کیا ہیں؟ تو کہتے ہیں: بل هناك مصادر، بہت سے مصادر ہیں۔ اس کی تفصیل میں وہ کہتے ہیں: فالقراءة الواعية، ایک تو بہت گہرا مطالعہ ہے، ثمّ استقراء الأحداث، پھر حالات وواقعات کا استقرا کرنا اور اس کے بعد، ورفع درجات حدّة الحدس والاستبصار ثمّ التدبّر والتعمّل، یعنی Intuition استبصار اور تدبّر و تعمل ہے۔ گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے غیر معمولی صلاحیتیں حاصل ہیں۔ کئی کرداروں کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے؛ مثلاً جنرل Dan Shomron ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۱ء تک اسرائیلی افواج کا چیف آف اسٹاف تھا اور اس سے پہلے ۱۹۵۶ء کی Six days war میں اپنی یونٹ کا کمانڈر تھا۔ یہ مصر پر حملہ کر کے نہر سویز کے پاس پہنچنے والا پہلا پیرا ٹروپر تھا۔ اس کی کسی تقریر کا حوالہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ مسیح الدجال کا ایک ایجنٹ ہے جو پوری دنیا میں سفر کرتا ہے، اس کی رہائش انگلینڈ میں ہے۔ اور ملکوں کے نام بھی انھوں نے بتائے ہیں کہ وہ بلغاریہ، کینیڈا اور مختلف یورپی اقوام میں سفر کرتا رہتا ہے۔ اس کا

طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے، وہاں کے بڑے بڑے موثر لوگوں کو اپنا مرید بنا کر ان کو اپنا تابع بنا لیتا ہے اور وہ پھر رجال المسیح الدجال بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے جنرل ڈین شومرون جو باتیں بتا رہا ہے تو یہ بھی اصل میں رجال المسیح الدجال سے اس نے سنی ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ یہ دجّال کا قصر رہیب مہیب ہے، یعنی اس کا ایک بہت بڑا قلعہ ہے، جو بہت ہی ہولناک، خوفناک اور دہشت ناک ہے۔ اور کہتے ہیں: لا أدري موضعه بالتهديد، کہ میں ویسے پن پوائنٹ کر کے تو نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں پر ہے، ولٰكنّي بالحدس الإسلامي اقول، لیکن جو اسلامی حدس ہے اس کے مطابق بتاتا ہوں کہ وہ فلوریڈا میں رہتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ Adam Weishaupt جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Illuminati کا بانی ہے، وہ یہودی الاصل ہے، بلکہ کہتے ہیں کہ: بل لا استبعد أن يكون هو نفسه المسيخ الدجال، اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ یہی مسیح الدجال ہو۔ کہتے ہیں: لو كان أعور العينين، اگر وہ یک چشم ہوتا، اور ولو كان معي صورة له لحددت ذلک الأمر، یعنی اگر میرے پاس اس کی کوئی تصویر ہوتی تو میں اس معاملے کی مکمل تصدیق کر دیتا۔ لیکن غالب گمان یہی ہے اگر یہ خود نہیں ہے تو یہ الصدّيق المخلص جدًا للدجّال، یعنی یہ دجال کا بہت گہرا دوست اور جگری یار ہے۔ چونکہ وہ صحافی ہیں تو انھیں فلمیں دیکھنے کا بھی کافی شوق ہے، چنانچہ اس ضمن میں ہالی وُڈ کے کچھ اداکاروں کے بارے میں بھی حضرت نے کچھ پیش گوئی کی ہے۔ اس فیلڈ میں بھی انھوں نے گویا سب کو چھانٹا، مگر قرعۂ فال Burt Lancaster اور Clint Eastwood ان دو کے نام نکلا۔ یہ دونوں امریکی اداکار تھے، وہ کہتے ہیں میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ دو حضرات بھی رجال المسیح الدجال میں شامل اور اس کے مدد گار ہیں۔

اس طرح کے لوگوں کا پراسرار جادوئی محرکات سے خاص شغف ہوتا ہے جس میں علم الاعداد اور علم الجفر شامل ہے۔ یاد رہے کہ علم الجفر غلط طور پر سیدنا جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ ان مذکورہ علوم کی بنیاد پر محمد عیسٰی داؤد نے مہدی کے حوالے سے کچھ آیات نقل کی ہیں، جو سورۂ فاتحہ کی دو

آیتیں ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ (الفاتحہ: ۵ تا ۷) ”ہم کو سیدھے رستے چلا ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا، نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا اور نہ گمراہوں کے“۔ ان آیات میں سے انھوں نے مہدی برآمد کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ یٰس کی آیت: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا﴾ (یٰس: ۳۸) ”اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے“۔ اس کے بارے میں انھوں نے کہا کہ الشمس رمز المهدي، یعنی سورج، مہدی کے لیے علامت ہے۔ اسی طرح ﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾ (یٰس: ۳۹) ”اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے“۔ اس آیت میں قمر، رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے لیے رمز ہے۔ انھوں نے خود سے مہدی کی شخصیت کا پورا نقشہ بھی کھینچا ہے کہ مہدی طویل القامت ہو گا اور اس کا قد ۱۸۰ سے لے کر ۱۹۰ سینٹی میٹر تک ہو گا۔ وہ سر پر عقال وغیرہ نہیں باندھے گا جس طرح عرب باندھتے ہیں، بلکہ وہ جدید رومی لباس پہنے گا اور اس کا رہن سہن بھی جدید شہری طرز کا ہو گا اور وہ بالکل جدید مدنیت کو اختیار کرے گا۔ یہاں آرا کا ملاپ مقصود نہیں، لیکن سید ابو الاعلی مودودی نے ”تجدید واحیاے دین“ میں یہ بات کی ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ مہدی بہت روایتی شخص ہو گا، سر پر ٹوپی اور کندھے پہ رومال پہنے گا، لیکن ان کے خیال کے مطابق وہ ایک جدید شخص ہو گا اور جدید ٹیکنالوجی میں مہارت رکھتا ہو گا۔ یہی موقف محمد عیسٰی داؤد صاحب کا بھی ہے، وہ فرما رہے ہیں کہ مہدی کو حضارة الغربية یعنی مغربی تہذیب سے کوئی اجنبیت نہیں ہو گی اور وہ اس سے بہت ملتے جلتے ہوں گے۔

آگے محمد عیسٰی داؤد ایک اور سوال اٹھاتے ہیں کہ مہدی کو مہدی کیوں کہا جاتا ہے؟ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خفیہ معاملات کو برآمد کریں گے اور اصل تورات اور انجیل کو سامنے لے کر آئیں گے۔ آپ کے علم میں ہے کہ کانسپیریسی تھیورسٹ کی یہ عمومی رائے ہے کہ اصل چیزیں گم ہیں اور اس وقت جو کچھ دنیا میں نظر آ رہا ہے وہ نظر کا دھوکا اور سراب ہے۔ حقیقت میں کچھ Elders of Zionists بیٹھے ہیں اور Illuminati کا ایک آرڈر ہے جو ہر چیز کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے محمد عیسٰی داؤد صاحب نے تو ایک

پوری کتاب مرتب کرکے بتا بھی دیا کہ جو برمودا مثلث ہے یہی اصل میں دجال کا ہیڈ کوارٹر ہے اور یہاں بیٹھ کر وہ پوری دنیا کو کنٹرول کرتا ہے۔ اسی طرح صحیح حدیث میں بیان ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ وہ شدید غضب کی وجہ سے خروج کرے گا۔ اسی طرح ہمارے بڑے بڑے علما نے فرمایا ہے کہ شاید قسطنطنیہ کی حکومت اس کو اشتعال دلائے گی، جس سے غضبناک ہوکر وہ خروج کرے گا، یعنی جسمانی طور پر ظاہر ہوجائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میری یہ کتاب "احذروا: المسيخ الدجال يغزو العالم من مثلث برمودا" بنیادی طور پر بجائے خود دجال کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ وہ اپنی اس کتاب کے متعلق کہتے ہیں: لأنّ هذا الكتاب بلا شک و إن شاء الله، هو أوّل كتاب يعرض المسيخ عاريًا في كلّ شيء في فكره، في تصوراته، في تحركاته، في أماكنه الخفية وعلاقاته. "یہ پہلی کتاب ہے جس نے مسیح کو بالکل برہنہ کرکے واضح کر دیا ہے، اس کی ہر چیز کو، اس کی فکر، اس کے تصورات، اس کی حرکات و سکنات، اس کی خفیہ جگہیں جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا اور جہاں سے دنیا پر حکمرانی کر رہا تھا"۔ حضرت کے مطابق ان کی یہ کتاب ہی گویا دجّال کو غضبناک کرکے اسے خروج کروائے گی۔ مزید بھی کچھ لطیفے کی باتیں انھوں نے بیان کی ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ مسيخ الدجال کو دنیا میں آئے چالیس سال ہو چکے ہیں، اس کی پیدائش بھی عجیب طریقے سے ہوئی ہے کہ جس میں وہ انسان اور شیطان کے ملے جلے نطفے سے پیدا ہوا ہے، گویا یہ خليط بين الإنس والشيطان ہے۔ اس حوالے سے مزید کچھ فضول باتیں بھی انھوں نے کی ہیں، کہتے ہیں: والمسيخ صدّيق شخصي لإبليس والعكس صحيح، یعنی جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسیح ابلیس کا بالکل گہرا دوست ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے اور اس کا عکس بھی ٹھیک ہے کہ ابلیس مسیح کا گہرا دوست ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دنیا کو کنٹرول کر رہے ہیں، فرق یہ ہے کہ ایک مرئی ہے اور دوسرا غیر مرئی ہے، یعنی ابلیس تو جنات میں سے ہے اور مسیخ الدجال ہائبرڈ ہے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق دجّال انسان اور جن کا ملغوبہ ہے، اس وجہ سے اس کے اندر غیر مرئیت بھی ہے اور ایک طبیعی پن بھی۔ ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں: اس کی عمر غالبًا پندرہ سو سال ہو چکی ہے اور وهو الشبيه البشري بإبليس، یعنی وہ ابلیس کی انسانی شکل ہے، جبکہ وہ دونوں ایسے ہی ہیں جیسے ایک قالب اور دو روح یا الٹا بدل لیں تو ایک روح دو قالب۔ کبھی

کہتے ہیں کہ وہ یمن کی پیداوار ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ عراق کی پیداوار ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ دجال اصل میں سامری ہے۔ یہ بات کئی لوگوں سے منسوب ہے۔ انڈیا کے ایک مفکر اسرار عالم نے بھی یہ بات کہی ہے اور دیگر بہت سے لوگوں نے اس نظریے کو اپنایا ہے کہ سامری ہی دجال ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ تُخْلَفَهُ﴾ (طٰہٰ:۹۷) "(موسیٰ نے کہا: جا تجھ کو دنیا کی زندگی میں یہ (سزا) ہے کہ کہتا رہے کہ مجھ کو ہاتھ نہ لگانا اور تیرے لیے ایک اور وعدہ ہے (یعنی عذاب کا) جو تجھ سے ٹل نہ سکے گا"۔ تو اس وعدے کو لے کر لوگوں نے عجیب عجیب نظریات گھڑے ہیں کہ سامری ابھی تک زندہ ہے اور وہی دجال ہے۔ محمد عیسیٰ داؤد کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مصر سے نکال دیا تھا، اب وہ دوبارہ نکلے گا۔ چونکہ مصنف خود مصری ہیں تو کہتے ہیں کہ آخری دور میں ملک مصر میں مہدی کے ارد گرد اس کے کمانڈوز ہوں گے اور یہ سامری یعنی دجال مصر کی قوم سے بدلہ لے گا۔ مزید کہتے ہیں کہ مسیخ الدجال نے فراعنۂ مصر سے تعلیم حاصل کی اور ان سے کہانت، علمِ نجوم، سحر، ہندسہ، طب، نباتات، حیوانات، فزکس اور کیمیا کا علم حاصل کیا۔ پھر اس نے کئی ملکوں کا سفر کیا ان کے بااثر افراد کو متبنّی بنالیا اور رام کر لیا۔ مزید لکھتے ہیں کہ سیظهر فی ثوب حاکم أو رئيس دولة وغالباً ستكون الولايات المتحدة الأمريكية. یعنی وہ ایک حاکم کے لباس میں ظاہر ہو گا یا کسی ملک کے صدر کے طور پر اور غالب امکان ہے کہ امریکہ کے صدر کے طور پر ظاہر ہو گا۔ کہتے ہیں کہ ابلیس اور دجال کے مابین ایک معاہدہ طے ہے جو لکھا ہوا ہے اور ان میں طے ہوا تھا کہ دجال ابلیس کے لیے برمودا مثلث کے قریب ایک بڑا محل بنوائے گا تاکہ وہ مل کر سارے معاملات کریں۔ کہتے ہیں کہ دجال کی بہت سی کتابیں اور مذکّرات میرے ہاتھ لگ گئے اور یہ باتیں مجھ پر کھل گئیں۔ اس کی بہت سی کتابیں اور مخطوطے ہالی وُڈ بھی پہنچ گئے اور ان پر ہالی وڈ میں فلمیں بھی بنیں اور دیگر مختلف کام بھی ہالی وڈ میں کیے گئے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ Arrivals کے نام سے اس موضوع پر ایک سیریز بھی بنی تھی جس میں دکھایا گیا کہ میڈیا انڈسٹری، ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں اور فلموں میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کچھ خفیہ پیغام دیا جا رہا ہے۔ کچھ آڈیوز کو چلا کر یہ دکھانے کوشش کی گئی کہ اس میں شیطان کی پوجا ہو رہی ہے اور مختلف بڑے بڑے اداکاروں اور

گلوکاروں کے بارے میں بتایا کہ وہ شیطان کے پجاری ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہو تا بھی ہو، ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سارا غلط ہے، لیکن اس سے ایک خاص طریقے سے نظریات گھڑے گئے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ دجال نے بہت ضخیم تحریریں لکھ رکھی ہیں تقریباً دس مجلّدات ہیں اور ہر مجلد دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور ہر مجلد میں اس نے ایک اختتامیہ لکھ رکھا ہے۔ پہلے پانچ مجلدات کا عنوان ہے: "عند ما أملك الدنيا" یعنی جب وہ دنیا پر غلبہ پا لے گا اور حکومت اس کے پاس آئے گی، اس کی تفصیلات ان پانچ مجلدات میں ہے۔ دوسری مجلدات میں ہے کہ یوم يقوم الكون في قبضتي والكرة الأرضية مكتبي. یعنی وہ دن کہ جب پوری کائنات میرے قبضے میں ہوگی اور کرۂ زمین میرا دفتر بن جائے گا۔ اسی طرح محمد عیسیٰ داؤد نے "احذروا: المسيخ الدجال يغزو العالم من مثلث برمودا" میں اڑن طشتریوں پر بہت طویل گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ اڑن طشتریاں اور UFOs دجال کے زمین کی نگرانی کے ذرائع ہیں۔ کہتے ہیں: وأقسم بالله غير حانث أنّهم من هذه الأرض ومن أبناءها،ولكنّهم رجال المسيخ الدجال، وتلك الأطباق الطائرة من اختراعه الّذي سبق به زماننا بقرون. یعنی اڑن طشتریوں میں جو لوگ ہیں، میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں اس میں حانث نہیں ہوں گا کہ اسی زمین سے ان کا تعلق ہے اور وہ اسی زمین کے مکین ہیں، لیکن وہ مسیح الدجال کی فوج ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو ابھی خلائی جہاز وغیرہ بنائے ہیں، یہ اڑن طشتریاں اور اڑن کھٹولے دجال کی ٹیکنالوجی ہیں جو وہ بہت پہلے ایجاد کر چکے ہیں اور اس میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔

محمّد عبدہ

اسی طرح ہمارے ہاں جو لوگ Early Modernist کہلاتے ہیں ان میں محمّد عبدہ ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ انھوں نے دجال کے بارے میں لکھا ہے کہ دجال خرافات، دجل اور قباحتوں کا ایک Symbol ہے، یعنی یہ کوئی متعیّن شخص نہیں ہے۔

* * * * *

علاماتِ قیامت اور برصغیر کے مفکرین

نعمت شاہ ولی کی پیش گوئیاں

ہمارے ہاں پاکستان، انڈیا وغیرہ میں نعمت شاہ ولی کی پیش گوئیوں کی شہرت ہے۔ جب افغانستان پر روس کا حملہ ہوا، اُس موقعے پر بھی ان کی پیش گوئیاں سامنے آئیں۔ پھر اُس کے بعد جب ۱۹۹۱ء میں پہلی گلف وار ہوئی، اس وقت بھی سامنے آئیں۔ اور بعد میں جب ۹/۱۱ کا واقعہ ہوا اس وقت بھی آئیں اور یہ بار بار آتی رہیں۔ یہ بزرگ تقریباً ۷۳۰ھ میں حلب میں پیدا ہوئے اور عراق میں پرورش پائی۔ چوبیس برس کی عمر میں مکہ معظّمہ چلے گئے، سات سال وہیں قیام پذیر رہے۔ شیخ عبداللہ جو کہ ایک بڑے عالم اور صوفی تھے، ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور سلوک کے مراحل طے کیے اور پھر ان سے اجازت ملی۔ اس کے بعد مختلف علاقوں میں رہے اور تقریباً ۸۳۴ھ میں ایک سو چار سال کی عمر میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کا فارسی زبان میں ایک قصیدہ ہے جو بہت معروف ہے اور ایسے مواقع پر سامنے آتا ہے۔ لیکن مختلف مواقع پر اس میں اضافے بھی ہوتے رہتے ہیں، گویا اس کے مختلف ورژن سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں برصغیر میں جب پہلی مرتبہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہوئی، جس کو غدر بھی کہا جاتا ہے، تو پہلی مرتبہ ان کے قصیدے کا ایک ورژن سامنے آیا۔ پھر اس کا ایک اور ورژن کچھ ترامیم کے ساتھ جب جنگِ عظیم ختم ہوئی اُس وقت سامنے آیا۔ اس قصیدے میں جو سلطانِ ترکی ہے اُس کی یلغار اور خلافتِ عثمانیہ کی نشأۃ ثانیہ کے متعلق پیش گوئیاں موجود تھیں۔ اور تیسری مرتبہ ۱۹۴۸ء میں اس کا ایک نیا ورژن سامنے آیا، جب بھارت نے حیدر آباد دکن پر حملہ کر دیا تھا اور اس میں ایسے اشعار تھے جس سے لگتا تھا کہ جو سلطنتِ آصفیہ ہے اُس کا جھنڈا پورے ہندستان پر اور لال قلعے پر لہرائے گا۔ اور اُس کے بعد پھر ۱۹۷۱ء کا حادثہ ہوا تو پاکستان کے حوالے سے بھی

ایک ورژن سامنے آیا۔ اُس کے بعد ۹/۱۱ ہوا تو پھر ایک نیا ورژن سامنے آگیا۔ اور یہ اپڈیٹ بھی ہوتا جارہا ہے، یعنی جیسے وہ جو ایک بزرگ تھے گویا یہ بھی ایک ان کی کرامت ہی میں شمار کرنا چاہیے کہ ان کا قصیدہ لمبا ہوتا جارہا ہے۔ اسی طرح جب بھی کوئی ایونٹ ہوتا ہے تو نعمت شاہ ولی کا قصیدہ سامنے آتا رہتا ہے۔ حالانکہ اصل قصیدے میں بہت سی چیزیں نہیں پائی جاتیں۔ ان کے اصل قصیدے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

قدرتِ کردگار می بینم

حالتِ روزگار می بینم

”میں پروردگار کی قدرت دیکھ رہا ہوں اور یہ جو دنیا کے حالات ہیں انھیں دیکھ رہا ہوں“۔

بہر حال، ان کی پیش گوئیاں کافی معروف تھیں، لیکن اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب کوئی واقعہ ہوتا ہے تو بالکل عین موافق اُن الفاظ کے ساتھ ملکوں کے نام اور بعض اوقات لیڈروں تک کے نام اس میں آجاتے ہیں۔ یہ اصل میں فراڈ ہے۔ مثلاً اُس میں جاپان کا تذکرہ ہے، حالانکہ جاپان کا یہ ایک نیا نام ہے جو تقریباً بارہ سو پچانوے عیسوی میں پڑا ہے اور اس سے پہلے اُس کا نام نیپون تھا یا کوئی اور نام تھا۔ لیکن قصیدے میں جاپان والا نام لیا گیا ہے، تو ان چیزوں میں بہت زیادہ جعل سازی کا عمل بھی پایا جاتا ہے۔ چونکہ ہم نے پہلے ہی کہا ہے کہ لوگوں کے اندر اس طرح کی چیزوں کے لیے ایک لذت رکھ دی گئی ہے، اس لیے وہ ان چیزوں کے درپے ہوجاتے ہیں اور ان ہی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

اسرار عالم: تعارف اور تصنیفات کا جائزہ

نعمت شاہ ولی کے بعد برصغیر پاک وہند سے جس دوسرے مفکر کے افکار کا ہم مطالعہ کریں گے، وہ ہیں اسرار عالم، یہ ایسے صاحب ہیں کہ عرب وعجم میں، مصر اور سعودی عرب میں اور دنیا میں جہاں بھی لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے جو تاویلات کیں اور نئی چیزیں نکالیں، وہ سب ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ یہ برصغیر ہی کا اعجاز ہے کہ وہاں ایک ایسی عظیم ہستی پیدا ہوئی۔ ابھی میں جب ان کے افکار کا تھوڑا سا تعارف کراؤں گا تو آپ متحیر رہ جائیں گے کہ ’ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!‘۔

ان صاحب کا تعلق بھارت کے علاقے جھارکھنڈ سے ہے۔ ان کے بارے میں زیادہ معلومات میسر نہیں ہیں۔ شاید نئی دہلی میں رہتے ہیں اور جماعتِ اسلامی سے متعلق رہے۔ کئی زبانوں کے جاننے والے ہیں خاص طور پر قدیمی زبانیں عبرانی، سریانی، عربی، فارسی اور بہت سی زبانیں۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے انگریزی جریدے Radiance سے منسلک رہے اور کچھ عرصہ اس کے مدیر بھی رہے۔ بھارت میں اسلامی فقہ اکیڈمی میں توسیعی خطبات بھی دیتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک سیریز "عالمِ اسلام کی صورتِ حال" کے عنوان سے تھی، جس میں عالمِ اسلام کی اخلاقی صورتِ حال، عالمِ اسلام کی روحانی صورتِ حال، عالمِ اسلام کی سیاسی اور معاشی صورتِ حال شامل ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق ان کی تصنیفات وہ ہیں جو دجّال پر لکھی گئیں۔ فتنۂ دجال پر انھوں نے کافی کام کیا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ غالبًا ان میں سے ایک "یا ساریة الجبل، کیا دجال کی آمد آمد ہے؟" اس موضوع پر ان کی پہلی کتاب تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔ یہ کتاب اکتوبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دجال کے نام سے ایک سیریز ہے جس کے تین حصے ہیں: پہلا حصہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا، دوسرا دسمبر ۲۰۰۱ء میں اور تیسرا ابھی اس کے ساتھ ہی منظرِ عام پر آگیا۔ اس کے بعد "فتنۂ دجالِ اکبر، خطرات و تدابیر" کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں ایک کتاب آئی۔ بعد ازاں اسی سیریز میں دو مزید کتابیں شائع ہوئیں، جن کا عنوان "معرکۂ دجالِ اکبر، تفکیر، تدبیر و تعمیل" تھا۔ اس کی پہلی جلد ۲۰۰۴ء میں اور دوسری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ پھر ایک لمبا عرصہ وہ منظرِ عام سے غائب رہے جس کے بعد ۲۰۱۳ء میں ان کی کتاب "سرسید کی بصیرت" شائع ہوئی، جس کا موضوع دجال سے متعلق تو نہیں ہے، مگر ان کے دجال سے متعلق خیالات دہرائے جاتے ہیں۔

یہ صاحب ایسے ہی ہیں جیسے ہمارے ہاں کانسپیریسی تھیورسٹ ہوتے ہیں، اور امریکہ نے ایسے بہت سے کانسپیریسی تھیورسٹ پیدا کیے۔ جب سے کورونا وائرس کا کھیل کھیلا جا رہا ہے بہت سے سازشی نظریات آرہے ہیں۔ ان میں ایک معروف نام David Icke کا ہے جو لگ بھگ تیس سال سے اسی شغل میں مبتلا ہیں۔ لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ اگر ہمارے آنجناب اسرار عالم صاحب کی یہ کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر مغرب پہنچیں، تو یہ سارے بڑے بڑے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت کرلیں گے اور ان کے مرید ہو جائیں گے۔

اتنی گنجلک چیزیں اور اتنی گھن چکر باتیں انھوں نے بیان کی ہیں کہ آدمی بالکل متحیر رہ جاتا ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ ابھی جب میں دوبارہ ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا تو دیر تک میں متحیر ہی بیٹھا رہا کہ ان کا خلاصہ بیان کروں تو کیسے کروں۔ اتنی درجہ بندیاں، مراتب اور مقامات وہ بناتے ہیں کہ سجھائی نہیں دیتا کہ بات کو کہاں سے پکڑا جائے۔ وہ پیش لفظ جو ان کے بنیادی مقدمے اور فکر کے طور ہر کتاب کے شروع میں دہرایا جاتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں پیش کروں، تاکہ یہ عیاں ہو کہ بظاہر وہ اپنی دانست میں اخلاص سے یہ سب کام کر رہے ہیں۔ یہ ان کا وہ پیش لفظ ہے جو ۲۰۱۳ء میں چھپنے والی آخری کتاب کے شروع میں بھی لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”حامداً و مصلیاً! نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی امت بنی نوعِ انسان میں وہ آخری امت ہے جو منصبِ شہادت پر فائز کی گئی ہے، چنانچہ پوری انسانیت کی کامیابی کا انحصار اب اسی گروہ پر ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی تک آتے آتے یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ امت تاریخِ انسانی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا: ”عن قریب قومیں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بلاوادیں گی جیسے بھوکے (جانور) کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بلاوا دیتے ہیں“ (ابوداؤد و بیہقی)۔ اس اندوہناک صورتِ حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امتِ مسلمہ جو دنیا کا وہ واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال، مستقبل کا کافی علم (ما کان وما هو کائن) دیا گیا ہے (ان کا ایک کتابچہ ”ما کان وما یکون“ کے نام سے بھی ہے)۔ آج حیران اور ناواقف بھٹک رہی ہے اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثارِ قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتا تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، گویا کوئی ہار ٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں۔ (یہ حدیث کی طرف اشارہ ہے) ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن واحادیثِ مبارکہ کی روشنی میں امت کی صورتِ حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو صحیح زاویے سے دیکھا جائے اور آئندہ کے لیے خطوط کار کی نشاندہی کی جائے، تاکہ یہ امت اپنے فرضِ منصبی کو کماحقہ سرانجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ چنانچہ انھی امور کو پیشِ نظر رکھ کر سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت بحث کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے، إِنه سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ“۔ (سرسید کی بصیرت، ص:۷)

اسرار عالم صاحب کا طریقۂ کار: اسلاف اور دینی روایت کی تحقیر

اسرار عالم صاحب کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک انسانیت اور انبیا کی تاریخ کو مستند و مسلمہ روایت سے ہٹ کر اپنے مخصوص زاویے سے بیان کرتے ہیں، جیسے اقبال کا ایک شعر ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

اسرار عالم صاحب اسی طرح دنیا کی تاریخ کو دیکھتے ہیں، تو وہ ابلیس اور آدم علیہ السلام کے واقعے سے آغاز کرتے ہیں، کہ اسی زمانے میں گویا ابلیس دجال تھا۔ پھر نوح علیہ السلام کے زمانے میں دجال کا ظہور ہوا۔ پھر ہر دور میں اس کا ظہور ہوتا رہا اور اس سلسلے میں انھوں نے دیگر انبیا کے تذکرے بیان کیے کہ ان کے ادوار میں بھی دجال کا ظہور ہوا، یہاں تک کہ سیدنا موسی علیہ السلام کے دور میں دجال کا ظہور ہوا وہ سامری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جیسے کہ محمد عیسیٰ داؤد کے تذکرے میں آیا کہ انھوں نے بھی یہی بتایا کہ سامری بھی دجال تھا، لیکن انھوں نے بہت تفصیل سے اس پر کلام کیا اور بتایا کہ ﴿لَا مِسَاسَ﴾ کیوں کہا گیا اور ﴿مَوْعِدًا﴾ سے کیا مراد ہے۔ پھر اس کی تفصیل میں کہا کہ سامری ہی دجال تھا۔ اس طرح یہ دجال کا سلسلہ موجودہ زمانے تک چلتا آرہا ہے اور آج تک دجال دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے، ہر چیز اس کے قابو میں ہے۔ پھر بتایا ہے کہ وہ کہاں پر رہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ قرآنِ مجید کی گویا ایک تفسیرِ اشاری کر رہے ہیں۔ جیسے پہلے بیان ہوا کہ ان کی تحقیق میں ہندسے کے علم کا خاصا تذکرہ ہے اور مختلف نبوات اور پیش گوئیاں درج ہیں، جن کی تاویلات بھی کر دی گئی ہیں۔ بہر حال، مختلف لوگوں کے ہاں مختلف چیزیں الگ الگ بیان ہوئی ہیں۔ اسرار عالم صاحب کا خاصہ یہ ہے کہ ان کے ہاں وہ سب کچھ میسر ہے اور اتنا کچھ واہی تباہی بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ شمار میں نہیں آتا کہ کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ اگر میں ان کے عنوانات ہی پڑھنا شروع کر دوں تو آپ سوچ میں پڑ جائیں گے کہ یہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی بیان کردہ ”کوبی مقتدرہ“ کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ ان کے خیال میں یہ مقتدرہ دجال اور ابلیس کے گٹھ جوڑ سے وجود میں آئی ہے اور دنیا پر حکومت کر رہی ہے اور اس کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ یہ جو

انھوں نے فضول، بے کار باتیں کیں اور ردّی کلام کیا ہے، اس پر سوال اٹھتا ہے کہ یہ سب وہ کیوں کر رہے ہیں؟ یعنی ایک فردِ واحد اتنی ساری باتیں بیان کر رہا ہو اور بولتا چلا آ رہا ہو، آخر اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے، کہ اس قبیل کے تمام گمراہ لوگ جو ہمارے سامنے آئے ہیں اور جن کے ذریعے بڑی گمراہیاں پھیلی ہیں، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعے اس امت کی تاریخ کو بدنام کریں۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ہمارے استاد بار بار سنایا کرتے ہیں کہ: ''دین نام ہے دو چیزوں کا، فکرِ آخرت اور اعتماد علی السلف''۔ اگر آپ بغور جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ہر نئے یا پرانے دور میں جتنی بھی گمراہیاں آئیں، ان سب کے پیچھے دنیا پرستی اور نفس پرستی ہے۔ جبکہ دنیا پرستی و نفس پرستی کے اس منصوبے کی تکمیل میں رکاوٹ ہمارے علوم نبوت، اسلاف اور ہماری دینی روایت ہے۔ تو یہی وجہ ہے کہ ہر ایسا شخص جو ایک نئی آواز بلند کرتا ہے یا ایک نیا علم لے کر سامنے آتا ہے، امت کی تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کا مسیحا اور درد کا درماں بن کر آتا ہے، اس کا طریقۂ کار یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مذہب، اسلاف اور دینی روایت کو نشانہ بنائے۔ اگر آپ نو آبادیاتی دور سے جائزہ لینا شروع کریں تو پہلے سر سید ہیں، پھر علامہ اسلم جیراج پوری، غلام احمد پرویز، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور دیگر کئی شخصیات ہیں، سب کا یہی طریقۂ کار ہے۔ خصوصاً علامہ عنایت اللہ مشرقی بہت دلچسپ شخصیت ہیں، ایک زمانے میں وہ تقریریں کیا کرتے تھے اور بڑے پر جوش انداز میں کہتے کہ بس پانچ لفظ ہیں، کُل بات ان کے اندر ہے۔ یہ کہہ کر وہ بڑی سنسنی پیدا کرتے اور آخر میں بتاتے کہ وہ پانچ لفظ ہیں کہ: ''مولوی کا مذہب غلط ہے''۔ اسی نام سے ان کی ایک تحریر بھی ہے جسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح آج بھی اس طرح کے گمراہ کن افکار کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان میں ہماری مذہبی روایت پر حملہ ہوتا ہے اور ہمارے علما اور مولویوں کے لیے کوئی سی بھی توہین آمیز اور استخفافی اصطلاح استعمال کر کے ان کی تحقیر کی جاتی ہے۔

''امت کا بحران، تفکیر، تدبیر اور تعمیل'' سے چند اقتباسات کا جائزہ

اب اسرار عالم صاحب کی کتاب ''امت کا بحران، تفکیر، تدبیر اور تعمیل'' میں سے کچھ اقتباسات پیشِ خدمت ہیں، جن سے آپ کو ان کے طریقۂ کار کا اندازہ ہو سکے گا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہر دور میں امتِ مسلمہ، انبیا

اور دین اللہ کے دو حقیقی دشمن ہوا کرتے ہیں اور رسولوں کو ان دو محاذوں پر مسلسل چیلنج کا سامنا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے خارجی محاذ، جس میں انبیا اور صالحین کے مقابلے میں ابلیس، دجالِ اکبر، شیاطین اور منکرین حق صف آرا ہوتے ہیں، جن کو حزب الشیطان بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرا ہے داخلی محاذ، جس میں مذہبی حکمران، مذہبی علما اور مشائخ، اللہ کے دین کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ یہی صورتِ حال امتِ مسلمہ محمدیہ کی بھی ہے، خارجی محاذ پر ابلیس، دجال وغیرہ اور داخلی محاذ پر علما ہیں۔ اللہ، دین اللہ، انبیاء اللہ اور امتِ مسلمہ کو ان دو گروہوں سے خطرہ ہے۔ (امت کا بحران، تفکیر، تدبیر اور تعمیل، ص: ۱۰) اس کے بعد وہ ایک تمثیل بیاں کرتے ہیں کہ ذرا سوچیں کہ رات کا پہر ہے گھر کے مکین سو رہے ہیں، پہرے دار پہرہ دے رہے ہیں، کوئی کھٹکا ہوتا ہے تو مکینوں میں سے کوئی اٹھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ بھئی آواز کیسی تھی، کوئی چور تو نہیں تھا؟ باہر سے پہرے دار جواب دیتا ہے کہ کوئی چور نہیں ہے، سب ٹھیک ہے، ہر چیز محفوظ ہے اور بار بار کھٹکا ہونے پر یہی جواب ملتا ہے، اتنی دیر میں چند راہ گیر وہاں سے گزرتے ہیں اور مکینوں اور پہرے داروں کو مطلع کرتے ہیں کہ آپ کے گھر کی پشت پر چوروں نے نقب لگا لی ہے اور گھر کا سامان چوری کر کے لے جا رہے ہیں۔ اس پر پہرے دار، راہ گیروں کو ملامت کرتے ہیں اور مکینوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ سب کچھ محفوظ ہے، کوئی چور داخل ہوا نہ کسی شے کی چوری ہوئی، نہ دیوار میں نقب لگائی گئی اور نہ ہی کوئی چیز غائب ہوئی۔ کہتے ہیں ایسی صورتِ حال میں دو ہی امکانات ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ پہرے دار سچے ہیں، دیانت سے اپنا سارا کام کر رہے ہیں اور درست کہہ رہے ہیں کہ قطعاً کوئی نقب لگی ہے نہ کوئی چوری ہوئی ہے، بلکہ راہ گیروں کو غلطی لگی ہے۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ واقعی چوری ہوئی ہے، تو ایسا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہرے دار چوروں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس میں چور تشبیہ ہے ابلیس، دجال اور حزب الشیطان کے لیے اور پہرے دار تشبیہ ہیں علما، مشائخ اور حکمرانوں کے لیے اور وہ راہ گیر جو آکر اطلاع دیتے ہیں کہ نقب لگائی جا رہی ہے، ڈکیتی ہو رہی ہے وہ مخلصین اور مصلحین ہیں۔ (امت کا بحران، تفکیر، تدبیر اور تعمیل، ص: ۱۴ تا ۱۵)

گویا اسرار عالم جیسے 'مخلص' لوگ توجہ دلا رہے ہیں، لیکن آپ کے پہرے دار ان کو ملامت کر رہے ہیں۔ مزید کہتے ہیں کہ دین اللہ، رسول اللہ، قرآن، سنت اور سیرت، ان سب کے تعلق سے ان کے دعووں

کی حقیقت یہ ہے کہ ”کوکبی مقتدرہ“ ۱۶۶ء سے اب تک اپنی عظیم منصوبہ بند اور مسلسل کی جانے والی سازشی کارروائیوں کے نتیجے میں اس موقعے پر پہنچ گئی ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس نے ان پندرہ سو سالوں کے دوران اسلام، رسول اللہ، قرآن، سنتِ رسول اور امتِ مسلمہ کی حقیقت کے حتمی اور اصلی ثبوت اور آثار کلیتاً مٹا دیے ہیں۔ (امت کا بحران، تفکیر، تدبیر اور تعمیل، ص:۱۵)

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ”کوکبی مقتدرہ“ آخر ہے کیا، جسے اسرار عالم صاحب نے جابجا ذکر کیا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں تو اس کی تفصیل اسرار عالم صاحب کی کتاب ”معرکۂ دجالِ اکبر، تفکیر تدبیر اور تعمیل“ جلد دوم میں درج ہے۔ اس میں سب سے اوپر ابلیس ہے، پھر دجالِ اکبر، شیاطین ماورائے ارضی ہیں، یہاں تک ایک درجہ بندی ہے۔ اس سے نیچے متبع مخلوقات ماورائے ارضی ہیں، پھر خنزیر، مثیلِ دجالِ اکبر (ارضی)، معمولِ دجالِ اکبر (ارضی)، متلقی دجالِ اکبر (ارضی)۔ اس سے آگے رئیس الرؤسا (شیخ شیوخ) یا Chief of the Elders، رئیس رؤسائے جولہ، رئیس الرؤسائے طور، رئیسِ مجلس علیا (برسرزمین) رئیسِ تفکیر علیا، رئیسِ تدبیر علیا، رئیسِ مجلسِ تعمیل علیا، رئیسِ مقتدرہ تعمیلی، رئیسِ مقتدرہ مجلسِ تنفیذی، رئیسِ مقتدرہ تنفیذی (متبادل)، رئیسِ مقتدرہ تعمیلی (متبادل) اور یوں سلسلہ آگے چلتا ہے۔ اس میں کل ملا کر چھیاسٹ درجے ہیں، جن میں سے تقریباً اٹھارہ درجے میں نے ذکر کیے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ وہ کوکبی مقتدرہ ہے جس نے امتِ مسلمہ سے ان کی پوری دینی روایت چھین لی ہے۔ (معرکۂ دجالِ اکبر، تفکیر، تدبیر اور تعمیل، ج:۲، ص:۵۸) وہ بیان کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ پندرہ سو سالوں میں ہر لمحہ، ہر مکان، ہر موڑ پر ”کوکبی مقدرہ“ کو اپنے اس مشن کی تکمیل میں مذہبی حکمرانوں، مذہبی علما اور مذہبی مشائخ کا عملی تعاون حاصل رہا ہے۔ امتِ مسلمہ کے مذہبی حکمران، مذہبی علما اور مذہبی مشائخ ہی دراصل ان کے اصل آلۂ کار ہیں۔ ۱۶۶ء کے بعد مسلمانوں میں چھپے یہودی علما اور یہودی شیاطین کے ذریعے اور بعد میں باضابطہ معرضِ وجود میں آئے مذہبی حکمرانوں، مذہبی علما اور مذہبی مشائخ کی عملداری میں اس کام کو سرانجام دیا گیا ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ سب کچھ لٹ گیا ہے، امتِ مسلمہ تہی دامن ہو چکی ہے، امتِ مسلمہ کے پاس فی الواقع دین اللہ کی تاریخی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ان کے دلوں میں جاگزین ایمان کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا، دین اللہ

کے دشمنوں نے سارے نشانات مٹا دیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب یہ سب ہو رہا تھا تو دجالی قوتوں کو ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں اور یہ چیزیں منکشف نہ ہو جائیں۔ ان دجالی قوتوں کو یہ خوف تھا کہ امت کو کہیں معلوم نہ ہو جائے کہ ان مذہبی حکمرانوں، مذہبی علما، مذہبی مشائخ کے ذریعے ''کوبکی مقدرہ'' نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک جانب اسلام کی بجائے اسی نام پر ایک جعلی مذہب تشکیل دے کر رائج کر دیا ہے اور دوسری جانب اسلام، قرآن، رسول اللہ اور امتِ مسلمہ کی ایک ایک حتمی نشانی کو روے ارضی سے مٹا دیا گیا۔ اصل مذہب تو ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ایک جعلی مذہب کی تشکیل کی گئی ہے۔ اس کوشش میں ۶۶۱ء اور ۹۰۰ء کے درمیان پائے جانے والے اکثر مذہبی حکمران، مذہبی علما اور مذہبی مشائخ کوبکی مقدرہ کے ساتھ برابر کے شریک رہے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ اپنی کتاب ''امت کا بحران، تفکیر، تدبیر اور تعمیل، ص:۱۶تا۱۸) میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہودیت کی تابعیت میں اس مذہبی، مسلکی اور مشربی اسلام کو موثر اور مدلل بنانے کے درج ذیل اقدامات کیے گئے ہیں:

۱۔ غیر دینی تفسیرِ قرآن ۲۔ جعلی سنّت ۳۔ احادیث

۴۔ غیر دینی، غیر ربانی، غیر قرآنی، غیر نبوی فقہِ اصغر اور فقہِ اکبر

۵۔ غیر دینی، غیر ربانی، غیر قرآنی، غیر نبوی تصوّف

۶۔ جعلی اور تراشیدہ خراشیدہ تاریخِ اسلام اور تاریخِ امت

اسرار عالم صاحب کی کتاب ''سر سید کی بصیرت'': چند اقتباسات

اب ہم ان کی ماضی قریب میں چھپنے والی کتاب ''سر سید کی بصیرت'' کا کچھ تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری ۲۰۱۳ء میں چھپا، پھر مارچ میں دوسرا ایڈیشن چھپا۔ یہ ایڈیشن چھپنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایسی کتابیں مفت تقسیم ہوتی ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے اور کون کرتا ہے اس بارے میں ہم کسی کانپیریسی تھیوری میں نہیں پڑیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ دجال سیریز جب چھپتی تھی تو کئی اداروں اور ہمارے اپنے اداروں میں بھی بھر بھر کے اس کے بنڈل تقسیم ہونے کے لیے آتے اور خاص مذہبی جوش و جذبے سے ان کی کتابیں پھیلائی

گئیں اور مفت تقسیم کی گئیں۔ ''سرسید کی بصیرت'' نامی کتاب (سرسید کی بصیرت، تمہید، ص:۱۱تا۱۲) کے آغاز میں انھوں نے ایک تجزیہ کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ عاجز کے غائر مطالعے کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کا بنیادی سبب تکْییف یعنی Conditioning ہے۔

۲۔ مسلمان معاشروں میں اس تکییف کو قائم کرنے والے حکمران اور علما تھے۔

۳۔ مسلم معاشرے کو صدیوں تک اس تکییف میں مقید رکھنے والے علما تھے۔

۴۔ مسلم معاشرے کو صدیوں کی اس تکییف اور اس کے نتیجے میں آئے زوال اور انحطاط سے نکالنے کی واحد راہ Progressive Education System ہے۔

۵۔ پروگریسِو نظامِ تعلیم کی سب سے احسن تدبیر فی زمانہ Vision of Sir Syed میں مضمر ہے۔

۶۔ پروگریسِو نظام تعلیم یا سرسید کے Vision پر عمل آوری میں سب سے بڑی رکاوٹ علما ہیں۔

اس تجزیے سے یوں وہ بالکل اپنے اصلی مقام پر پہنچ گئے اور گویا انھوں نے اپنا شجرہ واضح کرکے بتادیا، یعنی:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اس کے بعد انھوں نے خاصے ٹیکنیکل انداز میں تنقید کی ہے، اس میں گویا انھوں نے علی گڑھ کا نوحہ لکھا ہے کہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں کیا ہو رہا ہے، تحقیق کے نام پر کچرا تخلیق ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں سے بہت سی باتیں ٹھیک بھی ہیں، لیکن ایک پورا تبرّا علی گڑھ پر کیا ہے کہ وہ اپنے بانی کے تصوّر سے ہٹ گیا اور اس کو فلاں کام کرنے چاہییے تھے۔ وہ اتنی پیچیدہ زبان استعمال کرتے ہیں کہ ان پر گرفت کرنا ویسے ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ چلتے چلتے اس کتاب میں ایک جگہ ایک خاص عنوان ''سفر نصیب'' کے نام سے آتا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں: ''نبی آخری الزمان حضرت محمد ﷺ کی وفات (۶۳۲ء) کے بعد کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ واقعۂ کربلا (۶۸۰ء) کے بعد امتِ مسلمہ محمدیہ کی فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی بحالی کے لیے سب سے توانا اور معجز آثار آواز انیسیوں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں بلند ہوئی یہ آواز تھی مرزا اسد اللہ خان غالب کی''۔ یعنی ہمیں معلوم پڑ گیا کہ نبی ﷺ کی وفات اور واقعۂ کربلا کے بعد سب سے صحیح، سچی اور پختہ آواز جو بحالی کی آواز تھی، وہ غالب کی تھی۔ پھر غالب کے کچھ فارسی اشعار نقل کیے ہیں:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند

شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

ان سیاہ راتوں میں مجھے صبح کی بشارت دی گئی۔ شمع کو بجھا دیا اور سورج کی نشان دہی کی گئی۔

رخ کشودند ولبِ ہرزہ سرایم بستند

دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

مجھے اپنا جلوہ دکھا کر میرے بیہودہ گو لبوں کو سی دیا گیا، میرا دل چھین لیا اور اس کے عوض دیکھنے والی دو آنکھیں عطا کر دی گئیں۔ تو یہ عظیم شخصیت اسرار عالم ہیں، جو امتِ مسلمہ میں پیدا ہوئے ہیں اور کس اعلیٰ مقام پر پہنچ کر ان حضرت نے پڑاؤ ڈالا ہے کہ مرزا غالب کو کس درجے پر پہنچا دیا ہے، ان کے نزدیک غالب در حقیقت واحد بڑی شخصیت تھی، جو اس امت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ مزید کہتے ہیں کہ ۶۸۰ء کے بعد امتِ مسلمہ ایک ایسے دور مظلمہ میں داخل ہو گئی تھی، جس نے رفتہ رفتہ اس کی ساری توانائیاں سلب کر کے اس کے جسد کو معطل اور زندہ لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس تعطل اور نیم جانی نے اسلام کو زندگی کے میدانِ عمل سے عملاً بے دخل اور قرآن اور آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو محجوب بنا کر رکھ دیا تھا۔ اصلاح کرنے، اسے قبول، جذب اور بار آور کرنے اور ایسی اصلاح کو استحکام بخشنے کی ہر قوت معدوم ہو چکی تھی۔ اسلامی تاریخ میں مرزا اسد اللہ خاں غالب وہ پہلی شخصیت ہے جو اس حقیقت سے آگاہ ہوئی، کہ امت کی اس کیفیت کی کنہ کیا ہے؟ اس کیفیت سے نکلنے کی راہ کون سی ہے؟''۔ پھر کہتے ہیں: ''غالب نے آگاہ کیا کہ ۶۸۰ء کے بعد امتِ مسلمہ محمدیہ جس بیماری میں مبتلا کر دی گئی ہے اسے تکییف کہتے ہیں اور اس تکییف سے نکلنے کی شاہ کلیدِ علم کی بازیافت ہے۔ علم کی بازیافت سے مراد قرآنی انسان کی بازیافت ہے، یہ عرش کی آواز تھی جو غالب کے نطق سے بلند ہوئی:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

وہ کہتے ہیں غالب نے ہمت دلائی، اصلی زمینی حقائق سے آگاہ کیا، تبدیلیوں کی آگاہی دی اور انسانیت کو سنت اللہ سے ہم آہنگ ہونے، ارادۂ اللہ کا ادراک کرنے اور منصوبۂ ربانی کا حصہ بننے کی ترغیب دی۔ چودہ سو

سالوں کے قرونِ مظلمہ میں رہتے رہتے انسانی ذہن وفکر پر جو گھٹاٹوپ تاریکی چھا گئی تھی اس سے نکلنے کی ہمت دلائی۔ معرکۂ خیر و شر جس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا اس کا حقیقی ادراک کرنے اور خیر کی قوتوں کا حصہ بننے کا احساس دلایا۔ مزید کہتے ہیں کہ: ”سرسید، غالب کے پہلے معنوی فرزند ثابت ہوئے۔ غالب کا لاہوتی انفجار، واقعۂ کربلا کے بعد واقع ہونے والا سب سے بڑا اور توانا انفجار تھا، جس نے یکے بعد دیگرے تین مسلسل انفجارات کو جنم دیا۔ یہ تین انفجارات: سرسید (۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء) کا فکری انفجار، حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴ء) کا علمی انفجار اور اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء) کا حرکی انفجار۔ (سرسید کی بصیرت، ص: ۵۳) انھوں نے یہ تین انفجار ذکر کیے ہیں۔ یہ سارے انفجار پڑھنے کے بعد قاری کا دماغ انفجار کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

اسرار عالم صاحب کے افکار: گمراہی کا پلندہ

آپ نے ماقبل مشاہدہ کیا کہ اسرار عالم صاحب کے افکار و نظریات حقیقت سے کتنے دور اور راہِ اعتدال سے کتنے ہٹے ہوئے ہیں۔ ان کی ابتدائی کتابوں ہی میں گمراہی کے جراثیم پائے جاتے تھے، مگر جس کتاب کے اقتباسات کا ہم نے مطالعہ کیا، وہ کتاب ۲۰۰۶ء میں چھپی ہے۔ اس سے قبل بھی وہ دجال وغیرہ پر جو کچھ لکھ رہے تھے وہ نہ صرف چھپ رہا تھا بلکہ تقسیم بھی ہو رہا تھا اور عام بھی ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے بہت سے افکار ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے، کراچی میں جماعتِ اسلامی کے ادارۂ معارف اسلامی نے ان کی ایک سے زائد کتابیں چھاپی ہیں۔ ان میں سے ایک ”یا سارية الجبل! کیا دجال کی آمد آمد ہے؟“ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں اس ادارے نے چھاپی اور اسی کا اگلا ایڈیشن ۲۰۰۱ء میں چھاپا۔ اسی طرح ”عالمِ اسلام کی روحانی صورتِ حال“ اسی ادارے سے شائع ہوئی۔ مزید یہ کہ ان کی کتاب ”عالمِ اسلام کی اخلاقی صورتِ حال“ کی طباعت کے وقت اس کی تقریظ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، جو بہت بڑے عالم ہیں۔ بہر حال، ایسے لوگ آہستہ آہستہ ہی پر پرزے نکالتے ہیں اور ان کا اصل چہرہ سامنے آتا ہے۔ جو اقتباسات میں نے آپ کے سامنے پیش کیے، ان کے بعد گمراہی اور کسے کہتے ہیں:

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

یعنی یہ کہنا کہ پوری امت ختم ہو چکی، غارت ہو چکی، اس کی تمام سیاسی اور مذہبی قیادت بک چکی، لوگوں کے ہاتھوں میں وہ کھیل رہی ہے، دین کو اس نے مٹا دیا ہے وغیرہ، یہ کیسے مانا جاسکتا ہے! ان حضرت جیسے کچھ دانشور اٹھے ہیں، کیا ان کو کوئی خاص وحی ہوئی ہے کہ انھوں نے اب اس امت کے ڈوبتے سفینے کو بچانا ہے اور اس کو آگے لے کر جانا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں عمرانی یا نفسیاتی تحقیق کی کوئی خاص روایت نہیں ہے، ورنہ یہ صاحبِ تحقیق کے لیے ایک اچھا موضوع ثابت ہوسکتا ہے، کہ ایک آدمی کس طرح مقبولیت پاتا ہے اور مقبولیت کے لیے کیا کیا جتن کرتا ہے۔

غلام احمد قادیانی کا فتنہ

برصغیر میں انگریز کے دور میں جو ایک بڑی ضلالت سامنے آئی وہ غلام احمد قادیانی کا فتنہ ہے۔ پہلے بھی بیان ہو چکا کہ اس نے بہت سی تاویلات کیں اور چونکہ اس نے اپنے آپ کو مسیحِ موعود قرار دینا تھا تو ضروری تھا کہ وہ اس مسئلے پر کلام کرے کہ دجال کون ہے اور اس کو متعیّن کرے۔ اس لعین کی کتابوں ”ازالۂ اوہام“ اور ”روحانی خزائن“ میں سے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں: ”ازاں جملہ ایک بڑی بھاری علامت دجال کی اس کا گدھا ہے، جس کے بین الاذنین کا اندازہ ستر باع کیا گیا ہے اور ریل کی گاڑیوں کا اکثر اسی کے موافق سلسلہ طولانی ہوتا ہے اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ وہ دخان کے زور سے چلتی ہیں جیسے بادل ہوا کے زور سے تیز حرکت کرتا ہے۔(اصل الفاظ یوں ہیں کہ جیسے ہوا اس کو اڑائے لیے جائے گی)۔ اس جگہ ہمارے نبی ﷺ نے کھلے طور پر ریل گاڑی کی طرف اشارہ فرمایا ہے چونکہ یہ عیسائی قوم کی ایجاد ہے جن کا امام و مقتدا یہی دجالی گروہ ہے۔ اس لیے ان گاڑیوں کو دجال کا گدھا قرار دیا گیا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو گا کہ علاماتِ خاصہ دجال کے انھی لوگوں میں پائے جاتے ہیں، انھی لوگوں نے مکر اور فریب کا اپنے وجود پر خاتمہ کر دیا ہے اور دینِ اسلام کو وہ ضرر پہنچایا ہے جس کی نظیر دنیا کی ابتدا سے نہیں پائی جاتی اور انھی لوگوں کے متبعین کے پاس وہ گدھا بھی ہے جو دخان کے زور سے چلتا ہے جیسے بادل ہوا کے زور سے“۔ (روحانی خزائن، ج:۳، حصہ دوم، ص:۴۹۳) آگے انھوں نے دجال کی علامت کو مکمل طور پر متعیّن کیا۔ کہتے ہیں: ”پیارے ثبوت پہنچ گیا کہ مسیحِ دجال جس کے آنے کا انتظار تھا، یہی پادریوں کا گروہ

ہے جو ٹڈی کی طرح دنیا میں پھیل گیا ہے (عیسائی مشنریوں کی طرف اشارہ ہے)۔ اب تو یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ پادریوں کا فتنہ ہے اور اس سے صاف طور پر کھل گیا کہ پادریوں کے سوا اور کوئی دجالِ اکبر نہیں ہے"۔ دیکھیے کہ دجالِ اکبر جو ایک متعیّن شخص تھا اس کو پادریوں کا گروہ قرار دے دیا۔ مزید کہتے ہیں: "جو شخص اب اس فتنے کے ظہور کے بعد کسی اور کا انتظار کرے وہ قرآن کا مکذِب ہے"۔ (روحانی خزائن، ج:۳، باب ازالہ اوہام، ص:۳۶۶) یعنی انھوں نے دیگر تمام آرا کا خاتمہ کر دیا کہ آپ جس مسیح کا انتظار کر رہے ہیں، وہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، مہدی کا انتظار ہے تو مہدی بھی میں ہوں اور آپ سوچ رہے تھے کہ دجال کوئی شخص ہوگا جو یہ سب کرے گا تو وہ بھی آچکا ہے۔ اور اگر آپ اس سب کا اقرار نہیں کرتے تو قرآن کے مکذِب بھی قرار پا گئے۔ مزید ایک جگہ لکھتے ہیں: "اس شیطان دجال کا نام دوسرے لفظوں میں عیسائیت کا بھوت ہے۔ یہ بھوت آنحضرت ﷺ کے زمانے میں عیسائی گرجا میں قید تھا اور صرف جسّاسہ کے ذریعے اسلامی اخبار معلوم کرتا تھا پھر قرونِ ثلاثہ کے بعد، بموجب خبرِ انبیا علیہم السلام کے اس بھوت نے رہائی پائی اور ہر روز اس کی طاقت بڑھتی گئی یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہجری میں بڑے زور سے اس نے خروج کیا، اسی بھوت کا نام دجال ہے"۔ (روحانی خزائن، ج:۲۲، باب حقیقۃ الوحی، ص:۴۵) ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "یہی ہمارا مذہب ہے کہ در اصل دجال شیطان کا اسمِ اعظم ہے جو بمقابل خدا تعالیٰ کے اسمِ اعظم کے ہے جو اللہ 'الحیّ القیوم' ہے"۔ یعنی ان کی مراد یہ ہے کہ دجال کوئی شخصیت نہیں، بلکہ ابلیس یا شیطان کا اسمِ اعظم ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم الحیّ القیوم ہے۔ ایسے لوگ جو لپاٹیے، جھوٹے اور فراڈیے ہوتے ہیں ان کے ہاں نسخ بہت ہوتا ہے، ان کی باتیں بدلتی رہتی ہیں۔ انھوں نے بھی آگے بات کو نئے رنگ میں گھما دیا: "اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ نہ حقیقی طور پر دجال، یہود کو کہہ سکتے ہیں نہ نصاریٰ کے پادریوں کو"۔ یعنی ان کی گزشتہ باتوں پر ممکن ہے کہ ان کے آقائے نعمت ناراض ہوئے ہوں اور کہا ہو کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہو؟ اس میں تو ہماری ہی تنقیص ہوتی ہے، ہم تو خود عیسائی اقوام میں سے ہیں، تو پھر شاید حضرت نے اس کی تصحیح کر کے اپنی تحقیق ٹھیک کر لی۔ جس طرح آج کل کے جدید لوگوں کی ابتدائی زندگی کی پچیس تیس سال کی نشاطِ فکر دیکھیں اور اب آکر دیکھیں تو آپ پہچان نہیں پائیں گے کہ یہ وہی آدمی ہے، جو پہلے خود ایسی باتیں کرتا تھا اور اب ہر اس چیز کا مذاق اڑاتا ہے، تمسخر کرتا ہے، ٹھٹھا کرتا ہے، جو وہ خود پہلے مان رہا تھا۔ لیکن چونکہ ہمارے یہاں لوگوں کی

یادداشت بہت قلیل مدّتی ہوتی ہے ان کو یاد ہی نہیں رہتا کہ ان صاحب نے پہلے کیا فرمار کھا ہے۔ مزید وہ لکھتے ہیں: ”اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ نہ حقیقی طور پر دجال یہود کو کہہ سکتے ہیں نہ نصاریٰ کے پادریوں کو اور نہ کسی اور قوم کو، کیونکہ یہ سب خدا کے عاجز بندے ہیں“۔ یعنی اب ان سب کو کلین چِٹ دے دی: ”پس کسی طرح ان کا نام دجال نہیں ہو سکتا“۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ”قرآن شریف اس شخص کو جس کا نام احادیث میں دجال ہے شیطان قرار دیتا ہے“۔ (روحانی خزائن، ج:۱۷، باب تحفہ ٔ گولڑویہ، ص:۲۶۸۔۲۶۹) مزید آگے چل کر بتادیا کہ دجّال ہی شیطان یا ابلیس ہے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ”دجال جس کا ذکر احادیث میں ہے وہ شیطان ہی ہے جو آخری زمانے میں قتل کیا جائے گا“۔ (روحانی خزائن، ج:۲۲، ص:۴۱) اس میں درج ذیل آیت کا حوالہ دے کر انھوں نے استدلال کیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ مجھے آپ مہلت دے دیں: ﴿قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ (الحجر: ۳۶) ”یارب پھر مجھے اس دن تک (زندہ رہنے کی) مہلت دے دے، جب لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے“۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ”دجال، ایک جماعت کا نام ہے“۔ یوں اتنے مختلف نقطہ ہائے نظر سے ایک غلطی ہائے مضامین اور پریشان خیالی سامنے آتی ہے۔ یہ تو خیر بالکل ہی ایک گمراہ آدمی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر گمراہ کن ہے، لیکن دیگر بہت سے لوگوں نے بھی ایسی تاویلات کی ہیں۔

مولانا اصغر علی روحی

مولانا اصغر علی روحی نے ایک تحریر ”فتنۂ دجالیت“ کے نام سے لکھی تھی، ایک رسالے نے کچھ عرصہ قبل اسے دوبارہ شائع کیا۔ اس کا ایک اقتباس یوں ہے: ”یہ خیال کہ دجال انسان ہوگا یا شیطان، علما میں مختلف فیہ ہے۔ اکثر علما کا خیال ہے کہ دجّال شیطان ہوگا جو انواع واقسام کی خرقِ عادت سے لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ یہ خیال بھی اس امر کا مؤیّد ہے کہ ابنِ صیاد دجّال نہیں بلکہ نبوت کا مدعی ہوا تھا۔ اس لیے باوجود اس کے اسلام لانے کے اسے دجال کا لقب دیا گیا، اس طرح بعد کے کچھ لوگوں کو بوجہِ الحاد، دجال کے نام سے پکارا جاتا ہے“۔ اصغر علی روحی گویا یہاں دجال کو شخص معین کے بجائے عمومی رنگ دے رہے ہیں۔

* * * * *

احادیثِ فتن کی جدید تاویلات کے محرکات

اس تفصیل کے بعد جو ہم گزشتہ ابواب میں پڑھ آئے ہیں، یہ بات واقعی قابلِ غور ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یا جو احادیثِ فتن اور اشراط الساعۃ کی مختلف تاویلات کی جارہی ہیں، اس کے محرکات کیا ہوسکتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ ایک اور ضمنی موضوع یہ ہے کہ اس کے نتائج کیا نکل رہے ہیں؟ اور ظاہر ہے کہ یہ نتائج زیادہ تر غلط ہی ہیں، منفی ہیں، مثبت نہیں ہیں۔ یہ نسبتاً طویل موضوع ہے کہ احادیثِ فتن اور اشراط الساعۃ کے صحیح فہم کا منہج کیا ہے یا ہمیں ان احادیث کے ساتھ کیسے تعامل کرنا ہے۔ جہاں تک تاویلاتِ فاسدہ کے محرکات کا معاملہ ہے تو اس کے کیا محرکات اور نتائج ہوسکتے ہیں، یہ بھی توجہ طلب ہیں۔ اس جدید عہد میں احادیثِ فتن اور اشراط الساعۃ پر جو لٹریچر شائع کیا جارہا ہے اور اس میں طرح طرح کی تاویلیں کی جارہی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاویلات کا یہ طریقہ قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ پرانے لوگ بھی اس کی تاویل کر رہے ہیں، جیسے امام خطابی، قاضی عیاض، حافظ ابنِ حجر عسقلانی، امام نووی رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر اکابر محدثین، شارحینِ حدیث کا معمول ہے۔ مگر ان کی اس طرح کی تاویلات نہیں ہیں جو موجودہ زمانے میں اسرار عالم صاحب جیسے حضرات کررہے ہیں۔ عہدِ جدید میں جو لوگ تاویلات کررہے ہیں وہ فاسد، حقائق سے دور اور خود ساختہ ذہنیت کی عکاسی کررہی ہیں۔ اب اس طرح دور از کار اور فاسد تاویلات کے محرکات کیا ہوسکتے ہیں اور اس کے نتائج کیا ہوسکتے ہیں؟ غور کرنے سے حسبِ ذیل محرکات سامنے آتے ہیں۔

حب الدنیا

ان محرکات کو اگر ویسے دیکھا جائے تو اجمالی طور پر اگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے نفس کے اندر بنیادی طور پر ایک بہت بڑا Motive رکھا گیا ہے، وہ حُبِّ عاجلہ ہے۔ حُبِّ عاجلہ جس کو حُبّ الدنیا بھی کہا جاتا ہے،

اس کے متعلق ایک اثر چلا آرہا ہے: «حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ». (حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، رقم: ۳۸۸) ”کہ دنیا کی محبت ہر طرح کی خطاؤں اور خرابیوں کی جڑ ہے“۔ پھر جب اس حُبِّ دنیا کے لفظ کو ذرا کھولتے ہیں اور اس کی تفسیر کرتے ہیں، تو علما بتاتے ہیں کہ بنیادی طور پر حُبِّ دنیا دو چیزوں کا نام ہے؛ حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ، یعنی مال کی محبت اور منصب کی محبت۔ تو وہ دنیا جس کی مذمت کی گئی ہے اور اسے ملعونہ قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو کچھ اس دنیا سے متعلق ہے وہ بھی لعنت زدہ ہے، یعنی اللہ کی رحمت سے دور ہے۔ تو وہاں پر بھی جس دنیا کا تذکرہ ہے، یہ وہ ہے جو انسان کو اللہ سے غافل کر دیتی ہے اور ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کر دے وہ لغو ہے۔ اسی حوالے سے زہد کی تعریف ہمارے اکابرین نے اس طرح کی ہے کہ زہد کہتے ہیں ہر اس چیز کو چھوڑ دینا جو انسان کو غیر اللہ میں مشغول کر دے، اللہ سے غافل کر دے۔ تو مال اور منصب کی یہ خواہش بسا اوقات ان تاویلاتِ فاسدہ کا محرک بن جاتی ہے۔ ماضی میں وضعِ حدیث کے باب میں یہی حب الدنیا نے اہم کردار ادا کیا تھا، اس حوالے سے ایک بہت معروف قصہ ہے، جو کئی کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور یحییٰ ابنِ معین رحمۃ اللہ علیہ بغداد کی کسی مسجد میں گئے اور وہاں نماز پڑھی۔ وہاں مسجد میں نماز کے بعد ایک قصہ گو کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک پوری سند پڑھی اور اس میں بیان کیا کہ مجھے احمد بن حنبل اور یحیی بن معین نے بیان کیا ہے اور اس طرح پھر ایک سند بیان کی۔ اور پھر اس کے بعد ایک روایت بیان کرنی شروع کی اور وہ روایت بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ جب کوئی شخص لا إله إلا الله کہتا ہے تو اس کے ہر کلمے میں سے اللہ تعالیٰ ایک پرندہ پیدا کرتے ہیں، اس پرندے کے اتنے پر ہوتے ہیں، اس کی چونچ ایسی ہوتی ہے اور اس کا یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے، پورا ایک قصہ شروع کر دیا۔ جس طرح ہمارے ہاں جھوٹی احادیث کا ایک انداز ہوتا ہے، تو لوگوں نے اس پر بڑی واہ واہ کی۔ جب قصہ مکمل ہو گیا تو انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس کو بلاتے تھے اور بلا کر اس کو پیسے دیتے تھے۔ تو یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے بلایا تو وہ شخص آیا، ظاہر ہے اشتیاق سے آیا کہ شاید مجھے یہاں سے کچھ پیسے ملیں گے۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ جو تم بیان کر رہے ہو کہ احمد بن حنبل اور یحیی بن معین سے میں نے یہ روایت سنی ہے، تو میں احمد بن حنبل ہوں اور یہ یحیی بن

معین ہیں، ہم نے تو ایسی کوئی بات تم سے بیان نہیں کی اور نہ کبھی ہمارے گمان میں یہ قصہ ہے۔ تو اس شخص نے کہا اوہو! مجھے کسی نے بتایا تھا کہ احمد بن حنبل اور یحیی بن معین کوئی احمق قسم کے لوگ ہیں، ان کا دماغ بہت تیز نہیں ہے، لیکن آج مجھے یقین ہوگیا۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ دنیا میں ایک ہی احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ہیں میں تو دس احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کو جانتا ہوں، تو اس پر ایک ٹھٹا ہو گیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دوست کو اشارہ کیا کہ آؤ چلو یہاں سے، اپنی عزت بچائیں، یہ لپاٹیوں کا مجمع ہے اس میں کوئی علم کی بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ قصہ گو تھے جنھوں نے باقاعدہ مال کے لیے یہ کام کیا تو آپ کو پتا ہے یہ لٹریچر جو چھپتا ہے، یہ بیسٹ سیلر ہوتا ہے۔

اسی طرح ۱۹۹۱ء کی پہلی گلف وار کے بعد اس طرح کے لٹریچر کا ایک بڑا سیلاب آیا تھا، پھر نائن الیون کے بعد بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔ چونکہ یہ کتابیں خوب بکتی ہیں، بڑی لذیذ ہوتی ہیں، لوگ بڑے شوق ذوق سے ان کو پڑھتے ہیں اور معاف کیجیے گا لوگ عام طور پر تفریح ہی کے لیے پڑھتے ہیں۔ بہر حال، اس لٹریچر کی تیاری میں مال کی طلب شامل ہے، پھر اس میں حُبِّ جاہ اور شہرت ہے۔ پرانے زمانے میں وضعِ حدیث کے باب میں یہ ہوتا تھا، جبکہ آج تو ہمارا معاشرہ اور طرح کا ہے، لوگوں نے اداکاروں، گلوکاروں، کھلاڑیوں اور اس طرح کے لوگوں کو سلیبرٹی بنایا ہوا ہے۔ اچھے وقتوں میں تو دین کے عالم اور خاص طور پر ایسے لوگ جو یہ کہیں کہ ہمارے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، وہ لوگوں کے رجوع کا مرکز بن جاتے تھے، جبکہ آج کل ایسے لوگ جو کوئی بہت نادر قسم کی باتیں بیان کریں اور ایسی باتیں بیان کریں جو لوگوں کے علم میں نہیں ہیں، اس سے لوگ مرجعِ خلائق بن جاتے ہیں۔ وہ محرک جو حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جو آدمی اس وجہ سے طلبِ علم کرے تاکہ اس علم کے ذریعے وہ لوگوں کے چہرے کو اپنی طرف پھیر لے، تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے ہی انسان میں شہرت کی طلب رہی ہے۔ چنانچہ ایسے لٹریچر کی تیاری سے بھی شہرت ہو جاتی ہے اور ایسے لوگوں کو جدید میڈیا میں بلایا جاتا ہے، ان کے انٹرویو کیے جاتے ہیں۔ آپ کو شاید ہنسی آئے گی لیکن وضعِ حدیث کے محرکات میں ایک محرک مال ہی کے ذیل میں ہے، جیسے اپنا سودا بیچنا، آپ بینگن بیچتے ہیں یعنی سبزی فروش ہیں، تو آپ وہ روایتیں بیان کریں گے جن میں بینگن کے فضائل ہیں اور مختلف سبزیوں کے فضائل ہیں تو اسی طریقے سے آپ کوئی چیز بیچتے ہیں۔

ہریسہ بیچتے ہوئے اس طرح کی حدیثیں گھڑی گئیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے کہا ہے کہ جبرائیل خاص طور پر میرے لیے جنت سے ہریسہ لے کر آئے، تاکہ اس سے میری کمر مضبوط ہو اور میں قیام اللیل کر سکوں (معاذاللہ)۔ تواب جیسے یہ بتاناکہ ہریسہ سے کمر مضبوط ہوتی ہے، ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں، تو یہ کام بھی ہو رہا تھا۔ آج بھی کئی شکلوں میں اس طرح کی حرکتیں ہو رہی ہیں، یہاں پر بھی یہی ہوا ہے کہ سودا بیچنا ہے۔ اب ان کا سودا کیا ہے، یہ وہ کتابیں ہیں، یہ آڈیوز اور ویڈیوز ہیں جو یہ لوگ بیچ رہے ہیں۔

زندقہ

اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ وضعِ حدیث یعنی حدیث گھڑنے کا عمل بڑے پیمانے میں ہوا ہے اور اس امت کے ابتدائی دور ہی سے اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ پہلی صدی ہجری لیجیے اس کا جو آخری ثلث ہے اس سے اس کام کا آغاز ہو گیا تھا۔ جب ہم وضعِ حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے محرکات کو دیکھتے ہیں تو بہت سے وہ محرکات جو وہاں کارفرما تھے، وہ یہاں علاماتِ قیامت کے موضوع کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں، یعنی یہ جو لوگ لکھ رہے ہیں اور لٹریچر مہیا کر رہے ہیں، اس میں بہت سے وہی محرکات پائے جاتے ہیں، جو وضعِ حدیث کے تھے۔ اس میں زیادہ تر محرکات منفی ہیں، ایک آدھ مثبت بھی ہے۔ جب ہم وضعِ حدیث کے محرکات اور اُس کے داعیات پڑھتے ہیں تو اس میں کچھ چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں ایک بڑا مقصد یا ایک بڑا داعیہ یا محرک سامنے آتا ہے، وہ ہے "زندقہ"۔ زندیق اصل میں وہ لوگ ہیں جن کو منافق کہا جاتا تھا، یہ وہ لوگ تھے جو حقیقت میں کافر ہی تھے مگر اسلام کو سبوتاژ کرنے کے لیے، اسلام کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کے مسلمان ہوئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سازش کے تحت اسلام کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہاں پر بھی ایسا ہو سکتا ہے اور ایسے لوگ ہیں بھی جو گویا یہ کام منصوبے کے تحت کر رہے ہیں۔ تاکہ وہ اس کے ذریعے اسلام کو بدنام کریں، اسلام کے عقائد کو کرپٹ کریں۔ اس کی وجہ سے بہت سے جو دینی معتقدات ہیں، ان کے بارے میں لوگ شبہے میں پڑ جاتے ہیں۔ دین کے بہت سے معاملات گویا مضحکہ، تمسخر اور استہزا کا موضوع بن جاتے ہیں۔

گروہی تعصب

پھر ایک بڑا محرک تھا فرقہ ورانہ تعصبات جو اپنے اپنے گروہوں کے لیے رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں کچھ سیاسی گروہ وجود میں آ گئے، کچھ لوگ شیعانِ علی ہو گئے، کُچھ شیعان عثمان ہو گئے، پھر اُسی میں سے خوارج نکل آئے۔ پھر عقائد کے معاملات میں اختلافات پیدا ہوئے، نئے نئے فرقے وجود میں آئے۔ اسی طریقے سے یہ تعصب قوموں، علاقوں اور زبانوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ تو یہاں پر بھی ہمیں اس کا پَرتو نظر آتا ہے۔

تشیع کے اثرات

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے اندر تشیع اور روافض کے آثار ہیں، جیسے وہ چھپے ہوئے ہیں، اگر چہ بظاہر وہ سنی ہوں، لیکن وہ جو سارا کام کر رہے ہیں، جو باتیں بیان کر رہے ہیں، ان میں روافض کی روایات اور ان کے تصورات ہیں۔ خاص طور پر مہدی کے متعلق تصورات، اسی طرح بنو امیہ اور بنو عباس کے بارے میں ان کے تصورات کے مظاہر بھی ہمیں اس لٹریچر میں نظر آتے ہیں۔

قومی تعصب

اسی طریقے سے مختلف قوموں کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے ہم نے دیکھا تھا کہ عیسیٰ داؤد صاحب کے ہاں کہ وہ مصری ہیں تو مصر کی قوم، اس کی بڑائی، اس کی عظمت کا اظہار ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہ جگہ جگہ یہ دکھانا چاہ رہے ہیں کہ دجال خاص طور پر مصری اقوام یا مصر کی قوم کے خلاف ہو گا۔ اسی طرح کسی کو عراقیوں سے کوئی تعصب ہے، صدام حسین سے تعصب ہے تو وہ وہی تعصب یہاں برت رہا ہے۔ ایران اور عراق کے درمیان جنگ ہوئی تھی، تو ایک بڑا فرقہ ہے جس کے نزدیک صدام حسین بہت ہی مبغوض شخصیت ہے، تو اس کو جگہ جگہ ''سفیانی'' کے طور پر متعارف کروانا اور بتانا ہے کہ وہ یہ ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی لوگوں نے

اس میں اپنے اس طرح کے معاملات صاف کیے۔

نئے پن کی خواہش

یہاں پر خاص طور پر ایک بہت اہم مسئلہ نیاپن پیدا کرنا، اپنی اپچ نکالنا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے عالم، فقیہ اور مفسر تھے اور تصوفِ اسلامی میں ان کو مُجدِّد کا مقام حاصل تھا، لیکن وہ بار بار کہتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کوئی بھی نئی بات نہ نکالوں اور اس میں بہت احتیاط کرتا ہوں۔ جب کبھی نئی بات سوجھتی ہے تو تحقیق کرتا ہوں کہ ہمارے اسلاف نے اس بارے کچھ لکھا ہے اور اگر وہاں مجھے کچھ مل جائے تو بہت اطمینان ہوتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ایسی چیز کہ جو بالکل نئی ہو، ہمارے بڑوں نے نہ کہی ہو تو میں وہ نہ کہوں۔ کچھ لوگوں کو یہ نیاپن پیدا کرنے کا شوق ہے، معلوم نہیں کہ ابلیس کہاں سے یہ دراندازیاں کرتا ہے اور کہاں کہاں سے لوگوں کو گھیر کر اس طرف لاتا ہے۔ چنانچہ اس خواہش نے بھی احادیثِ فتن کی جدید تاویلات کی طرف بعض لوگوں کو مائل کیا ہے۔

چند مثبت محرکات کا تذکرہ

اب تک بیان کیے گئے تقریباً سارے منفی محرکات تھے، لیکن وضعِ حدیث یا احادیثِ فتن کی تاویلات کا ایک مثبت محرک بھی ہوتا ہے۔ وضعِ حدیث کے مثبت محرک پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس کام میں بھی کوئی خیر ہو سکتا ہے، حالانکہ یہاں بھی کچھ وجوہات ہیں کہ بہت سے لوگ نیک تھے، صالح تھے، عبادت گزار تھے اور لوگوں کی دینی حالت میں انحطاط اور تنزل دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے، انھوں نے بھی وضعِ حدیث کے اس کام میں اپنا حصہ ڈالا اور احادیث گھڑیں۔ ہمارے محاورے میں کہتے ہیں کہ فی سبیل اللہ فلاں کام کرنا، تو انھوں نے گویا اپنے تئیں فی سبیل اللہ احادیث گھڑیں۔ ایک بہت مشہور آدمی ہے، اس نے قرآنِ مجید کی فضیلت کی احادیث بہت زیادہ گھڑیں اور ہر سورت کے بارے میں کئی احادیث گھڑیں، تو وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس سے پوچھا کہ یہ جو تم احادیث بیان کر رہے ہو یہ کہاں سے بیان کر رہے ہو؟ اس کا سورس کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ بات یہ ہے

کہ میں نے دیکھا کہ لوگ قرآن سے اعراض کر رہے ہیں اور امام ابو حنیفہ کی فقہ اور امام ابنِ اسحاق کے مغازی یعنی سیرت کی روایات میں لگ گئے ہیں، تو میں نے اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید پر فضائلِ قرآن میں احادیث گھڑیں۔ یعنی میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو یہ کام کیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ مجھے اجر سے نوازیں گے۔ لہذا یہ بات اہم ہے کہ ایسا ہوتا رہا ہے اور آج بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے اندر اُمّت کا درد ہے اور غم ہے، وہ دیکھتے ہیں کہ لوگ آخرت کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے، تو احادیثِ فتن کی بعض اوقات نادر تاویلات کرتے ہیں۔ جس طرح میں نے شیخ الجزائری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بتایا تھا کہ انھوں نے بھی جدید ایجادات کے حوالے سے یہ کام کیا ہے۔ لیکن ان کا محرک نیک ہے، کیونکہ ایک تو یہ کہ یہ دلائل النبوّہ ہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ قیامت قریب ہے اس کی تیاری کرو، تو یہ بھی ایک مثبت محرک رہا ہے۔

یہاں پھر ایک اور محرک جو اسی کے ذیل میں ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ سوشل سائنٹیفک ڈسکورس کے تحت حالات کے جو سارے تجزیے ہو رہے ہیں۔ ان تجزیوں نے بعض لوگوں کو حالات کے دینی تجزیے پر آمادہ کیا ہے، اس لیے کہ پرانے زمانے میں جو کچھ بھی ہوتا تھا، دنیا میں سب کی توجیہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی ہوتی تھی، اور وحی کی روشنی میں ہوتی تھی۔ یہ صرف مسلمانوں کی بات نہیں ہے، پوری دنیا میں ایسا ہی تھا۔ عیسائیوں کے ہاں بھی یہی تھا، یہودیوں کے ہاں بھی یہی تھا، ہندوؤں کے ہاں بھی یہی تھا اور بدھ مت کے ماننے والوں ہاں بھی یہی تھا، غرض ہر جگہ ایسا ہی تھا۔ پھر جدیدیت آئی تو لوگوں نے کہا کہ ہمیں ان چیزوں کی Metaphysical توجیہات نہیں کرنی، بلکہ ہمیں نیچرل اور عقلی توجیہات کرنی ہیں۔ مثال کے طور پر طاعون آیا ہے، چیچک پھیل گیا ہے، تو یہ کیا ہے؟ یعنی خدا ناراض ہو گیا، اس نے عذاب بھیجا، قحط آ گیا، یعنی تم نے برے کام کیے تھے تو خدا نے آسمان کا پانی روک دیا اور تم پر تباہی لے آیا؟ آپ پاکستان، امریکہ، سعودی عرب کی کسی بھی یونی ورسٹی میں چلے جائیں، جب یہ سوشل سائنسز پڑھائے جائیں گے یا فیزیکل سائنسز پڑھائے جائیں گے، تو اس کی توجیہات میں خدا، آخرت اور وحی کا کوئی تذکرہ نہیں ہو گا۔ تو یہ ایک اہم بات ہے کہ لوگوں نے دیکھا کہ سارے تجزیے ہو رہے ہیں کہ اس کے پیچھے یہ سیاسی مقاصد ہیں، فلاں کے پیچھے یہ معاشی مقاصد ہیں۔ بہت سارے لوگ کہنے لگے کہ یہ جو پہلے خلیج کی جنگ ہوئی یا اس کے بعد نائن الیون کا

واقعہ پیش آیا، تو یہ تیل کے کنوئیں کا کھیل ہے۔ مگر در اصل یہ کھیل کچھ اور تھا، یہ اسلحہ بیچنے کا کھیل تھا۔ جب مذہبی لوگوں نے دیکھا کہ دینی توجیہات سے لوگ پہلوتہی کر رہے ہیں، تو ہر مذہب کے لوگوں میں سے یعنی عیسائیوں، یہودیوں، اور پھر مسلمانوں میں سے بھی ایسے لوگ آئے، انھوں نے کہا کہ نہیں یہ تو آپ کا تجزیہ ہے، اس کی ایک گہری مذہبی سطح ہے۔ یہ خاص طور پر مبشرات یا جو پیش گوئیوں کا معاملہ ہے، اس میں یہ بات بہت اہم تھی کہ اُن کو محسوس ہوا کہ دینی ڈسکورس بالکل پسپا ہوتا جا رہا ہے، کہیں پر دین کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، تو انھوں نے یہاں بھی احادیثِ فتن کی تاویلات شروع کر دیں۔ جس طرح آپ نے کرونا کے حوالے سے دیکھا کہ کچھ لوگ جن کے اندر بہت حساسیت ہے، وہ اصرار کر رہے ہیں کہ نہیں یہ کوئی سازش ہو رہی ہے، یہ کوئی چال ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اصل میں تو دین اور دینی شعائر نشانے پر ہیں۔ بہر حال، اس سارے معاملے میں ان کو لگا کہ یہ سارے تجزیے آپ کر رہے ہیں، اس میں ہمارے پاس جو دینی ہدایت اور جو دینی رہنمائی ہے، یعنی جو فتن، ملاحم کے ابواب ہیں، ان کی طرف رجوع ہی نہیں کر رہے۔ تو اسی مثبت جذبے کے تحت انھوں نے کہا کہ ہمیں پھر دینی ڈسکورس کو زندہ رکھنا ہے اور ہمیں اپنے تجزیوں میں اسے ابھارنا اور سامنے لے کر آنا ہے۔

❊❊❊❊❊

احادیثِ فتن کی جدید تاویلات کے نتائج

احادیثِ فتن اور علاماتِ قیامت کی غلط، غیر سنجیدہ تاویلات کے نتائج بہت برے نکلے ہیں، ان تاویلات کی وجہ سے دین کی بدنامی ہوئی اور دین کی نصوص کی غلط تشریحات کا دروازہ کھل گیا۔ آنے والی سطور میں ان تاویلات کے نتائج کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے:

اس موضوع پر نااہل افراد کی رائے زنی

عہدِ جدید میں احادیثِ فتن اور علاماتِ قیامت کے بارے میں بہت زیادہ کلام کیا گیا اور بہت سی روایتوں کا حالات کے اوپر انطباق کیا گیا۔ اس انطباق واستنباط میں بے تحاشا غلطیاں کی گئیں۔ یہاں اس باب میں جو غلط استنباط کیا گیا اس کی بنیادی وجہ جہالت اور موضوع سے ناواقفیت ہے۔ اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ہر شخص چاہے وہ اہل ہو یا نہ ہو اس نے دین کے بڑے اور مشکل موضوعات پر کلام شروع کر دیا۔ جبکہ قرآنِ مجید نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے: ﴿أَتَقُولُونَ عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الاعراف:۲۸)

”تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی باتیں نہ کرو جو تم نہیں جانتے“۔ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کلام کرنا، ان کے ارشادات میں من مانی تاویلات کرنا بغیر علم واہلیت کے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہاں جب احادیثِ فتن کی تاویلات شروع کی گئیں تو اس کے بعد گویا ایسا معاملہ ہوا ہے کہ ہر آدمی کے پاس اختیار آگیا ہے اور خاص طور پر جب سے الیکٹرانک میڈیا آیا ہے تو اب ان چیزوں کا شوبہت بڑھ گیا ہے۔ کوئی بھی شخص جس کے پاس ایک عام سادہ سا موبائل ہو اور اس پر وہ کوئی بھی ویڈیو بنا لے اور اسے اپلوڈ کر دے۔ چونکہ یہ موضوعات ایسے ہیں کہ جن کے لیے لوگوں میں لذت پائی جاتی ہے، لوگوں میں طلب پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے یہ چیزیں پھیل جاتی ہیں اور عام ہو جاتی ہیں۔ لہذا یہ طریقۂ کار ہی ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ اس

کی وجہ سے دین کی اتھارٹی کا پورا نظام غارت ہوتا جا رہا ہے۔

دین کی بدنامی

احادیثِ فتن کی غلط تاویلات نے ایک اور بڑا مسئلہ پیدا کیا ہے، وہ دین کی بدنامی کا معاملہ ہے۔ جب ہم نے ان تاویلات کرنے والوں کی بہت سی تحریروں کو دیکھا، تو ان میں عجیب و غریب قسم کی تاویلات کی گئیں اور ان میں سے کئی بہت زیادہ مضحکہ خیز ہیں۔ مثال کے طور پر ''سفیانی'' کے نام سے ایک کردار تخلیق کیا گیا اور پھر اسے صدام حسین پر چسپاں کیا گیا۔ اسی طرح ''کندہ'' کو کنیڈا قرار دیا گیا۔ دجال کی سکونت کے حوالے سے بعض کا یہ کہنا ہے کہ وہ فلوریڈا میں ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ برمودا تکون میں ہے۔ اڑن طشتریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دجال کے لوگوں کی سواریاں ہیں۔ اب یہ جو باتیں کی جا رہی ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ وہ ہوں، جن کا ہم نے تذکرہ کیا۔ مگر یہاں میری مراد زندقہ کی فہرست میں آنے والے لوگ ہیں جو جانتے بوجھتے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ دین کا مذاق اڑوانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہو۔ ہم نیتوں کی تو تحقیق نہیں کر سکتے، لیکن نتائج سے لگتا ہے کہ یہ دین جیسے قصے کہانیوں، افسانوں اور دیومالا کا نام ہے۔ اس طرزِ عمل کے مزید بھی کئی برے نتائج نکلتے ہیں: ایک عوام کا ذوقِ دین غارت ہو جاتا ہے اور ان کو اس طرح کی لذیذ چیزوں سے سنسنی خیزی پیدا ہوتی ہے، گویا چاٹ لگ جاتی ہے۔ اور اسی طرح جو اصل دین یعنی دین کے بنیادی احکامات اور مستقل تقاضے ہیں جو علما کا مستقل موضوع ہیں وہ غیر اہم ہوتے جا رہے ہیں۔

علما اور دینی روایت کے متعلق بدگمانی

جب یہ چیزیں پھیل جائیں اور لوگوں کو ان کی لت لگ جائے، تو اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ علمائے کرام کے بارے میں بدگمانی پیدا ہونے لگتی ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کہ اتنے اہم مسائل ہیں اور احادیث میں اتنی اہم باتیں بتائی گئی ہیں، جبکہ علما نے ہمیں نماز، روزے کے چکر ہی میں لگا رکھا ہے (معاذاللہ) اور اصل چیزیں تو یہ ہیں۔ یہ شخص جو ان موضوعات پر کلام کر رہا ہے، یہ مفکر، یہ صحافی، یہ کاتب، یہ انٹلیکچول اصل میں صحیح

آدمی ہے۔ اس کو حالات کا ادراک ہے، اسے اندازہ ہے کہ خارج میں کیا ہو رہا ہے، جبکہ اس کے برعکس علما تو بس بسم اللہ کے گنبد کے اسیر ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ کہ جو ہمارے ہاں سو کالڈ پڑھے لکھے سمجھے جاتے ہیں، جن کا پہلے ہی معاشرے پر بہت اثر ہے، یہ لوگ روایت سے ہٹ کر دین کے نام پر ایک الگ ڈسکورس تیار کرتے ہیں۔ چونکہ جدید دنیا میں دو ایسے ادارے ہیں، جن کا انسانوں کی کنڈیشننگ اور ان کی شخصیت کی تشکیل پر بہت زیادہ اثر ہے۔ ان میں ایک ایجوکیشن ہے، اس ادارے کا انسانوں کی ذہنی تشکیل میں، ان کے فکری سانچے بنانے میں اہم کردار ہے اور دوسرا ادارہ جو حال ہی میں وجود میں آیا ہے، وہ میڈیا ہے، وہ بھی غیر معمولی طور پر بااثر ہو گیا ہے۔ ان اداروں سے جو ذہن سامنے آتا ہے وہ خاص طرح کا ایک سائنٹیفک ذہن ہوتا ہے، جس میں Empiricism اور Rationalism، عقلیت، اثباتیت اور تجربیت اس طرح کی چیزوں کو بہت اجاگر کیا جاتا ہے، کہ کسی بھی بات کو دلیل کے بغیر نہیں مانا جاتا اور ہر چیز کو عقل کی سان پر چڑھانا اور پرکھنا سکھایا جاتا ہے۔ گویا اب یہ لوگ جو پہلے ہی بہت زیادہ مغرب گزیدہ ہیں اور شیطان ان کے اندر کئی حوالوں سے شبہات القا کرتا رہتا ہے۔ اب جب وہ دین کے نام پر یا احادیث کی تاویل کے نام پر (ظاہر ہے جو احادیث وہ انتخاب کر رہے ہیں وہ عام طور پر بالکل ضعیف، منکر اور موضوع روایتیں ہیں) ایک خاص طرح کا دینی ڈسکورس پیش کرتے ہیں، تو اس سے عوام کے اندر دین اور دینی فکر و روایت کے بارے میں وحشت پیدا ہو گی۔

مسلم سماج کے اندر ایک اور طبقہ بھی ہے جو اصلاً دین چھوڑ چکا ہے یعنی زندقہ کے حکم میں ہے، وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا، مسلمانوں جیسے اس کے نام ہیں، لیکن جدید تعلیم اور خارجی اثرات کی وجہ سے وہ تقریباً ملحد ہو چکا ہے۔ جب یہ چیزیں اس کے سامنے آتی ہیں، تو وہ اس کو اہلِ دین یا علمائے کرام کی کردار کشی کے لیے استعمال کرتا ہے اور پھر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم تو آپ سے پہلے ہی کہتے تھے کہ مذہب افیون ہے، یہ تو معاذ اللہ جہالت کا ایک کاروبار ہے۔ ہمارے ملک میں ایک صاحب جو وزیر بھی رہے اور سینیٹر بھی رہے، انھوں نے ایک موقع پر یہ جملہ کہا تھا کہ ہمارے مدارس تو جہالت کی فیکٹریاں ہیں (معاذ اللہ)۔ اسی طرح کے بہت سے لوگ ہیں، جو بالکل بے دین ہیں اور وہ بالکل صحیح تعریف کے مطابق زندیق ہیں۔ اگر یہی لوگ ویسٹ میں ہوں، تو وہاں کھلے عام اپنے افکار ظاہر اور پبلک کر دیتے ہیں، کیونکہ وہاں ان کو اس طرح کے

اندیشے نہیں ہیں۔ ہمارا سماج جیسا بھی ہے، بہر حال، ابھی بھی مذہبی سماج ہے اور لوگوں کے اندر مذہب اور مذہبی معتقدات کے حوالے سے حساسیت پائی جاتی ہے، اس لیے اس قبیل کے لوگ ڈرتے ہیں کہ کوئی آدمی اُٹھ کر حملہ نہ کر دے یا کوئی اور معاملہ نہ ہو جائے، کہ کہیں ناموسِ رسالت کے عنوان سے مجھے مار ہی نہ دیا جائے، تو وہ تھوڑا اپنے آپ کو روک لیتے ہیں، ورنہ وہ دین چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے گمراہ کن افکار پر مبنی چیزوں کو پھیلاتے ہیں، انھیں عام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو یہ ہے، وہ دین جس کو تم مانتے ہو، جس پر تم چلتے ہو۔

ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لیے بعض گروہوں کی نصوص میں کتر بیونت

اس ساری بحث میں ایک اور معاملہ یہ ہوتا ہے کہ موقع پرست لوگ جو ہر جگہ ہوتے ہیں، وہ سامنے آتے ہیں اور احادیث کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر جو ''مہدیت'' کا تصور ہے، مہدی سے متعلق روایات تو اگرچہ موجود ہیں، لیکن مہدی کے حوالے سے بہت کم احادیث ہیں، جو صحت کے مقام کو پہنچتی ہیں۔ اہل السنۃ کہتے ہیں کہ مہدی؛ آخر الزماں میں مسلمانوں کے ایک بڑے حکمران، لیڈر، خلیفہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے غیر معمولی کام لیں گے۔ اسی طرح کچھ اور نشانیاں بھی ان کے بارے میں بتائی گئی ہیں۔ لیکن یہاں پر بھی وہی ہوا ہے کہ صحیح احادیث کے ساتھ بہت سی کمزور اور من گھڑت احادیث بھی شامل ہوگئی ہیں اور مہدی کے متعلق ایک عجیب وغریب تصور قائم کر دیا گیا ہے۔ اہلِ تشیع کا تصورِ مہدی بالکل الگ ہے، چونکہ لفظ مشترک ہے، اس لیے بسا اوقات بعض لوگوں کے لیے یہ تصور خلط ملط ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اہل السنۃ کے سر کے تاج ہیں اور اہلِ تشیع بھی ان کا تذکرہ کرتے ہیں، ان کا چرچا کرتے ہیں، لیکن اہل السنۃ جن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جانتے ہیں اور ان کی شان بیان کرتے ہیں، وہ بالکل الگ شخصیت ہیں اس سے کہ جو اہلِ تشیع اور روافض بیان کرتے ہیں۔ مہدی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اہل السنۃ کا تصورِ مہدی وہی ہے جو تجدیدِ دین کا پورا تصور ہے کہ اللہ کے نبی نے بشارت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے کنارے پر کوئی ایسی شخصیت یا ئی شخصیات اُٹھائے گا جو تجدیدی کام

کریں گے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کا ارشاد ہے: «إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا». (ابو داود) تو یہاں «مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا» سے مراد فرد بھی ہو سکتا ہے، جماعت بھی ہو سکتی ہے۔ تو تجدید کا یہ عمل جاری رہے گا۔ اہل السنۃ کے نزدیک مہدی؛ مجدد اور آخر الزماں ہوں گے۔ وہ ان کو کوئی ایسی شخصیت نہیں مانتے کہ جو کوئی Cosmic شخصیت ہو یا ایسی شخصیت جو اپنے اندر Divinity کا پہلو رکھتی ہو۔ جبکہ اہل السنۃ کے برعکس اہلِ تشیع کے نزدیک اُن کے ائمہ کوسمک شخصیات ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے اندر الوہیت رکھتی ہیں۔ امامت کے بارے میں اہلِ تشیع کا جو تصور ہے اور اس کی جو تفصیلات ہیں وہ ان کی بڑی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ امام مہدی کے مطلق تصور میں اہلِ تشیع کا تو اہل السنۃ کے ساتھ اتفاق ہے، مگر اس کی تفصیلات میں وہ اہل السنۃ کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا جو تصورِ مہدی ہے وہ مُنتَظَر کا ہے، یعنی وہ انتظار میں ہیں۔ یہ "امامِ منتظَر" کا عقیدہ اس لیے انھیں اپنانا پڑا کہ ان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کوئی زمانہ امام کے بغیر نہیں ہو سکتا، لہذا امام موجود ہیں، مگر حاضر نہیں ہیں، ہم ان کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ موجود ان معنوں میں کہ وہ حیات ہیں، لیکن وہ غیبت میں ہیں، یعنی غائب ہیں۔ کچھ سال وہ غیبتِ صغریٰ میں رہے، جس میں چار یکے بعد دیگرے ان کے نائبین رہے تھے۔ اس دور میں وہ اپنے نائبین سے کلام کرتے تھے، انھیں ہدایات دیتے تھے، لیکن اب تقریبًا بارہ سو سال سے زیادہ ہونے کو آئے ہیں کہ اب وہ غیبتِ کبریٰ میں ہیں اور وہ آخر الزماں میں ظہور کریں گے۔ اسی لیے ان کے ہاں ظہورِ مہدی کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور پھر ان کتابوں میں، اُن کے لٹریچر میں جگہ جگہ استعمال ہونے والا لفظ المهدي المنتظَر ہے۔ چونکہ یہ ایک غیر منطقی اور حقیقت سے دور تصور ہے اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے لوگوں نے تاریخ میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور ایک صحیح تصور کو داغ دار کیا، جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کے اندر اس پورے تصور کے بارے میں وحشت پیدا ہو گئی اور انھوں نے اس کا انکار کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کے ہاں بھی غالبًا ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تصور کو مجوسی تصور قرار دیتے ہیں، ایک جگہ انھوں نے کہا کہ یہ ایک مجوسی تصور ہے جو اسلام میں در آیا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ ایک حالتِ انتظار میں ہیں، اس سے ایک بے

عملی اور تعطل پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امتِ مسلمہ کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ ہمیشہ کسی آنے والے کے انتظار میں رہتی ہے کہ کوئی آئے گا اور سارے معاملات ٹھیک کرلے گا۔ تو انھوں نے اس پورے تصور ہی کو غلط کر دیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کو معلوم ہے کہ تقدیر ہے، تقدیر تو ہماری بنیادی ایمانیات کا حصہ ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ چونکہ اس تصور کو حکمرانوں نے ظلم و زیادتی اور جبر و استحصال کے جواز کے لیے استعمال کیا اور اسی طرح کچھ لوگوں نے اسے بے عملی کے سہارے کے طور پر استعمال کیا، گویا:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی

عمل سے فارغ ہوا مسلماں، بنا کے تقدیر کا بہانہ

تو یہ تقدیر بے عملی کا بہانہ بھی ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب جدید دور میں جو دینی فکر سامنے آئی اس میں سے بہت سے لوگوں نے کہہ دیا کہ جناب تقدیر وغیرہ کا تصور بھی گھڑا گیا ہے۔ یہ بھی گویا ان کے خیال کے مطابق اس دین کے خلاف عجمی سازش ہوئی ہے۔ پرویز صاحب کی ایک پوری کتاب ''کتاب التقدیر'' اسی موضوع پر ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ جو تقدیر کا پورا تصور ہے یہ جعلی اور خود سے بنایا ہوا ہے۔ تو اس طرح کے لٹریچر کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ جب اس کا غلط استعمال ہوتا ہے، تو لوگ ان چیزوں کو کسی اور طرح سے دیکھتے ہیں اور بالآخر انکار ہی کر دیتے ہیں۔ مثلاً عیسیٰ داؤد صاحب غالباً یہ لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب لکھی ہے، ہو سکتا ہے کہ جو حقیقت میں مہدی ہوں انھیں بھی خود اپنا شعور نہ ہو، میری یہ کتاب ان کے لیے بھی روشنی کا سبب بنے گی، ہو سکتا ہے کہ میری کتاب ان کے اندر یہ احساس پیدا کر دے کہ وہی مہدی ہیں۔

اس طرح کی روایات کا ایک اور پہلو بھی ہوتا ہے کہ جب بھی لوگوں کے سامنے یہ مہدی وغیرہ کے متعلق روایات آتی ہیں، تو بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اوپر یہ بات سوار کر لیتے ہیں اور آخر کار وہ مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں، اس وقت بھی اگر آپ پاکستان کا سروے کریں گے تو آپ کو پاکستان میں بھی کم از کم درجن بھر مہدی مل جائیں گے۔ جب وہ آپ سے ملتے ہیں تو باقاعدہ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں کہ مجھ سے ملیے، میں مہدی ہوں۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ سادہ لوح اور جذباتی لوگ ہوتے ہیں، جو اس طرح کی باتیں سنتے رہتے ہیں، پھر ان کو کوئی خواب آتا ہے، کوئی مغالطہ ہوتا ہے، کچھ

Delusions ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ بے چارے بعض اوقات Schizophrenic ہوجاتے ہیں اور ایک مصنوعی شخصیت ان کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اور پھر اس طرح وہ دعوے کرنے لگتے ہیں تو یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ وقتاً فوقتاً جو مختلف مہدی ظاہر ہوتے رہے، ان میں جونپور کے ایک مہدی تھے جو مہدی جونپوری کے نام سے مشہور ہوگئے۔ جب ان سے سوالات کیے جاتے تھے، تو بعض اوقات زچ ہوجاتے کیونکہ بہت سی چیزیں ان پر پوری نہیں اتر رہی تھیں۔ ایک موقعے پر انھوں نے اپنے مریدوں اور متبعین سے کہا کہ حدیث میں بہت سا اختلاف پایا جاتا ہے، اور حدیثیں بہت تعداد میں ہیں، پتا نہیں لگتا کہ کون سی صحیح ہے کون سی ضعیف، تو ایسے میں تمھیں کیا کرنا چاہیے؟ تو یوں کرو کہ جو اللہ کی کتاب اور میرے احوال کے موافق ہے اسے قبول کرلو۔ مراد یہی ہے کہ چونکہ میں ہی مہدی ہوں اور میرا ظہور ہوگیا ہے، تو اب کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی غلط، اس کا فیصلہ مجھ سے ہوگا۔ یعنی یہ نہیں ہوگا کہ واقعے کی تصدیق، تغلیط یا تکذیب حدیث کی روشنی میں ہو، بلکہ واقعے کی روشنی میں حدیث کو پرکھا جائے گا۔ ان صاحب کے مزید اس طرح کے لطیفے بھی ہیں۔ آنجناب سے ایک موقعے پر پوچھا گیا کہ آپ کس بنیاد پر مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مہدی قرار دیتے ہیں؟ تو کہتے ہیں کہ میں اپنی طرف سے کوئی دعویٰ نہیں کر رہا، بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کے امر کی بنیاد پر دعویٰ کر رہا ہوں۔ پھر ان سے پوچھا کہ مہدی کے والد کا نام تو عبداللہ ہے اور آپ کے والد کا نام سیّد خان ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا اللہ اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ سید خان کے بیٹے کو مہدی بنا دے۔ ایک اور مقام پر جب ان سے اسی طرح سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ پھر اللہ سے پوچھو کہ اللہ تعالیٰ نے ابنِ سید خان کو مہدی کیوں بنایا؟ یہ تو اللہ کا فیصلہ ہے، ویسے بھی قرآنِ مجید میں آتا ہے کہ: ﴿يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ (الرعد: ۳۹) ''خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے''۔ تو اللہ نے اب (مجھے مہدی بنانا) طے کرلیا ہوگا۔ اسی طرح سے ایک مرتبہ کسی نے ان سے یہی سوال کیا تو کہنے لگا کہ جاؤ پھر تم اللہ سے لڑو (معاذ اللہ) کہ اللہ تعالیٰ نے ابنِ سید خان کو کیوں مہدی بنا کر بھیج دیا۔

تاویلِ فاسد کی ایک مثال

قرآنِ مجید کی تاویل کے حوالے سے ایک مثال دیکھیے کہ امریکہ میں موجود ایک ریاضی دان، رشّاد خلیفہ نے کس طرح ایک فتنہ برپا کیا۔ قرآنِ مجید میں سورۂ مدثر میں جہنم کے بارے میں انیس کا عدد یوں بیان ہوا: ﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ (المدثّر:۳۰) ''اس پر اُنیس داروغے ہیں''۔ انھوں نے ایک خاص طرح سے یہ نظریہ گھڑا کہ اس انیس کے عدد سے قرآنِ مجید کی ساری آیتیں اور سورتیں حل کی جا سکتی ہیں۔ کمپیوٹر کی مدد سے انیس کے ہندسے پر اس کا عملی تجربہ کیا تو سورۂ توبہ کی آخری دو آیات ان کے اس فارمولے پر پوری نہیں اترتی تھیں، تو انھوں نے کہا کہ یہ دونوں آیتیں الحاقی ہیں اور یہاں قرآنِ مجید میں ادخال و ادراج ہوا ہے (معاذ اللہ)۔ تو یوں ہوتا ہے کہ پہلے آپ ایک نظریہ قائم کریں، کچھ چیزیں اس پر پوری اترتی ہوں تو آپ خوش ہو جائیں اور جو پوری نہ اتریں تو ان کی تاویل کر دیں یا ان کا انکار کر دیں۔

*****

احادیثِ فتن سے استنباط کے اصول اور عہدِ حاضر کی چند گمراہیاں

آثارِ فتن کی تفہیم وتعیین میں چونکہ متعدّد آیاتِ قرآنی سے بھی استنباط کیا جاتا ہے، لہٰذا قرآن فہمی کے ذرائع اور آیات سے استنباط کے اُصول، جن کو ہماری دینی روایت میں اصول التفسیر کہا جاتا ہے، ان کا درست فہم ہونا لازم ہے۔ ابتدائی دور میں اصولِ تفسیر الگ سے مرتب نہیں ہوئے تھے، بلکہ اصولِ فقہ ہی میں اس فن کے ضروری مباحث بیان ہوتے تھے۔ چونکہ اصولِ فقہ کا ایک بڑا حصہ متن سے استنباط کے اصول وضوابط پر مشتمل ہے، چاہے متن قرآن کا ہو یا حدیث کا۔ جدید دور میں Hermeneutics کی اصطلاح بہت مقبول ہے، جو در حقیقت اصولِ تفسیر کو ہی کہتے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے اس سلسلے میں نہایت غیر معمولی اور شاندار کام کیا ہے مثال کے طور پر ”لفظ“ کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور اس کے کتنے استعمالات ہوتے ہیں؟ لفظ، حقیقت میں ہے یا مجاز میں، محکم ہے یا متشابہ ہے، ظاہر ہے یا خفی، وغیرہ۔ اسی طرح لفظ کی دلالتوں سے کیا مراد ہے؟ یعنی دلالۃ النص، اقتضاء النص وغیرہ۔ اس جیسی بہت سی تفصیلات اصولِ فقہ میں مرتّب ہوئی ہیں۔ تو احادیثِ فتن کی تفہیم کے لیے اصولِ تفسیر اور سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اس موضوع کے سلسلے میں دوسرا بڑا علم جس سے واسطہ پڑتا ہے وہ احادیث کے قبول اور رد کے حوالے سے اُصول وضوابط ہیں۔ احادیث کی کتنی اقسام ہیں، عقائد اور احکام کے لیے کس درجہ کی احادیث درکار ہیں؟ قصص، اقوال، ترغیب، ترہیب اور فضائلِ اعمال میں کس درجے کی روایات سے کام لیا جاسکتا ہے؟ مزید یہ کہ حدیث میں کنایہ ہے یا مُطلق بات کی گئی ہے، ضعیف حدیث کو بے تکلف اور بلا شرط بیان کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور ضعیف حدیث پر عمل کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح ضعیف حدیث کو بیان کرنے اور عمل کرنے کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہیں۔ نیز یہ کہ لفظ کو اس کی حقیقت پر محمول کیا جائے یا مجازی معنی مراد لیا جائے، اس کا حسّی پہلو لیا جائے یا معنوی پہلو۔ تو آثارِ قیامت کی درست تفہیم وتعیین کے لیے علمِ حدیث یا علمِ اصولِ حدیث کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اسی

طرح چونکہ زیرِ بحث موضوع کا تعلق عقیدے سے بھی ہے اور ہمارے بنیادی عقائد میں ایمانیاتِ ثلاثہ: ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت شامل ہیں۔ اشراط الساعۃ تو بالخصوص ایمان بالآخرت سے ہی متعلق ہیں۔ اس لیے ہمارے ہاں عقائد پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں الگ سے ایک موضوع بنایا گیا ہے ونومن بأشراط الساعة، یعنی ہم قیامت کی نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ تو اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا علوم کی تحصیل اور درست تفہیم کے بغیر اس موضوع کو زیرِ بحث لانا ایک نازک مسئلہ ہے، جس میں بہت احتیاط سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایک لحاظ سے یہ اُصولِ تفسیر اصولِ فقہ، علومِ حدیث، اور علمِ عقیدہ کا موضوع ہے۔

امرِ دین میں گفتگو کرنے کی اہلیت واستحقاق

تعلیم و تعلم کا میدان ہو یا اجتہاد و استنباط کا دائرہ، یا دعوت و تبلیغ اور خدمتِ دین کا میدان ہو، بنیادی بات یہ ہے کہ انسان ہر اس شعبے میں کام کرے جس کی اہلیت اس میں پائی جاتی ہو۔ آپ جو کام کر رہے ہیں کیا آپ اس کے اہل ہیں؟ یہ بہت اہم سوال ہے، ہر دور میں یہ سوال رہا ہے کہ کسی بھی علم یا کسی بھی فن میں کس شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ کلام کرے؟ ایک پرانا محاورہ چلا آرہا ہے: لكلّ فَنٍ رِجَالٌ، "ہر فن کے لیے کچھ لوگ مخصوص ہوتے ہیں"۔ اور ایک شعر بھی ہے:

خلق الله للحروب رجالا

وخَلَقَنا لقصعة و ثريد

"اللہ تعالیٰ نے جنگوں کے لیے کچھ لوگ پیدا کیے ہیں جبکہ ہمیں تو تھالیوں اور ثرید یعنی کھانوں کے لیے پیدا کیا ہے"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کو مختلف کاموں کے لیے خلق کیا ہے، کچھ انسانوں کو جنگوں کے لیے، کچھ لوگوں کو تھالیوں اور ثرید کے لیے، یعنی کچھ لوگ جواں مرد ہوتے ہیں، لڑنے والے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ کھانے پینے والے ہوتے ہیں۔ لہذا ہر آدمی کا ایک فن ہوتا ہے، اس میں وہ مہارت رکھتا ہے۔ جبکہ ایک اور چیز ہے جسے ہمارے ہاں جنرل نالج یا کامن سینس کہتے ہیں، اس کی بات الگ ہے مگر مہارت کسی ایک فن میں ہی

ہوگی۔ ایک لطیفہ ہے کہ Common sense is not so common، تو ایک ہے کامن سینس، ایک ہے جنرل سینس اور ایک ہے جنرل نالج۔ آدمی بعض چیزوں کے بارے میں کوئی نہ کوئی تاثر، کوئی نہ کوئی رائے رکھتا ہی ہے، لیکن علمی اور اصولی طور پر مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کا حق کسے ہے۔ ظاہر ہے یہ حق اس علم وفن کے ماہر ہی کو حاصل ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت خوبصورت بات فرمائی ہے: وإذا تكلم المرء في غير فنه أتى بالعجائب. "جب آدمی اپنے فن کے علاوہ دوسرے فنون میں دخل دے گا تو پھر اس سے عجیب وغریب گفتگو ہی سرزد ہوگی"۔ تو یہ جو اہلیت کا سوال ہے یہ ہمیشہ سے اٹھایا گیا، جیساکہ تفسیر بالرائے ایک موضوع ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے دیگر اکابرین کو پڑھیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا ایک مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ خواہش نفس سے تفسیر کی جائے اور پہلے ہی سے ایک بات طے کرلی جائے، پھر اپنی ہوا اور خواہشات کے تحت اپنے نظریات کے مطابق ڈھالتے ہوئے قرآنِ مجید کی تفسیر کی جائے۔ یہ ظاہر ہے اللہ کی آیتوں کو توڑنا مروڑنا ہے اور یہ قابلِ مذمت تفسیر بالرائے ہے۔ چاہے ایسا کرنے والے کے پاس تفسیر کی ظاہری صلاحیت موجود ہو، لیکن اصل میں اس کی نفسی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تفسیر بالرائے کی دوسری قسم یہ ہے کہ بغیر علم اور بغیر علمی اہلیت کے تفسیر کی جائے۔ یہ بھی خطرناک شے ہے اور بعض اوقات انسان کلامِ الٰہی کی غلط تعبیر کرکے خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کی گمراہی کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے "اصولِ اہلیت" کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اہلیت کی یہ شرط؛ تفسیر کے علاوہ، شرحِ حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں بھی لاگو رہے گی۔

سیادت کے حق دار اہلِ علم ہیں

دین کی تفہیم اور تعبیر کس کی معتبر ہوگی اور کس کی نہیں، تو اس ضمن میں قرآنِ کریم کی اصولی رہنمائی یہ ہے: ﴿فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (سورۃ النحل:۴۳) "اگر تمھیں اس بات کا علم نہیں ہے تو جو علم والے ہیں ان سے پوچھ لو"۔ اس آیت کا سیاق وسباق کے مطابق مطلب تو یہ ہے کہ جو اہلِ ذکر ہیں، یعنی علمائے اہلِ کتاب، ان سے پوچھ لو، کیونکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی حقانیت کے بارے میں

جانتے ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس ساری پیش گوئیاں موجود ہیں۔ لیکن اصولِ تفسیر کی رُو سے ان الفاظ قرآنی کی رہنمائی عام ہے، کہ ہمیں اہلِ علم سے ہی رہنمائی لینی ہے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ سے یہ طے رہا کہ اہل الذکر وہ ہیں جو دینی علم میں بھی پختہ ہیں اور جن کا کردار اور جن کا تقویٰ بھی مسلّم ہے۔ لیکن نوآبادیاتی دور میں جب مسلمانوں کے نظمِ حکومت کے ساتھ ان کا مذہبی اور علمی نظم بھی درہم برہم ہو گیا اور لوگوں کو ایک خاص طرح کی آزادی مل گئی، تو انھوں نے نئی نئی آوازیں برآمد کیں، اپنی اُپچ نکالی، مسلمانوں کی علمی اور مذہبی روایت پر نقب کی اور اسے نشانے پر رکھا۔ مقتدر قوتوں نے بھی اپنے مفادات کے لیے ان کو ابھارا، جس کے نتیجے میں ایک غیر روایتی مذہبی قیادت سو کالڈ سکالرز اور ریسرچ سکالرز اور مفکرین وغیرہ کی پوری ایک کھیپ سامنے آئی۔ بڑے فخر سے بیان ہوتا ہے کہ جناب یہ روایتی مولوی نہیں ہے، بلکہ یہ تو بڑے جدید سکالر ہیں۔ نام کے فرق کے ساتھ یہ معاملہ ہر دور میں سامنے آیا ہے اور خاص طور پر جب زوال ہوتا ہے تو اس میں اس طرح کی چیزیں برآمد ہوتی ہیں۔ اگر ہم اپنے موضوع کی بات کریں تو اس حوالے سے بہت سے لوگوں نے کلام کیا اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ زندقہ کا شکار ہو کر کلام کر رہے ہوں، لیکن چونکہ اس کا معاملہ نیت سے متعلق ہے، جس کو جاننے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کسی کی نیت پر بات نہیں کرتے، لیکن اہلیت کا سوال بہر حال اٹھایا جائے گا۔ اور یہ بالکل حقیقی سوال ہے کہ Who speaks for Islam? یعنی اسلام یا دینی موضوعات کے بارے میں کون کلام کرے گا؟ کس کو اس بارے میں گفتگو کا حق حاصل ہے؟ تو اہل الذکر ہی ہیں، جن کو گفتگو کرنی چاہیے۔ پختہ کار اور تربیت یافتہ علمائے کرام ہی کا منصب ہے کہ وہ دین کی تشریح و تعبیر میں کلام کریں۔ اب اس دور میں معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ وہ لوگ کہ جو دینی علم میں پختہ نہیں ہیں، بلکہ دین کا باقاعدہ علم انھوں نے حاصل بھی نہیں کیا، وہ دینی معاملات میں رائے زنی کرنے لگے ہیں۔ ممکن ہے کوئی شخص ٹیکنوکریٹ ہو، ٹیکنیکل علوم، مثلاً، طب، کمپیوٹر سائنس، اکاؤنٹنگ یا کوئی بھی جدید علم اس نے حاصل کیا ہو، مگر دینی علوم میں مہارت نہ ہو، تو ایسے لوگوں کو دین کے معاملے میں کلام کا حق حاصل نہیں ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ دین کے معاملے میں وہ عوام کی رہنمائی کے منصب پر خود کو فائز نہ کریں، کیونکہ یہ کام عالمِ دین کا ہے نہ کہ کسی عام آدمی کا۔

عالم کی اصطلاح ایک اضافی اصطلاح ہے

یہاں یہ بات سمجھ لیجیے کہ عالم بھی ایک اضافی اصطلاح ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾ (یوسف:۷۶) "ہر عالم سے بڑا ایک عالم ہوتا ہے"۔ امام ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں عمدہ جملہ لکھا ہے: فوق كل ذي علم، رفعه الله بالعلم مَن هو أعلم منه حتى ينتهي العلم إلى الله تعالى. "ہر علم والا جسے اللہ نے علم کے ذریعے بلندی دی ہے اس کے اوپر ایک اور علم والا ہے، یہاں تک علم کلی کی انتہا اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر ہوتی ہے"۔ دین کے بہت سارے علما آج کل موجود ہیں، پھر علمائے سلف موجود ہیں، یہاں تک کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم ہیں، بلکہ ان کے پاس جو علم ہے وہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے، وہ علم ہمارے اوسان اور گمان سے بڑا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ العلیم ہے، جو سب کچھ جانتا ہے اور سارا علم اسی ذاتِ بابرکات سے پھوٹتا ہے۔ لہذا عالم کی اصطلاح ایک اضافی اصطلاح ہے۔ جب ہم علومِ دین کی طرف آئیں تو ہم جانتے ہیں کہ سب علما ایک سطح پر نہیں ہوتے، علما کے بہت سے مراتب ہیں۔ بعض عالمِ دین ایسے ہیں جنھوں نے عمومی طور پر علمِ دین کی تحصیل کی ہے، لیکن بعض نے کچھ چیزوں میں اضافی طور پر تخصیص کے ساتھ سیکھا ہے۔ کسی نے تفسیر میں زیادہ محنت کی، بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھا، اب یہ کہا جائے گا کہ یہ تفسیر کے عالم ہیں۔ کسی نے حدیث میں، کسی نے علم الکلام میں، کسی نے فقہ میں، کسی نے علومِ آلیہ، مثلاً، منطق، صرف و نحو، بلاغت اور علمِ بدیع وغیرہ میں تخصص کیا ہے۔ تو دین کے عمومی معاملات میں عام علمائے کرام سے رہنمائی لینا کافی ہے، لیکن کسی خاص میدان میں رہنمائی کے لیے اس میدان کے متخصّص سے رہنمائی درکار ہوگی۔

جب یہ بات واضح ہوئی کہ دین مستند علمائے دین سے سیکھا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالم کا مصداق کون ہے؟ جس کے پاس درسِ نظامی کی سند ہے کیا وہی عالم ہے؟ تو یہاں اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے باقاعدگی سے کئی سال لگا کر اساتذہ سے دین سیکھا ہے، ان کی صحبت اٹھائی ہے اور اساتذہ نے اس کی تربیت کی ہے اور اسے درس و تدریس اور تعلیم و ارشاد کی اجازت دی ہے، تو ایسے شخص کو عالمِ دین کہا جائے گا۔ پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ لوگ مختلف علما کے پاس جاتے تھے، ان علما کی ملازمت اختیار

کرتے تھے اور ان کے ساتھ رہتے تھے، پھر وہ علما ان کو مختلف علوم اور مخصوص کتابوں کی اجازت دیتے تھے۔ ہمارے بہت سارے اکابر نے اسی طرح علم حاصل کیا تھا۔ اس طرح کا نظام تو اب نہیں ہے، البتہ ہمارے برِ صغیر میں ایک باقاعدہ تعلیمی کورس جسے درسِ نظامی کہتے ہیں مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ تو اب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے باقاعدہ علمِ دین کی تحصیل کی ہے، پھر انھیں اساتذہ کی طرف سے چاہے روایتی شخصی اجازت ہو یا درسِ نظامی کی سند کے ذریعے اجازت دی گئی ہو، وہ علمائے دین کہلائیں گے۔ انھی کا یہ کام ہے کہ وہ دین پر کلام کریں اور عوام کو بھی چاہیے کہ انھی علما سے رجوع کیا کریں۔ آپ ایک اتائی کے ہتھے چڑھ گئے تو آپ کی صحت چلی جائے گی، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ آپ کو ایک غلط انجکشن لگا دیا یا کچھ اور دے دیا، تو اس میں اگرچہ نقصان کا اندیشہ ہے، مگر یہ زیادہ سے زیادہ صحت کا نقصان ہے جبکہ دینی معاملات میں ہم اگر غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ جائیں تو ہمارا ایمان خطرے میں پڑ سکتا ہے، کہا جاتا ہے: ”نیم حکیم خطرۂ جان، نیم مُلا خطرۂ ایمان“ نیم حکیم یعنی نااہل طبیب، ڈاکٹر کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں تو جان کا خطرہ ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت تو مقاصدِ دین اور حفظ ایمان کی ہے، اس کے بعد حفظ جان ہے۔ چونکہ نیم ملا خطرۂ ایمان ہے، وہ آپ کے ایمان کو زائل کر سکتا ہے، تو یہ بات اہم ہے اور ہمیں اسے اہمیت دینی چاہیے۔ یعنی جو کلام کرنے والے ہیں ان کو بھی اہمیت دینی چاہیے اور جو عوام ان سے استفادہ کر رہے ہیں ان کو بھی یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ آپ کون ہیں اور آپ کی نسبت کس سے ہے؟

اِسناد کی ضرورت واہمیت

دین کے معاملے میں گفتگو کرنے والے سے یہ کہنا کہ آپ کون ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی علمی حیثیت کیا ہے، آپ کے اساتذہ کون ہیں اور آپ نے کس سے سیکھا ہے؟ اصطلاح میں اسے اسناد کہتے ہیں۔ امام ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْإِسْنَادِ، فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ، قَالُوا: سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ، فَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ، وَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدَعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ. (مقدمہ صحیح مسلم) ”فتنوں کے پیدا ہونے سے پہلے سند کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا، جب فتنہ رونما ہوا

توحضراتِ اہلِ علم، حدیث بیان کرنے والوں سے کہنے لگے کہ اپنے اساتذہ کا نام بتاؤ! تفتیش کرنے کے بعد صرف اہل السنۃ رواۃ کی روایت قبول کرتے اور اہل بدعت کی روایت رد کرتے تھے“۔ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْإِسْنَادُ مِنَ الدينِ وَلَو لَا الإِسْناد لقال مَن شَاءَ مَا شَاءَ. (مقدمۂ مسلم) ”اسناد (یعنی سلسلۂ سند) دین میں سے ہے، اگر یہ اسناد نہ ہوتی تو کوئی شخص جو چاہتا، وہ کہہ گزرتا“۔ ہمارے ہاں ایک جملہ عام ہے کہ یہ مت دیکھو کون کہہ رہا ہے؟ یہ دیکھو کہ کیا کہا جا رہا ہے؟ یہ بات محدود معنوں میں ٹھیک ہے، ایک حدیث بھی ہے کہ: «الكَلِمَةُ الحِكْمَةُ ضَالَّةُ المُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا». (ترمذی) ”دانائی کی بات مؤمن کی گمشدہ متاع ہے وہ جہاں بھی اسے پائے اس کا دوسروں سے بڑھ کر حق دار ہے“۔ تو یہ بات اس حد تک ٹھیک ہے، جیسے کہ ہمارے ہاں اس طرح کی ضرب المثل بھی ہے کہ: خذ الحكمة من أفواه المجانين. ”حکمت کی بات چاہے مجنون یعنی دیوانے کی زبان سے کیوں نہ ہو لے لو“۔

مگر یہ بات محدود معنوں میں تو ٹھیک ہے، مگر دین کا معاملہ زیادہ نازک ہے، اس لیے دین کے معاملے میں، اصولِ دین کے معاملے میں خاص طور پر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کون کہہ رہا ہے؟ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے، کیونکہ کلام میں جو زور پیدا ہوتا ہے وہ متکلّم سے پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جائے کہ ”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے“، ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے“، تو اس کی الگ حیثیت ہوگی اور جب ہم کہیں کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم یہ فرما رہے ہیں، تو اس کی الگ حیثیت ہوگی۔ اسی طرح جب ہمارے سامنے بات آجائے کہ امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ یہ کہہ رہے ہیں، یہ امام ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کہہ رہے ہیں، یہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہہ رہے ہیں، یہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہہ رہے ہیں۔ تو ان سب کے بلند علمی درجات ہیں، ان کے مقام و مرتبے سے بات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ بہت سے بڑے شاعر ہیں، جب ان کی کوئی غلطی نکالتا ہے کہ فلاں جگہ آپ نے قاعدے کی خلاف ورزی کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میاں قاعدہ واعدہ کیا ہوتا ہے؟ قاعدے تو ہمارے کلام سے متعیّن ہوں گے، ہمارے کلام سے لغت بنے گی، کلام سے قواعد منضبط ہوں گے۔ تو یہ بات اہم ہے کہ کون کہہ رہا ہے، اسی بات کی طرف ہمیں توجہ دینی چاہیے۔

علمِ دین معتبر اساتذۂ فن سے حاصل کیا جائے

اہلیت کے ساتھ یہ سوال بھی اہم ہے کہ آپ نے دین کا علم کہاں سے حاصل کیا، کن کن اساتذہ سے رجوع کیا اور کیا سیکھا؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ علمِ دین سینہ بہ سینہ، نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوا ہے، تو یہاں جن لوگوں سے دین اخذ کیا جا رہا ہے ان کا اہل ہونا بھی ضروری ہے اور یہی اس کا معتبر ذریعہ ہے۔ ہو سکتا ہے کسی شخص نے ماہر اساتذہ کی نگرانی کے بغیر محض اپنے ذاتی مطالعے سے علم حاصل کیا ہو، مگر وہ زیادہ معتمد ذریعہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ Self taught لوگ ہوتے ہیں اور خود سے کتابیں پڑھ پڑھ کر بہت اچھی استعداد بھی پیدا کر لیتے ہیں، لیکن بہر حال، یہ معاملہ خطرناک ہے۔ اس موضوع کے اعتبار سے امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الموافقات'' کے شروع میں کچھ مقدمات لکھے ہیں، وہ سارے پڑھنے چاہییں، لیکن خاص طور پر مقدمہ نمبر بارہ میں انھوں نے اس بحث کو موضوع بنایا ہے، وہ زیادہ لائقِ توجہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ علم کے حصول کا سب سے زیادہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ علم محققین سے لیں۔ ساتھ ساتھ وہ ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا بغیر معلم کے علم حاصل ہو سکتا ہے؟ امکان تو اس کا بہر حال موجود ہے اور ہو سکتا ہے، مگر علم کو معلم ہی سے لینا چاہیے، کیونکہ یہ زیادہ محفوظ راستہ ہے۔ اسی طرح اگر آپ بڑے علما سے علم لیں، تو پھر بھی یہ سوال رہے گا کہ علما کو بھی تو عصمت حاصل نہیں ہے، بربنائے طبعِ بشری ایک بڑے عالم سے بھی چوک ہو سکتی ہے، کیونکہ ہر عالم کی ضلات ہوتی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہاں بھی دونوں باتیں صحیح ہیں، لیکن بہر حال علم کو معلم ہی سے لینا چاہیے۔ چنانچہ دوسرے سوال کے جواب میں وہ کچھ ہدایات ارشاد فرماتے ہیں کہ محقق عالم کون ہے اور اس کی تفصیل میں وہ فرماتے ہیں: اَلْعَمَلُ بِمَا عَلِمَ، ''اپنے علم پر عامل ہو''۔ تفصیل میں لکھتے ہیں کہ معلم کے قول و فعل میں مطابقت ضروری ہے اور اگر ان میں تضاد ہو تو یہ اس لائق نہیں ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے اور نہ اس لائق کہ اس کی پیروی کی جائے۔ دوسری شرط بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں: أَنْ يَكُونَ مِمَّنْ رَبَّاهُ الشُّيُوخُ فِي ذَلِكَ الْعِلْمِ، ''معلم ان لوگوں میں سے ہو جن کی تربیت اس علم کے شیوخ اور ماہرین نے کی ہو''۔ تفصیل میں انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے طرزِ عمل اور سیرت کے

کچھ واقعات سے استشہاد کیا ہے۔ تیسری شرط عملی اور اخلاقی تربیت کے متعلق ہے فرماتے ہیں: الِاقْتِدَاءُ بِمَنْ أَخَذَ عَنْهُ وَالتَّأَدُّبُ بِأَدَبِهِ، ”معلم نے اپنے اساتذہ کی اقتدا کی ہو اور ان سے آداب سیکھے ہوں“۔ اس کے بعد انھوں نے محققینِ اہلِ علم سے اخذِ علم کے دو طریقے بیان کیے ہیں: وَإِذَا ثَبَتَ أَنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ أَخْذِ الْعِلْمِ عَنْ أَهْلِهِ؛ فَلِذَلِكَ طَرِيقَانِ: أَحَدُهُمَا: الْمُشَافَهَةُ، وَهِيَ أَنْفَعُ الطَّرِيقَيْنِ وَأَسْلَمُهُمَا. ”جب یہ ثابت ہو چکا کہ علم اہل لوگوں سے حاصل کرنا چاہیے تو اس کے دو طریقے ہیں، ان میں پہلا طریقہ بالمشافہہ علم حاصل کرنا ہے۔ یہ دونوں طریقوں میں سے بہترین اور محفوظ ترین طریقہ ہے“۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ احادیث وآثار سے اپنی بات کو محقق کیا ہے۔ پھر دوسرے طریقے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دوسرا طریقہ مصنفین کی کتابوں اور مدونات کا مطالعہ ہے جو کچھ شرطوں کے ساتھ فائدہ مند ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ جس میدان کی کتب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اس کی ابتدائی باتیں سیکھ لے اور اس میدان کی علمی اصطلاحات سے واقفیت پیدا کر لے۔ یہ واقفیت کہاں سے آئے گی، فرماتے ہیں: وذلك يحصل بالطريق الأول، ومن مُشَافَهَةِ الْعُلَمَاءِ. ”یہ حصول علم کے پہلے طریقے یعنی علماے کرام سے بالمشافہہ حاصل ہوگی“۔ اب یہ بات خاصی اہم ہے یعنی کتابوں سے علم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا سارے کا سارا انحصار کتابوں کے مطالعے پر ہو، بلکہ ابتدائی علم تو آپ کو بہرحال اساتذۂ کرام ہی سے حاصل کرنا ہے تاکہ مزید مطالعے کے لیے آپ کی بنیادیں مضبوط ہو سکیں۔ لہٰذا سب سے بہتر تو یہ ہے کہ مُشافہتاً یعنی براہِ راست اساتذہ سے علم لیں، یہ بہترین طریقہ ہے۔ البتہ دوسرے درجے میں کتابوں سے بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن کتابوں سے لینے کی بھی کچھ احتیاطیں ہیں، ان کو برتنے کی ضرورت ہے۔ تو جن حضرات کو بھی اس موضوع سے شوق ہے تو وہ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الموافقات“ کے مقدمات میں سے خاص طور پر مقدمہ نمبر بارہ کو دیکھ لیں۔

پاپائیت کا الزام اور اس کی حقیقت

آج کل دین کے معاملے میں کئی لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہاں تو بس Free for all والا معاملہ ہے، کوئی بھی شخص کوئی بھی بات کر سکتا ہے۔ اور اگر کہیں کسی کو توجہ دلائی جائے اور بتایا جائے کہ آپ کو اس حوالے سے گفتگو کرنے کا حق نہیں ہے یا آپ کے اندر اہلیت نہیں ہے، تو جھٹ سے ایک بات کہی جاتی ہے کہ یہ تو پاپائیت ہے اور آپ دین میں پاپائیت قائم کر رہے ہیں۔ اگر پاپائیت سے مراد کوئی ایسی کلاس یا کوئی ایسی شخصیت ہے جس کو عصمت کا مقام حاصل ہو یا جس کو روح القدس گائیڈ کرتے ہوں، جو ہر طرح کی غلطی اور کوتاہی سے پاک ہو اور اس کا کہا گویا خدا کا کہا ہو، اور اس کی بات کا انکار کرنا یا اس کی بات پر کوئی سوال اٹھانا یا اس کی بات پر کوئی اعتراض کرنا یا اس کی بات کے بارے میں کوئی اشکال کسی کے ذہن میں پیدا ہونا ناجائز ہو، تو ان معنوں میں تو پاپائیت اسلام میں نہیں ہے۔ مگر اس طعنے سے اہلیت کی شرط ختم نہیں کی جا سکتی، خواہ معاملہ دین کا ہو یا کسی اور دنیوی فیلڈ کا ہو اہلیت بہر حال شرط ہے۔ کیونکہ ہر علم میں یا ہر ڈسپلن میں کلام کرنے کے لیے یا کوئی رائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ اہلیت درکار ہوتی ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ یہ پاپائیت کی اصطلاح ایک توہین آمیز اصطلاح ہے اور یہ اصطلاح پروٹسٹنٹ فرقے کی طرف سے سامنے لائی گئی تھی۔ چونکہ کیتھولک ازم میں پوپ کا ایک خاص مرتبہ ہے اور اس کے وہ اوصاف ہیں جو ماقبل بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی کیتھولکس یہ سمجھتے ہیں کہ پوپ مُلہَم اور انسپائرڈ ہے یعنی اس پر الہام ہو رہا ہے، القا ہو رہا ہے، مقدس روح یا ہولی اسپرٹ پوپ کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس طرح پوپ کو تقریباً ایک بے خطا اور معصوم ہستی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ مقام و مرتبہ صرف انبیا علیہم السلام کو حاصل ہے۔ انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں اور معصوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام مفترض الطاعۃ ہوتے ہیں یعنی ان کی اطاعت فرض ہوتی ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾ (النساء: ۸۰) "جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی"۔

قرآنِ مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ اے نبی! آپ ملول ہوتے ہیں کہ یہ آپ کی توہین و تضحیک کر رہے ہیں اور آپ کی بات کو قبول نہیں کر رہے ہیں، تو فرمایا: ﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللهِ يَجْحَدُونَ﴾

(الانعام:۳۳) ”اے نبی! یہ آپ کو تھوڑی جھٹلاتے ہیں بلکہ یہ ظالم لوگ تو اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں“۔لہذا نبی کی بات گویا اللہ کی بات ہوتی ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

بہر حال، اسلامی تعلیمات کی رو سے ”عصمت“ خاصۂ نبوت ہے اور رسول اللہ ﷺ خاتم النبیّین بھی ہیں اور خاتم المعصومین بھی ہیں، جبکہ علما اور ائمہ کو یہ مقام حاصل نہیں ہے۔ اہلِ تشیع کے ہاں جو تصوّرِ امامت ہے اس میں بھی عصمت پائی جاتی ہے اور یہ عصمت رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ وہ بارہ ائمہ کے بارے میں عصمت کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں کل تعداد معصومین کی ویسے تو اور بھی زیادہ ہے، لیکن چودہ ہستیوں کو وہ بڑے معصومین مانتے ہیں۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ ہیں، پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور پھر بارہ ائمہ ہیں۔ البتہ اہل السنّۃ کا معاملہ یہ نہیں ہے، بلکہ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی جو اہل السنّۃ کے نزدیک انبیا علیہم السلام کے بعد افضل البشر ہیں، تمام نبیوں کی امّتوں میں سے بھی کوئی غیر نبی شخص سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے کا نہیں ہے، ان کو بھی عصمت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ کہہ دیا کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اگر میں تمھیں اللہ کی کتاب کے مطابق چلاؤں تو میری بات مانو اور اگر میں اس سے انحراف کروں تو میری بات تم نے نہیں ماننی۔ یہ انتہائی اہم بات ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں کوئی پاپائیت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات کہ کوئی Hierarchy اور مراتب ہی نہیں ہیں، تو یہ بات بھی انتہائی خلاف حقیقت ہے۔ دنیا میں کوئی بھی سماج ایسا نہیں ہوتا جو کلاس لیس ہو۔ کارل مارکس نے ایک کلاس لیس سوسائٹی کا خواب دیکھا تھا اور پھر مزید آگے بڑھ کر ایک سٹیٹ لیس سوسائٹی کا خواب بھی دیکھا کہ سٹیٹ بھی ختم ہو جائے گی اور طبقات بھی مٹ جائیں گے۔ یہ کارل مارکس کا خواب ہی تھا اور خواب ہی رہا، کیونکہ ایسا ہوتا نہیں ہے، دنیا میں مراتب ہوتے ہیں، درجہ بندیاں ہوتی ہیں۔ اور مزید یہ کہ بحیثیت مسلمان ہم تو یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ درجہ بندیاں نہ صرف یہ کہ دنیا میں ہیں اور رہیں گی بلکہ آخرت میں بھی ہوں گی، یعنی جنت بھی کوئی یکساں مقام نہیں ہے، جنت کے بھی مراتب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مطلع فرمایا ہے کہ جو نچلی

جنت والے ہوں گے وہ اعلیٰ درجے کے جنت والوں کو ایسے دیکھیں گے جیسے تم آسمان میں کوئی بہت دور کے ستارے کو دیکھتے ہو۔ اسی طرح سے جہنم بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ کلاس لیس ہے، اس کے بھی درجات ہیں، یعنی جس طرح جنت کے درجات ہیں، ایسے ہی جہنم کے بھی درجات ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ درجہ بندی جس طرح ہر میدان میں ہے اسی طرح علمی دنیا میں بھی ہے، چنانچہ ہمارے یہاں درجہ بندی کی بنیاد مطلوبہ اہلیت ہے۔ علمائے دین میں سے جو حضرات مطلوبہ اہلیت کے حامل ہیں تو انھیں اتھارٹی حاصل ہے کہ وہ دین کی تعلیمات کی تشریح کریں اور ان میں کلام کریں۔ جس طرح آپ دنیا کے ہر علم میں اتھارٹی اور Hierarchy کو قبول کرتے ہیں اسی طرح دین میں بھی آپ کو یہ مراتب قبول کرنے چاہییں۔ ذرا سا غور کریں تو یہ بات انتہائی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ دینی علم میں اتھارٹی کے نظام کو تو آپ گالی دیتے ہیں اور پاپائیت کی توہین آمیز اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اگر یہ پاپائیت ہے تو پھر یہ بتائیے کہ فزکس میں پاپائیت کیوں ہے؟ فلکیات، کیمسٹری، ریاضی، نفسیات، عمرانیات وغیرہ میں پاپائیت کیوں ہے؟ یعنی جس معنیٰ میں آپ دینی علم میں اتھارٹی کے نظام کو پاپائیت کہتے ہیں، اس طرح کی ''پاپائیت'' تو آپ ہر ڈسپلن میں مانتے ہیں۔ اور جب کوئی بھی آدمی کوئی کلام کرتا ہے یا کوئی کتاب لکھتا ہے یا کوئی مقالہ لکھتا ہے، تو پہلے اس سے آپ اس کی اسناد پوچھتے ہیں کہ آپ کہاں سے پڑھے ہیں، آپ کی کیا اہلیت و قابلیت ہے، تو اسی اصول کو دین کے معاملے میں کیوں تسلیم نہ کیا جائے۔ بہرکیف، اصل بات یہ ہے کہ جس طرح مختلف شعبہ ہائے زندگی میں یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ جو جس شعبے سے وابستہ ہے اور اس میں اسے مہارت ہے، اسے اس کے لیے اہل سمجھا جاتا ہے کہ اسے یہ حق ہے کہ وہ اس کے متعلق کلام کرے اور اس کے متعلق اپنی رائے پیش کرے۔ اسی طرح یہ اصول، دین کے متعلق بھی تسلیم کیا جائے گا کہ اس میں بھی وہ لوگ گفتگو کریں گے جو اصحابِ علم ہیں، اس سے وابستہ ہیں اور جنھوں نے اپنی زندگیاں اسے سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہیں، کیونکہ انھیں کے اندر اس کی اہلیت واستعداد ہے۔ ظاہر بات ہے یہ ایک معقول رویہ ہے کہ ہر صاحبِ فن کو اپنے فن کے متعلق کلام کرنے کا حق دیا جائے اور ایسے لوگوں کو جنھیں کسی فن کی مبادیات بھی پتا نہ ہوں انھیں یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ رائے زنی کریں اور اپنی طرف سے بلا سوچے سمجھے گفتگو کریں۔ اور جب یہ اصول ایسے شعبوں میں جن

کا تعلق دنیوی معاملات سے ہے، تسلیم کیا گیا ہے تو دین کا معاملہ تو ہر لحاظ سے بڑا نازک ہے اس لیے یہاں تو اسی اصول کی پیروی عقلی اور شرعی دونوں اعتبار سے بھی ضروری ہے، اسے پایۂ ثبوت قرار دینا محض جہالت و نادانی ہے۔

اجتہاد اور اس کی اہلیت و صلاحیت

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو قرآن و سنت کی تعلیمات میں کامل مہارت اور نصوص کی باریکیوں سے انتہائی واقفیت کے بعد ہی کسی کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے، جو پیش آمدہ مسائل میں رہنمائی کا کام سرانجام دے سکے۔ چنانچہ نئے پیش آنے والے مسائل میں انفراداً اور اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد اور صلاحیت و اہلیت ہی اجتہاد کہلاتا ہے۔ اب یہاں ایک اور امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قرآنِ کریم کا متن چونکہ قطعی الثبوت ہے، اس کے برعکس احادیثِ مبارکہ ساری کی ساری قطعی الثبوت نہیں ہیں، ان میں کچھ قطعی الثبوت ہیں اور کچھ ظنی الثبوت ہیں۔ جبکہ اجتہاد کے لیے سب سے پہلے تو روایات کا ثبوت بہت ضروری ہے۔ جب احادیث ٹھیک ہوں، ان کی اسنادی حیثیت پر کوئی کلام نہ ہو تو پھر دوسرا درجہ نصوص سے استنباط کرنا ہے، اور استنباط میں اجتہاد کا کافی عمل دخل ہے۔ اسی طرح احادیث کی صحت کا ثبوت اور قرآن و حدیث کے قطعی الثبوت متن سے استنباط یہ دونوں اجتہادی امر ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کام کون کرے گا؟ ظاہر ہے یہ کام علماے کرام ہی کریں گے اور علما نے یہ کام ہمیشہ سے کیا ہے۔ ماضی میں اہلِ علم، ان نصوص کی شرح اور استنباط کرتے آئے ہیں اور یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کسی صاحب سے سہو نہ ہوا ہو، کوئی غلطی نہ ہوئی ہو، کوئی تساہل نہ ہوا ہو۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ آج لوگ اٹھیں اور کہیں کہ پرانے لوگوں نے بھی یہ باتیں کی تھیں تو ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے۔ یہاں پر بھی اہلیت کی بات ہوگی، یہ ہر آدمی کا کام نہیں ہے کہ وہ اٹھے اور اجتہاد کرنا شروع کر دے۔ علامہ اقبال اجتہاد کے بہت زیادہ شائق تھے اور یہ ان کا بڑا محبوب موضوع تھا، خطبات میں بھی انھوں نے پورا ایک باب Principles of movements in Islam شامل کیا اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''اسلام میں اجتہاد کی تحریک کے اصول''۔ لیکن علامہ اقبال بھی ایک جگہ پر یہ کہتے نظر آتے ہیں:

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

علامہ اقبال یہ فرماتے ہیں کہ رفتگاں، یعنی جو دنیا سے جا چکے ہیں ان کی اقتدا، عالمِ کم نظر کے اجتہاد کی تقلید سے بہتر ہے۔ علامہ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ ان کے زمانے میں اجتہاد اور تجدید کا آوازہ بہت لگ رہا تھا اور اس کا نتیجہ بہت بھیانک ہے۔ علامہ کا ایک اور شعر بھی ہے:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

آج بھی آپ دیکھ لیں کہ جو نئے نئے متجدد و محقق ہیں، ان کو اصلاً متحقق کہنا زیادہ بہتر ہے، یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مغرب کو کسی طرح اسلامائز کر لیں، اسلام کو ویسٹرنائز کر لیں۔ حالانکہ ان لوگوں کے اندر اجتہاد کی کوئی صلاحیت کا سرے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ان کا کردار بھی مشکوک ہوتا ہے۔ بہر حال، اجتہاد کے لیے اہلیت بہت ضروری ہے۔ یہاں ایک بات کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، یہ جو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے: «إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ». (بخاری) ”جب حاکم یا قاضی فیصلہ کرتا ہے اور اجتہاد کرتا ہے اور پھر صحیح رائے تک پہنچ جاتا ہے اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور اگر وہ فیصلہ کرتا ہے، اس میں اپنی پوری کوشش کرتا ہے اور چوک جاتا ہے تو اس کے لیے اکہرا اجر ہے“۔ پیچھے ہم نے حدیث میں دیکھا تھا کہ راسخین علمائے کرام جب اٹھ گئے تو نااہلوں کو لوگوں نے پیشوا بنا لیا۔ اب یہ جو حدیث میں آیا کہ اجتہاد میں درست فیصلہ کرنے والے کو دہرا اجر ملے گا اور خطا کرنے والے کو اکہرا اجر ملے گا، تو اس کا انحصار بھی اہلیت پر ہے۔ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وإنما يُؤجر الْحَاكِم إِذا أَخطأَ إِذا كَانَ عَالما بِالِاجْتِهَادِ فاجتهد وَأما إِذا لم يكن عَالما فَلَا. (فتح الباری) ”جب حاکم اجتہاد کے لائق عالم ہو پھر وہ اجتہاد کرے تو اسے خطا پر اجر دیا جائے گا اور جب کہ وہ عالم نہ ہو تو وہ اجر کا حق دار نہیں ہے“۔ چنانچہ یہ بہت اہم بات ہے کہ وہ حاکم جس کو خطا پر اجر دیا جائے گا، یہ وہ

ہے جو اجتہاد کا علم واہلیت رکھتا ہو اور جو عالم ہی نہیں ہے، تو اس کے اجتہاد کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے، بلکہ اس کو اجتہاد کی اجازت ہی نہیں ہے، تو وہاں اجر کا کیا سوال ہے! پھر علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے: «اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ: قَاضِيَانِ فِي النَّارِ وَقَاضٍ فِي الْجَنَّةِ. قَاضٍ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضَى بِهِ فَهُوَ فِي الْجَنَّةِ وَقَاضٍ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ مُتَعَمِّدًا فَهُوَ فِي النَّارِ وَقَاضٍ قَضَى بِغَيْرِ عِلْمٍ فَهُوَ فِي النَّارِ». (مستدرک حاکم) ''قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں: دو قاضی تو دوزخ میں جائیں گے اور ایک قاضی جنت میں ہو گا۔ ایک قاضی وہ ہے جو حق کو پہچانتا ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو وہ جنت میں جائے گا اور ایک قاضی وہ ہے جو حق کو جانتا ہے لیکن جان بوجھ کر ناحق فیصلہ کرتا ہے یہ دوزخ میں جائے گا اور تیسرا قاضی وہ ہے جو بغیر علم کے فیصلہ کرتا ہے یہ بھی دوزخ میں جائے گا''۔ یہاں دیکھیں کہ تیسرے قاضی کے فیصلے کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں بات نہیں کی گئی، بلکہ اس کی اہلیت پر بات کی گئی کہ وہ بغیر علم کے فیصلے کر رہا ہے تو اسے دوزخ کی وعید سنائی گئی۔ یہ وہ جو قاضی ہے جو نہ رشوت لے رہا ہے، نہ جان بوجھ کر غلطی کر رہا ہے اور نہ ہی اس کی نیت میں خرابی ہے، بلکہ وہ یہ کام بالکل نیک نیتی سے کر رہا ہے، لیکن اس کے پاس علم کی کمی اور اہلیت کا فقدان ہے، اس لیے اس کی وجہ سے اس کا سارا کام غلط قرار دے دیا گیا۔ لہٰذا صرف نیک نیتی کافی نہیں ہے بلکہ کسی دینی امر میں گفتگو کرنے کے لیے مطلوبہ اہلیت وصلاحیت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مخلصین دین کی بات کر رہے ہیں، احادیث کے بارے میں کلام کر رہے ہیں اور کوئی بری نیت نہیں ہے، لیکن محض صحیح نیت، صحیح علم کا قائم مقام نہیں ہے۔ چنانچہ بغیر اہلیت کے جو رائے دی جائے وہ بہر حال، تفسیر بالرائے الفاسد اور تفسیر بالرائے المذموم ہی کہلائے گی۔ اجتہاد کے بارے میں امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: إنما يُؤجر الْمُجْتَهد إِذا كَانَ جَامعا لآلة الِاجْتِهَاد فَهُوَ الَّذِي نعذره بالْخَطَأ بِخِلَاف الْمُتَكَلف فيخاف عَلَيْهِ. (فتح الباری) ''مجتہد کو اس صورت میں اجر دیا جائے گا کہ جب وہ آلۂ اجتہاد کا جامع ہو، (اجتہاد کے لیے جو بھی tools درکار ہیں، وہ اس کے پاس موجود ہیں) اجتہاد میں خطا ہونے پر ایسے ہی شخص کا عذر قبول کیا جائے گا، بر خلاف متکلف کے کہ اس پر تو عذاب کا

اندیشہ ہے"۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں متکلف کا لفظ آیا ہے، جو ہمارے علمی ورثے کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی چیز کے بارے میں سوال پوچھا گیا، جو واضح نہیں تھی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «نُهِينَا عَنِ التَّكَلُّفِ». (بخاری) "ہمیں تکلف سے روکا گیا ہے"۔ متکلف وہ ہے کہ جسے علم وفہم کچھ بھی نہیں ہے، معلوم کچھ نہیں ہے، نہ اس نے علوم سیکھے، نہ زبان آتی ہے، نہ اس کو طریقۂ استنباط کا کچھ پتا ہے، لیکن اس کو بس اپنی Gut feeling سے یا حالات کو دیکھ کر اپنی طرف سے کوئی بات نکال کر کر رہا ہے۔ لہذا اس کے لیے اکہرے ثواب کا کیا سوال بلکہ ڈر ہے کہ ہو سکتا ہے، کہ اسے آخرت میں دُرّے لگیں۔ متکلف کی عام عادت یہ ہے کہ اس سے چاہے پوچھا نہ جائے پھر بھی آگے بڑھ کر جواب دینے کی کوشش کرے۔ ایک روایت میں ہے کہ: «لَا يَقُصُّ إِلَّا أَمِيرٌ أَوْ مَأْمُورٌ أَوْ مُخْتَالٌ». (ابوداود) "کسی اہم معاملے میں گفتگو نہیں کرے گا سوائے امیر یا اس کی طرف سے مامور یا کوئی متکبر شخص"۔ وعظ یا دینی بات نہیں کرے گا مگر یا تو حکمران جو اتھارٹی رکھتا ہے یا وہ جسے حکمران مامور کرتا ہے، جبکہ اولوالامر میں حکمران اور علما دونوں شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی اتھارٹی پر نہیں ہے، نہ دینی اتھارٹی پر ہے اور نہ ہی سیاسی اتھارٹی پر، لیکن اس کے باوجود پیشوائی جتلا رہا ہے تو یہ متکلف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ: «لَا يَقُصُّ عَلَى النَّاسِ إِلَّا أَمِيرٌ أَوْ مَأْمُورٌ أَوْ مُرَاءٍ». (مسندِ احمد) "لوگوں میں وعظ و بیان نہ کرے مگر یا تو امیر یا اس کا مقرر کردہ کوئی شخص یا شیخی خور"۔ یہ تیسرا آدمی دکھاوا کرنے والا ہے یا شیخی خور ہے، Show off کرتا ہے، تو کہا کہ کوئی آدمی خود سے آگے بڑھے تو یہ بھی اچھی بات نہیں ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: «مَنْ أُفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ إِثْمُهُ عَلَى مَنْ أَفْتَاهُ». (ابوداود) "جس شخص کو کسی دوسرے نے بغیر علم کے فتوی دے دیا (اور اس سے کوئی غلط کام ہو گیا) تو اس کا گناہ غلط فتوی دینے والے کو ہوگا"۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اہلیت کا سوال عموماً ہر موضوع میں پیدا ہوتا ہے، مگر دین کی بات بہت زیادہ حساسیت کی حامل ہے۔ اس لیے یہ سوال دین کے ہر موضوع کی طرح احادیث اور احادیثِ فتن اور اشراط الساعۃ میں بھی پیدا ہو گا کہ کوئی شخص جو ان موضوعات پر کلام کر رہا ہے، خواہ وہ صحافی ہے، دانشور ہے، بیوروکریٹ ہے یا سو کالڈ

مفکر ہے، یا جدید معنوں میں انٹیلکچول ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی اور دوسری چیزوں میں بہت کارنامے انجام دیے ہوں گے۔ لیکن جب بات دین کی آجائے تو یہ ایسے لوگوں کی فیلڈ نہیں ہے، یہاں اسے گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہے یہاں ایسے دانشوروں کے لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔

احادیثِ فتن پر کلام اور اس کی اہلیت

اب ہم احادیثِ فتن سے استدلال کی طرف آتے ہیں، کہ اس میں بعض لوگ اسرائیلیات سے استدلال کرتے ہیں، اور مطلوبہ احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ اسرائیلی روایت قرآن وسنت کے موافق ہے یا مخالف ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی تو قرآن وسنت کا علم درکار ہے۔ تو ایک عالم جب یہ کام کرے گا تو اس کے پاس ایک کسوٹی ہے، اس کے پاس معیار ہے، اس کی نصوص پر نگاہ ہے، تو وہ یہ احتیاط ملحوظِ خاطر رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو جانتے ہی نہیں، جو علم میں ناپختہ ہیں، کوئی صحافی تو کوئی مفکر ہے، کوئی دانشور ہے تو کوئی بیوروکریٹ ہے، کوئی انجینیر ہے تو کوئی ڈاکٹر ہے، تو یہ لوگ جب کلام کریں گے تو پھر ظاہر بات ہے ان کی وہ نگاہ نہیں ہے قرآن وسنت پر، تو وہ یہ فیصلہ کیسے کریں گے کہ یہ اسرائیلی روایت کا محمود حصہ ہے یا یہ مذموم ہے یا مسکوت عنہ ہے، خاص طور پر حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے میں لکھا ہے: فِي هَذِهِ الْمَسْأَلَةِ التَّفْرِقَةُ بَيْنَ مَنْ لَمْ يَتَمَكَّنْ وَيَصِرْ مِنَ الرَّاسِخِينَ فِي الْإِيمَانِ فَلَا يَجُوزُ لَهُ النَّظَرُ فِي شَيْءٍ مِنْ ذَلِكَ بِخِلَافِ الرَّاسِخِ فَيَجُوزُ لَهُ.(فتح الباري شرح صحيح البخاري،ج:۱۳، ص:۵۲۶)"اس مسئلے میں تفریق کرنی پڑے گی کہ جو دین کا پختہ علم نہیں رکھتا، جو رسوخ نہیں رکھتا، تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس طرح کے کسی معاملے میں وہ بحث ونظر کرے، برخلاف راسخ کے کہ اس کے لیے جائز ہے"۔ تو یہ بہت اہم بات ہے جو حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ بیان کر رہے ہیں کہ اسرائیلیات کی تحقیق کون کرے گا؟ یعنی کہ اہلِ کتاب کی مقدس تحریریں کون پڑھ سکتا ہے کون نہیں پڑھ سکتا؟ تو کہتے ہیں جو راسخ فی العلم ہے وہ پڑھ لے اس کے بارے میں اندیشہ نہیں ہے کہ وہ گمراہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے اور دین میں پختہ ہے، وہ تو دین کے دفاع کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ لیکن جو راسخ فی العلم نہیں ہے اس کے بارے میں ڈر ہے

کہ کہیں وہ بہہ ہی نہ جائے۔ لہٰذا دین کے معاملات میں وہی بات کرے گا جس کے اندر اس کی اہلیت ہوگی، یہ وہ علما ہیں جو رسوخ فی العلم رکھتے ہیں۔

نصوص سے استنباط کی صلاحیت اور احتیاط

علاماتِ قیامت کے متعلق احادیث میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں کیا ان کو ہم حقیقت پر محمول کریں گے یا ان کو ہم مجاز میں لے کر جائیں گے؟ ان الفاظ کے لٹرل معنی دیکھیں گے یا ان کو تشبیہ اور استعارے کے انداز میں سمجھیں گے؟ تو یہ ایک اہم مسئلہ ہے کیونکہ یہاں جو باتیں بیان کی گئی ہیں اس میں ان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جو Metaphysical ہیں، لیکن زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں کہ جو اسی دنیا سے متعلق ہیں اور اسی دنیا کے کچھ ایونٹس ہیں۔ مثلاً جو ہم نے باتیں کی تھیں کہ بدکاری پھیل جائے گی، جہل کا دور دورہ ہوگا اور قتل وغارت گری ہوگی، تو یہ ہمارے زمانے میں بالکل واضح نظر آنے والے معاملات ہیں۔ لیکن جب صدرِ اسلام میں کہا جاتا تھا کہ یہ آگے کی خبریں ہیں، تو ایک لحاظ سے ان میں بہت سے لوگوں کے لیے تعجب کا پہلو بھی ہوتا تھا۔ چونکہ وہ جن حالات میں ہیں، ان کے سامنے اللہ کے نبی ﷺ کی موجود ہیں اور خیر کا غلبہ ہے، تو ایسے ماحول میں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بدکاری پھیل جائے گی اور علم اٹھ جائے گا تو انھیں یہ باور کرنے میں دقت ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی اقوام تم پر ایک دوسرے کو ایسی دعوت دیں گی جیسے دستر خوان پر کھانا چن کے لوگ ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں، تو صحابہؓ کرام کو بھی حیرت ہوئی اور پوچھا کہ کیا ہم بہت تھوڑے ہو جائیں گے؟ یعنی یہ بات ان کے لیے باعث حیرت تھی۔ تو اسی طرح بہت سے واقعات، مثلاً مہدی، دجال، دابۃ الارض اور خسوف ہیں، یہ سارے واقعات مستقبل میں ہیں۔ تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان احادیث میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کو ہم کیسے دیکھیں گے؟ اب اس کے کچھ حصے کے بارے میں اسی طرح کی دو آرا ہیں، جس طرح آیاتِ صفات کے بارے میں ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں جو بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہیں، یا اللہ کا ہاتھ ہے، یا اللہ کا چہرہ

ہے، یا اللہ کی پنڈلی ہے، وغیرہ، اس کو کیسے دیکھیں گے؟ تو اس کے متعلق ایک مذہب اہلِ تاویل کا ہے اور ایک مذہب اہلِ تفویض کا ہے۔ تو یہاں پر بھی جو تشریحات ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں سے کچھ لوگ ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو بات نبیٔ اکرم ﷺ نے جن الفاظ میں بیان فرمائی ہے ہم اسے حقیقت پر ہی محمول کریں گے، اس کو ہم مجاز میں نہیں لے کر جائیں گے۔ اس کی اگر مثال ہم یہ دیکھیں کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ فرات ہٹ جائے گا اور اس کے اندر سے سونے کا پہاڑ برآمد ہو گا اور پھر لوگ اس پر جنگ کریں گے اور بڑے گھمسان کا رن ہو گا۔ اور وہاں آپ نے تلقین فرمائی کہ جو کوئی بھی یہ واقعہ دیکھے یا پائے تو وہ اس سے تعارض نہ کرے اور اس خزانے کے پاس نہ جائے۔ اب یہاں پر یہ بات کی کہ یہ جو کہا گیا سونے کا پہاڑ اندر سے برآمد ہو جائے گا تو اگر آپ اس کو یہ سمجھیں کہ یہ حقیقی معنوں میں کہا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سونے کا پہاڑ نکلے گا۔

جدید دور میں عرب دنیا میں Petro dollar کی بہتات ہے یعنی پیٹرول دریافت ہو گیا ہے اور اس کی تجارت ہو رہی ہے، بہت سے لوگوں نے تشریح کی ہے کہ شاید سونے کے پہاڑ سے مراد پیٹرول ہے۔ پیٹرول سمندر کے اندر اور زیرِ زمین پانی سے برآمد کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی کچھ روایتوں میں الفاظ آتے ہیں کہ دجال کا ایک گدھا ہو گا اور اس کا ایک ایک قدم وہاں پڑے گا جہاں حدِ نگاہ ہوتی ہے۔ یہاں جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کو ہم نے حقیقت پر محمول کرنا ہے، تو ان کے نزدیک یہ بہت بڑے سائز کا گدھا ہی ہو گا اور اس کے دونوں کانوں کے درمیان ستر ہاتھ کا فاصلہ ہو گا اور وہ اڑتا پھرے گا۔ اس تصور کے برعکس بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے تو اپنے زمانے میں جو چیزیں ان کے سامنے تھیں اس کے حوالے سے ہی سمبلز بیان کرنے تھے۔ مثال کے طور پر غلام احمد قادیانی نے جب اپنے آپ کو مسیح قرار دیا، تو پھر اس کو یہ بھی بتانا تھا کہ دجال کون ہے اور دجال کی سواری کیا ہے، تو اس نے ریل گاڑی کو دجال کا گدھا قرار دیا۔ اور اسی طرح آج کل بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی نے جو بات بتائی تھی وہ اب ہم نے دیکھ لی ہے کہ یہ جو جیٹ طیارے ہیں یا Supersonic planes ہیں، وہ اصل میں دجال کی سواری ہے۔ اسی طرح آخری زمانے میں جنگیں ہوں گی، اس میں تیر، تلوار اور گھوڑوں کا تذکرہ ہے۔ تو اس کے متعلق بھی بہت سے لوگ کہیں

گے کہ یہ تو اصل میں مجاز ہے، اور اللہ کے نبی نے اپنے زمانے کی Artillery اور اپنے زمانے کی جو جنگی سواریاں استعمال ہوتی تھیں، ان کا ذکر کیا ہے۔

ان احادیث کی مذکورہ تشریح کے برعکس کچھ لوگ اصرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اللہ کے نبی نے کہا ہے کہ گھوڑا ہوگا اور اس کے بعد تیر تلوار ہوں گے تو اس کا مطلب ہے تیر تلوار ہی ہوں گے۔ اور پھر وہ پوری طرح اس کو تھیورائز بھی کرتے ہیں کہ جیسے یہ Technological boom آئی ہوئی ہے، اس سے کوئی بہت بڑے ڈیزاسٹرز ہوں گے اور اس کے بعد دنیا دوبارہ Primitive دور میں چلی جائے گی۔ جیسا کہ ہمارے ہاں ایک اصطلاح استعمال کی جاتی ہے کہ پتھر کے دور میں واپس چلے جائیں گے، تو گویا وہ یہی کہتے ہیں کہ دوبارہ سے ایسے حالات آئیں گے کہ ساری ٹیکنالوجی ختم ہو جانے کے بعد یہ چیزیں استعمال میں آ جائیں گی۔ اور یہ بات صرف مذہبی لوگ نہیں کرتے بلکہ یہ تو وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو اس سارے Religious discourse کو نہیں مانتے۔ بہر حال، کچھ لوگ ہیں جو اس طرح کی پیش گویاں کرتے ہیں، اس پر اسی طرح کی ڈاکومنٹریز بھی بنتی ہیں کہ World without oil اور World without electricity، یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی بہت بڑا سانحہ ہو اور جس سے یہ سارے جو Modern gadgets ختم ہو جائیں۔ یہ چند مثالیں یہ بات واضح کرنے کے لیے بیان کی گئیں کہ اختلاف کا ایک Standard یہ بھی ہے، کہ کیا ہم ان الفاظ کو حسی معنوں میں لیں گے یا معنوی انداز میں لیں گے۔ چنانچہ پیش گوئیوں کی جو آیات اور روایتیں ہیں ان کے محمل میں اختلاف پہلے سے بھی چلا آ رہا ہے، مثلاً، سورۂ دخان میں ہے: ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ "اس دن کا انتظار کرو جب آسمان ایک واضح دھواں لے کر نمودار ہوگا"۔ اس دخانِ مبین کے متعلق سیدنا عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سمجھتے تھے کہ دورِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو ایک قحط آ گیا تھا، اور اس زمانے میں جب لوگ آسمان کی طرف نگاہ کرتے تھے تو ان کو دھواں سا محسوس ہوتا تھا، تو اس سے مراد وہ ہے۔ اسی طرح وہاں اسی سورت میں ﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ﴾ "جس دن ہماری طرف سے سب سے بڑی پکڑ ہوگی"۔ ہے، تو انھوں نے کہا کہ یہ اصل میں بدر کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن سیدنا عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ان دونوں آیتوں کا اطلاق قیامت کی نشانیوں پر کرتے تھے

اور علامات الساعۃ میں جس دخان کا تذکرہ ہے، اس دخانِ مبین کو وہ اُس سے جوڑتے تھے۔ اسی طرح یہ معاملہ ابنِ صیاد کے بارے میں پیش آیا کہ یہ دجال ہے یا نہیں ہے۔

اسی طرح قرآنِ مجید میں یاجوج ماجوج کی مثال ہے، اس پر ہمارے قریب کے اردو مفسرین نے کلام کیا ہے۔ ان میں سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا اصلاحی اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہم نے یاجوج ماجوج کو متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے اور اس پر بائبل کے کچھ Quotations لے کر اور کچھ تاریخی واقعات سے اس کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تو اس پر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں نقد بھی کی ہے اور ان کی کچھ باتوں کی تردید و توضیح بھی کی ہے۔ اس ساری تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ نصوص کے اطلاقات میں اس طرح کا اختلاف ہوتا رہا ہے۔ اب اس میں قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ استعارے وغیرہ کی حد کیا ہے، یعنی یہ بات کہ جہاں کچھ متعیّن افراد کا تذکرہ ہوگا کیا اس کو بھی ہم مجاز اور استعارے میں لے جاسکتے ہیں؟ مثلاً مہدی ہے، تو مہدی ایک متعیّن شخصیت ہے، اسی طرح سے دجال ایک شخص کا نام ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے یہ پتا لگتا ہے کہ وہ ایک مشخّص وجود ہے، وہ کوئی سمبل نہیں ہے۔

اسی طریقے سے سیدنا مسیح علیہ السلام کا جو آپ نے تذکرہ کیا ہے، ان کا حلیہ مبارک بیان کیا ہے تو اس سے پتا لگتا ہے کہ وہ متعیّن شخصیت ہیں اور وہ فی نفسہ مسیح ہیں جو نازل ہوں گے۔ لہٰذا یہ جو ہمارے ہاں کچھ گمراہ لوگوں نے جمہور سے الگ راستہ اختیار کیا، مثلاً جس طرح غلام احمد قادیانی نے کہا کہ مسیح تھوڑے ہی آئیں گے، یہ تو ختمِ نبوت کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اصل میں ختمِ نبوت کو مانتے ہیں اور ختمِ نبوت کا تقاضا ہے کہ مسیح نہیں آئیں گے بلکہ مثیلِ مسیح آئے گا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ مسیح کا تو انتقال ہوگیا ہے، کشمیر میں ان کی قبر ہے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے کہا کہ ٹی وی دجال ہے، کسی نے کہا کمپیوٹر دجال ہے، کسی نے کہا یہ www دجال ہے، کسی نے کہا امریکہ دجال ہے، کسی نے کہا کہ یہ پوری مغربی تہذیب دجال ہے۔ بے شک مغربی تہذیب ایک دجالی تہذیب ہے، یہ اپنی جگہ درست بات ہے، لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ دجال کوئی Personified وجود نہیں ہے، بلکہ ایک تہذیب کا استعارہ ہے، تو یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح مہدی کے بارے میں اگر کوئی یہ کہے کہ مہدی کوئی شخص نہیں، بلکہ ہر ہدایت یافتہ مہدی ہے۔ اقبال نے کہا:

ہوئی جس کی خودی پہلے بیدار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

ہر وہ آدمی کہ جس کی خودی بیدار ہو جائے، تو وہ مہدی یعنی ہدایت یافتہ ہے۔ اب اس کو بنیاد بنا کر کوئی یہ کہنا شروع کرے کہ اہلِ ایمان میں سے جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں وہ مہدی ہیں اور مہدی کوئی مخصوص شخصیت کا نام نہیں ہے، تو یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے۔

بہر کیف، یہ بات کہ کیا ہم نصوص کو حقیقت پر محمول کریں گے یا مجاز میں لیں گے، تو یہ صدرِ اسلام ہی سے ایک اہم مسئلہ ہے اور بعد میں محققین اصولیین نے اس پر بہترین کلام کیا ہے اور اس کے اصول و قواعد مقرر کیے ہیں۔ اس کی ایک مثال جو بہت واضح ہے، کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: أَيُّنَا أَسْرَعُ بكَ لُحُوقًا؟ یعنی ہم میں سے کون ہیں جو سب سے جلدی آپ سے جا ملیں گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَطْوَلُكُنَّ يَدًا». تم میں سے جو اپنے ہاتھ کے اعتبار سے سب سے لمبی ہے (یعنی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہے)۔ روایت میں آتا ہے: فأَخذُوا قَصَبَةً يَذْرَعُونَهَا، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات نے لکڑی لے کر اپنے ہاتھ ماپنا شروع کیا۔ بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ سب سے پہلے سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا دنیا سے رخصت ہوئیں، تو اس وقت ان کو خیال آیا کہ اصل میں اللہ کے نبی ﷺ نے جو فرمایا تھا: أَطْوَلُكُنَّ يَدًا، اس سے مراد مجاز تھا، یہ کہ کوئی Physical ہاتھ لمبا ہونا نہیں تھا۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، جب حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو ہمیں پتا لگ گیا کہ اس سے مراد ہے: أَنَّما كَانَتْ طُولَ يَدِهَا الصَّدَقَةُ، کہ یہاں پر ہاتھوں کے لمبے ہونے کا مطلب زیادہ صدقہ کرنا ہے۔ کیونکہ بخاری کی روایت کے مطابق: فكانت أطولنا يداً زينب؛ لأنها كانت تعمل بيدها وتصدق. ”پھر ہم پر یہ بات کھلی کے اصل میں ہم میں سب سے لمبے ہاتھ والی زینب تھیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ بھی دیتی تھیں“۔
تو یہاں پر بھی ازواجِ مطہرات نے اس کو لٹرل لیا، یعنی حقیقت پر محمول کیا، لیکن اصل میں وہ مجاز تھا۔

کبھی الفاظ کے ظاہری معنیٰ مقصود نہیں ہوتے، بلکہ اس سے مراد کچھ اور ہوتی ہے، جیسے بخاری کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:«لا تَقُومُ السَّاعَةُ حتَّى تَضْطَرِبَ أَلَيَاتُ نِساءِ دَوْسٍ، حَوْلَ ذِي الخَلَصَةِ». ”قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوس قبیلے کی عورتوں کی سرینیں ذوالخلصہ کے بت پر مضطرب ہوں گی“۔ یہاں پر سرینوں کا اضطراب میں آنا، ہلنا یہ استعارہ تھا کہ وہ ذوالخلصہ کے بت کے پاس والہانہ جائیں گی اور اس کے گرد طواف کریں گی، اور اس سے ان کی کمریں ہلیں گی۔ یہاں پر بھی الفاظ اور ہیں لیکن اس سے مراد کوئی ڈانس کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود سعی کرنا ہے، دوڑنا ہے، طواف کرنا ہے۔ اس کی ایک اور جلی مثال ہے، اس کے ذکر سے بات مزید واضح ہوگی، وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بخاری کی روایت ہے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بینما نحن جلوس عند عمر، اس دوران کہ ہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے، إذ قال، انھوں نے فرمایا: أَيُّكُمْ يَحْفَظُ قَوْلَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الفِتْنَةِ؟ تم میں سے کون ہے جسے فتنے کی بابت نبی کریم ﷺ کا قول یاد ہے؟ تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: «فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ وَوَلَدِهِ وَجَارِهِ، تُكَفِّرُهَا الصَّلاَةُ وَالصَّدَقَةُ، وَالأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيُ عَنِ المُنْكَرِ». مراد یہ ہے کہ آدمی کا فتنے میں پڑنا اپنے گھر والوں کے حوالے سے، مال کے حوالے سے، اولاد کے حوالے سے اور پڑوسی کے حوالے سے اور ان کا کفارہ نماز، روزہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہیں۔ (یعنی انسان اپنے گھر کے معاملات میں، بچوں کے معاملات میں، پڑوسی کے معاملات میں، مال کے حوالے سے کوتاہیوں کا شکار ہوجاتا ہے اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزیاں اس سے ہوجاتی ہیں)۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی تلافی کے لیے ایک نظام بنایا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ نیکیاں برائیوں کو زائل کردیتی ہیں۔ نماز، روزہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ۔ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لَيْسَ عَنْ هَذَا أَسْأَلُكَ، وَلَكِنِ الَّتِي تَمُوجُ كَمَوْجِ الْبَحْرِ، میں اس طرح کے عمومی فتنے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا، بلکہ میں تو اس فتنے کے بارے میں سوال کررہا ہوں کہ جو ایسا آئے گا جیسے سمندر کی موجیں ہوتی ہیں، (یعنی بالکل ہمہ گیر اور بہت غیر معمولی)۔ تو

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: لَيْسَ عَلَيْكَ مِنْهَا بَأْسٌ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، اے امیر المومنین! آپ کو اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، إِنَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهَا بَابًا مُغْلَقًا، آپ کے اور اس فتنے کے درمیان ایک دروازہ ہے جو بند ہے (یعنی وہ فتنہ آپ تک نہیں پہنچ سکے گا)۔ قَالَ عُمَرُ: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: أَيُكْسَرُ الْبَابُ أَمْ يُفْتَحُ؟ کیا وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا (یعنی زبردستی اس کو توڑا جائے گا یا خود سے کھولا جائے گا)؟ قَالَ: لَا، بَلْ يُكْسَرُ، تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں بلکہ توڑا جائے گا۔ قَالَ: إِذًا لَا يُغْلَقُ أَبَدًا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، پھر اسے دوبارہ کبھی بند نہیں کیا جا سکے گا، قلت: أَجَلْ. جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات کہی، تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب جب سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بیان کی، تو وہاں موجود لوگ کہتے ہیں: قُلْنَا لِحُذَيْفَةَ: ہم نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: أَكَانَ عُمَرُ يَعْلَمُ الْبَابَ؟ کیا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دروازے کا پتا تھا کہ وہ دروازہ کیا ہے؟ قَالَ: نَعَمْ، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں، كَمَا يَعْلَمُ أَنَّ دُونَ غَدٍ لَيْلَةً، کہا ایسا ہی ان کو یقینی طور پر پتا تھا جیسے انسان کو پتا ہے کہ دن کے بعد رات آتی ہے۔ پھر انھوں نے کہا: وَذَلِكَ أَنِّي حَدَّثْتُهُ حَدِيثًا لَيْسَ بِالْأَغَالِيطِ، یہ جو میں تمھیں باتیں بتا رہا ہوں یہ کوئی مغالطے میں ڈالنے والی، خودساختہ باتیں نہیں ہیں۔ فَهِبْنَا، تو حاضرین کہتے ہیں کہ پھر ہم ڈر گئے، أَنْ نَسْأَلَهُ مَنِ الْبَابُ؟ اس دروازے کے متعلق سوال کرنے سے کہ یہ دروازہ کون ہے؟ یعنی ہمارے اندر وہ تجسس تو پیدا ہو گیا تھا کہ جس دروازے کی بات ہو رہی ہے وہ دروازہ کیا ہے؟ فَأَمَرْنَا مَسْرُوقًا فَسَأَلَهُ، تو ہم نے مسروق سے کہا جو ایک جلیل القدر تابعی اور بڑے عالم ہیں، کہ آپ ذرا ہمت کریں اور آپ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھیں، تو انھوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: مَنِ الْبَابُ؟ یہ دروازہ کون سا ہے؟ قال: عُمَرُ. تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خود وہ دروازہ ہیں۔ گویا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ وہ اصل میں فتنوں کے لیے سدِ راہ ہیں۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کو پتا تھا کہ وہ میں ہوں تو پھر کیوں پوچھا؟ تو اس کا جواب

یہ ہے کہ انھوں نے اسی لیے پوچھا کہ کیا اس کو توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا طبعی موت مجھے آئے گی یا مجھے شہید کیا جائے گا، تو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نہیں آپ کو شہید کیا جائے گا۔ ویسے ہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی آرزو تھی اور دعا تھی کہ اے اللہ! مجھے شہادت کی موت عطا فرما اور اپنے حبیب کے شہر میں دفن ہونا نصیب فرما! حالانکہ آپ رضی اللہ عنہ امیر المومنین ہیں اور مدینہ مسلمانوں کا مرکز ہے، تو اس بات کا عجیب امکان کہ مدینے میں آپ کی شہادت ہو اور یہاں دشمن آجائیں اور جنگ ہو! لیکن شہادت مانگ رہے ہیں اور پھر یہ بھی مانگ رہے ہیں کہ میری تدفین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار میں ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی، ایک مجوسی ابولولو فیروز نے ان کو مدینے میں مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں نماز پڑھتے ہوئے شہید کیا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں ان کو جگہ بھی مل گئی۔ تو یہاں پر الفاظ کے حقیقی معنیٰ مراد لینے کے بجائے استعارے کی زبان میں بات کی گئی ہے اور جو دروازہ بتایا گیا وہ دروازہ عام دروازہ نہیں ہے بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خود ہیں۔ یہاں یہ پیش گوئی بھی کر دی کہ اگر اسے توڑا جائے گا تو پھر یہ دروازہ کبھی بند نہیں ہو گا، چنانچہ پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے نصفِ ثانی میں فتنے شروع ہوئے پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی جاری رہے اور اس کے بعد پھر معاملات اور بھی خراب ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ یہ جو اس طرح کی روایتیں ہیں، جن میں یہ باتیں بیان ہوئی ہیں، یہ اپنے لٹرل معنوں میں نہیں ہیں بلکہ اپنے مجازی اور استعاراتی اور تشبیہی معنوں میں ہیں۔ اب یہ کیسے معلوم ہو گا کہ روایات میں کہاں حقیقی معنیٰ مراد لیں گے اور کہاں مجازی، تو اس میں اصل تو حقیقی ہی ہیں، مگر جہاں مجازی معنیٰ مراد لیں گے تو وہاں اس کے قرائن سے پتا لگایا جائے گا۔ اور اس پر ہمارے اصولِ فقہ کے ائمہ نے بڑا کام کیا ہے اور اس کے اصول و قواعد وضع کیے ہیں۔

حقیقت سے دور ایک تاویل کی مثال

ہم ماقبل ملاحظہ کر چکے ہیں کہ علاماتِ قیامت کی تفہیم کے سلسلے میں جتنی روایات ہیں، ان میں مجازی معنیٰ مراد لینے کے زیادہ امکانات ہیں، مگر یہ کون بتائے گا کہ کہاں حقیقی معنیٰ مراد لیے جائیں اور کہاں مجازی، تو ظاہر بات ہے یہ ہر کسی کا کام نہیں ہے، اس باب میں وہ لوگ بات کریں گے جو اس کے اہل ہیں۔ مگر بدقسمتی

سے یہاں بعض لوگ دور از کار تاویلات اختیار کرتے ہیں، مثال کے طور پر قرآن میں وارد دابۃ الارض کا ذکر ہے: ﴿وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ﴾ (النمل: ۸۲) ''اور جب ہماری بات پُوری ہونے کا وقت اُن پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے''۔ حافظ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ دابۃ الارض کے بارے میں کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ: إنسانا متكلما يناظر أهل البدع والكفر ويجادلهم فينقطعوا فيهلك من هلك عن بينة ويحيى من حيي عن بينة. (القناعة في ما يحسن الإحاطة من أشراط الساعة) ''ایک انسان جو بڑا متکلّم ہو گا اور اہلِ بدعت اور اہلِ کفر سے مناظرے اور جدال کرے گا اور پھر انھیں چھوڑ دے گا تاکہ جو ہلاک ہونا چاہے وہ وضاحت کے بعد ہلاکت کا راستہ اختیار کرے اور جو زندہ رہنا چاہے وہ دلیل کی بنیاد پر زندہ رہے''۔ حالانکہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ دابۃ یعنی جانور ہے۔ تو یہاں احتیاط کی ضرورت ہے، احادیثِ فتن اور اشراط الساعۃ کے درست فہم کے لیے جن باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے، ان کی رعایت کے بغیر موقف اختیار کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایسا باب ہے جس میں احتیاط کا دامن مضبوطی سے پکڑنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ روافض یا اہلِ تشیع کا ایک گروہ، جو اسماعیلی یا باطنیہ کہلاتا ہے، یا انھیں کا ایک گروہ کرامیہ کہلاتا ہے، انھوں نے ہر شرعی حکم کو مجازی معنی دے کر پوری شریعت ہی کو باطل کر دیا اور نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی ایک باطنی تعبیر کر دی۔ جب صدرِ اسلام میں مختلف فرقے وجود میں آئے تو وہ سب سے پہلے اس راستے سے گمراہ ہوئے۔ خوارج نے قرآنِ کریم کے متن میں اپنی من مانی تشریحات کر ڈالیں اور صحابہؓ کرام کے مقابلے میں اپنے محاورے اور اپنی عقل کو شرحِ قرآن کے لیے مدار بنایا۔ اس کے بعد شیعہ، معتزلہ اور دیگر فرقوں نے یہی کام کیا، جبکہ آج کل کے منکرینِ حدیث کو بھی یہی مغالطہ لگا ہے کہ وہ نصوص کو اپنے مزعومہ معنیٰ پہناتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہایت احتیاط سے کرنے کا کام ہے کہ کسی بھی متن کو پڑھنے کے جو قواعد وضوابط اہلِ علم نے مقرر کیے ہیں، ان کو ملحوظِ خاطر رکھ کر ہی یہ کام کرنا چاہیے۔

اصطلاحات کے تعین اور تنقیح میں احتیاط

اصطلاحات کے تعین یا تنقیح میں بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اس کو دو ایسی مثالوں سے واضح کرتے ہیں جو علامات الساعۃ میں بڑی نمایاں نشانیاں ہیں یعنی مہدی اور دجال۔

مہدی: خاص اطلاق، متعیّن شخصیت

بعض اوقات مہدی کا لفظ ایک خاص اطلاق رکھتا ہے، وہ اطلاق یہ ہے کہ آخر الزمان میں مسلمانوں کے ایک حاکم، خلیفہ اور ایک دوسری اصطلاح میں ایک مجدّد سامنے آئیں گے۔ ان کی پیدائش عام انداز میں ہی ہوگی، پھر ایک خاص وقت اور حالات میں وہ لوگوں کے سامنے آجائیں گے اور ان کا خاص کردار متعیّن ہو جائے گا۔ ہمارا تصور اہلِ تشیع کی طرح نہیں ہے کہ وہ غیبتِ کبریٰ میں ہیں، بارہ سو سال سے سُرّ من رأی کے علاقے کے ایک غار میں محبوس ہیں اور آخر الزمان میں ظہور کریں گے۔ بلکہ ہمارا تصور یہ ہے کہ ایک عام انسان کی طرح اُن کی پیدائش ہوگی، وہ ایک نیک اوصاف رکھنے والی شخصیت کے مالک ہوں گے، ان کا نام محمد بن عبد اللہ ہوگا اور ان کا نسب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسبت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جڑتا ہوگا۔ اس طرح ان کے مزید اوصاف بھی احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ پھر ان کی زندگی میں ہی دجال سے محاذ آرائی جاری ہوگی کہ اسی دوران سیدنا مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ یہ ایک مکمل منظر نامہ ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک متعیّن شخصیت ہیں۔

مہدی: عام اطلاق

دوسری طرف لغوی لحاظ سے مہدی عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا ایک عام مطلب بھی ہے، یعنی وہ شخص جس کو ہدایت دی گئی یعنی ہدایت یافتہ ہو۔ اسی طرح ایک مشہور روایت ہے: «فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي، وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ». (ابنِ ماجہ) ''میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفاے راشدین کے طریقے کو اختیار کرنا''۔ یہاں مہدی سے مراد وہ شخص ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے حق کی طرف رہنمائی کی ہو اور خلفاے راشدین کو مہدیین اس لیے کہا گیا کہ وہ ہدایت پر تھے۔ ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: المهدي: الذي قد هداه

الله إلى الحق، ويريد بالخلفاء المهديين أبا بكر وعمر وعثمان وعليا رضي الله عنهم، وإن كان عاما في كل من سار سيرتهم. ”مہدی وہی ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ حق کی رہنمائی کر دے۔ خلفاے راشدین سے مراد ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ اگرچہ اس کا ایک اطلاق ان مقدس ہستیوں پر بھی ہوتا ہے لیکن اس کا اطلاق عام بھی ہے جو کوئی بھی ان کی راہ پر چلے گا، ان کے طریقے سے حکومت کرے گا وہ مہدی ہے“۔(النهاية في غريب الحديث والأثر، ج:۵، ص:۲۵۴)اسی طرح بعض روایتوں میں نبیِ اکرم ﷺ نے سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حوالے سے بھی مہدی کا لفظ استعمال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا:«يُوشِكُ مَنْ عَاشَ مِنْكُمْ أَنْ يَلْقَى عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ إِمَامًا مَهْدِيًّا وَحَكَمًا عَدْلًا».(مسندِ احمد)”اس بات کا امکان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص بہت لمبا جیتا رہے تو اُس کی ملاقات عیسیٰ ابنِ مریم سے ہو جو ایک ہدایت یافتہ امام ہیں اور ایک عادل حاکم ہیں“۔ تو اس تفصیل سے معلوم کہ مہدی کا عام معنیٰ بھی مراد لیے جائیں گے، مگر عام اور خاص معنیٰ میں فرق کرنے کے لیے قرائن سے پتا لگایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی خلیفۂ راشد اور مہدی ہیں تو عمومی معنوں میں درست ہو گا۔ کسی بھی زمانے میں کوئی حکمران اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرے تو وہ خلیفۂ راشد اور مہدی ہو سکتا ہے۔ تاہم خلفاے راشدین اب ہماری ایک اصطلاح ہے جو خاص چار یا پانچ خلفا کے لیے ہی ہے، کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:«خِلَافَةُ النُّبُوَّةِ ثَلَاثُونَ سَنَةً».(ابوداود)”نبوت کی خلافت تیس سال رہے گی“۔ اس میں چار خلفاے راشدین کے علاوہ کچھ علما سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اسی طرح نبیِ اکرم ﷺ کی دعاؤں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ:«اللَّهُمَّ زَيِّنَّا بِزِينَةِ الْإِيمَانِ، وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُهْتَدِينَ». (نسائی)”اے اللہ! تو ہمیں ایمان کی زینت سے آراستہ فرما اور تو ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت فراہم کرنے والا بنا دے“۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے بھی نبیِ اکرم ﷺ نے دعا کی:«اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَاهْدِ بِهِ». (ترمذی)”اے اللہ! تو اسے ہدایت دیں اور ہدایت یافتہ بنا دیں اور اس کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دیں“۔ اسی طرح نبیِ اکرم ﷺ نے سیدنا جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی:«اللَّهُمَّ ثَبِّتْهُ، وَاجْعَلْهُ هَادِيًا

مَهْدِيًّا». (بخاری) ”اے اللہ! تو اسے ثبات عطا فرما اور اسے دوسروں کو ہدایت کی راہ دکھانے والا اور خود ہدایت یافتہ بنا“۔ یوں واضح ہوا کہ مہدی کا ایک مفہوم عام ہے اور ایک خاص اطلاق ہے، اسے گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح جو مہدی کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ عدل کرے گا اور مال کثرت سے تقسیم کرے گا، تو یہ ایک مشترک صفت ہے اور یہ صورتِ حال مختلف ادوار میں ہو سکتی ہے۔ حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث میں وارد مہدی کے اوصاف: ”جب وہ خلیفہ ہوگا اور مال پھیل جائے گا اور وہ مال لے کر لوگوں کو تقسیم کرے گا تو کوئی لینے والا نہیں ہوگا اور ایک شخص کو دے گا تو کہے گا کہ مجھے اس کی حاجت نہیں ہے“، کو یوں واضح کیا کہ عمومی بات کے لحاظ سے ایسا خلفاے راشدین کے دور میں ہو گیا۔ اس کے بعد یہ کہ مال کی بہت کثرت ہو جائے گی، سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ہو گیا۔ جبکہ یہ بات کہ: ”وہ کسی کو دیں گے وہ انکار کر دے گا“، اس متعیّن معاملے کا اطلاق مہدی آخر الزمان پر ہوگا۔ (فتح الباری، ج: ۱۳، ص: ۸۷) لہٰذا واضح ہوا کہ ایک وہ مہدی ہیں جو آخر الزمان میں آئیں گے اور ان کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوگا۔

مہدی کی پہچان میں اشتباہ کا اندیشہ نہیں

متعدّد بار مہدی ہونے کے جھوٹے دعوے کیے گئے، مہدی جون پوری کا ذکر ہم کر چکے ہیں، جبکہ اس سے قبل میمون القداح نے یہی دعویٰ کیا تھا۔ اسی طرح ہمارے قریبی دور میں غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا۔ بہر حال یہ سب دعوے جھوٹے ثابت ہوئے کیونکہ مہدی آخر الزمان کے بارے میں اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ فلاں آدمی مہدی، ہدایت یافتہ، اچھا حکمران تھا، اس سے لوگوں کو ہدایت ملی، یہ تو ممکن ہے مگر مہدی آخر الزمان کی دیگر علامات اتنی جلی ہیں جیسے کہ ان کی موجودگی میں سیدنا مسیح کا نزول ہوگا، تو اس میں اشتباہ ہو جانا خارج از امکان ہے۔

المسیح الدجال: متعیّن شخصیت

دوسری اہم اصطلاح مسیح الدجال ہے، اسے بھی کبھی کبھار عمومی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے، یعنی ہر شر

اور بدی کی علامت کو دجال کہا گیا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی بے شمار احادیث میں تیس بڑے جھوٹوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ مگر عمومی معنوں سے ہٹ کر ایک متعیّن شخص کے لیے بھی یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو عمومی معنیٰ خواہ وہ مہدی سے اخذ کیے گئے ہوں یا دجال سے وہ در حقیقت اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اگر چھوٹا خیر ہو تو اس کی مناسبت مہدی سے ہے اور اگر چھوٹا شر ہو تو اس کی مناسبت شر کے بڑے مرکز متعیّن دجال سے ہوتا ہے۔ لہذا اس مناسبت کی رعایت سے کبھی کبھار ان اصطلاحات کو عمومی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے عموم میں استعمال سے اس کے خصوصی معنوں میں کوئی اشتباہ پیدا نہیں ہوتا۔ ہم پیچھے جدید مفکّرین کی تاویلات کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ راہِ اعتدال سے منحرف مصنفین نے اس اصطلاحی لفظ کی کئی تاویلات کیں۔ مثلاً مفتی عبدہ نے قرار دیا کہ دجال، خرافات، دجل، اور قباحتوں کے لیے ایک علامت ہے اور یہ کوئی متعیّن شخص نہیں ہے۔ غلام احمد قادیانی نے کبھی تو عیسائی قوم کو دجال قرار دیا اور کبھی عیسائی پادریوں کو دجالِ اکبر قرار دے دیا۔ اور بالاخر انھیں معصوم قرار دے کر شیطان ہی کو دجال قرار دے دیا۔ اسرار عالم صاحب نے بھی دجال کے مرادی معنیٰ میں تحریف کی اور کہا کہ ابلیس ہی در اصل دجال ہے جو مختلف صورتوں میں ظہور کرتا رہا کبھی تو وہ ملاء (سردار) بن کر نبیوں کی مخالفت کرتا رہا، یہی سامری تھا اور مارٹن لوتھر بھی دجال ہی تھا۔ مولانا اصغر علی روحی صاحب نے معین شخص دجال کا انکار کرتے ہوئے ملحدین کو دجال قرار دیا۔ بعض نے مغربی تہذیب و تمدن ہی کو دجال قرار دیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف التذکیر بسورۃ الکھف میں ان تاویلات کو زود فکری اور جلد بازی کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ مغربی تہذیب و تمدن خدا بے زاری اور شیطان دوستی پر مبنی ہے جو دجال کے لیے زمین ہموار کرے گا، لیکن احادیث میں مذکور دجال ایک معین شخص ہو گا جو اپنے وقت پر ظاہر ہو گا۔ دجال کے بارے میں احادیث کثرت سے بیان ہوئی ہیں، نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ، أَمْرٌ أَكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ». (مسندِ احمد) ’’تخلیقِ آدم سے قیامِ قیامت تک دجال سے بڑا کوئی معاملہ پیش نہیں آیا‘‘۔ ایک حدیث میں آتا ہے: «مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ فِتْنَةٌ أَكْبَرُ عِنْدَ اللهِ مِنَ الدَّجَّالِ». (مستدرک حاکم) ’’خلقِ آدم سے قیامت کی ساعت تک اللہ

کے ہاں کوئی فتنہ دجال سے بڑا نہیں گزرا"۔ حدیث کے مطابق تمام انبیاے کرام اپنی قوم کو اس سے خبر دار کرتے رہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:«لَمْ يُبْعَثْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا يُحَذِّرُ قَوْمَهُ مِنَ الدَّجَّالِ الْكَذَّابِ فَاحْذَرُوهُ، فَإِنَّهُ أَعْوَرُ وَإِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ». (مسندِ احمد) "کوئی نبی بھی مجھ سے پہلے نہیں بھیجا گیا مگر اس نے اپنی قوم کو دجال کذاب سے خبر دار کیا ہے، پس تم بھی اس سے بچ کے رہنا بے شک وہ کانا ہے اور تمھارا رب یک چشم نہیں ہے"۔ بخاری میں عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک قدرے طویل روایت میں آتا ہے: ثُمَّ ذَكَرَ المَسِيحَ الدَّجَّالَ فَأَطْنَبَ فِي ذِكْرِهِ. "پھر آپ ﷺ نے مسیح دجال کا ذکر کیا اور اس میں طوالت سے کام لیا"۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ نے تفصیل سے اس کے بارے میں بتایا جو دیگر روایت میں منقول بھی ہے۔ اسی روایت میں آتا ہے کہ اگر اس کی کوئی صفت تم سے اوجھل بھی رہ گئی تو مضائقہ نہیں بہر حال، اس سے تو تم باخبر ہی ہو کہ تمھارا رب یک چشم نہیں ہے۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ دجال کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا لیکن اس امکان کو رسول اللہ ﷺ بھی تسلیم فرما رہے ہیں کہ اس کی کچھ صفات پوشیدہ رہ سکتی ہیں اور سب کچھ بتایا نہ جا سکے گا۔ نبیٔ کریم ﷺ کو جو کچھ علامات بتائی گئیں تھیں وہ ابنِ صیاد نامی یہودی لڑکے میں کافی حد تک پائی جاتی تھیں جو مدینہ میں یہودی والدین کے گھر پیدا ہوا۔ تو نبیٔ اکرم ﷺ نے بھی باقاعدہ کوشش کی، تحقیق کی، اس بات کو جاننے کی کہ میں دیکھوں ذرا کیا یہ وہ دجال تو نہیں ہے کہ جس کے بارے میں مجھے خبر دی گئی ہے؟ اور ایک موقعے پر آپ ﷺ کھجور کے جھنڈ کے پیچھے چھپ چھپ کے جا رہے تھے اور وہاں ابنِ صیاد ایک جھولے کے اندر لیٹا سو رہا تھا یا خواب میں تھا، تو آپ ﷺ قریب پہنچ گئے۔ اس کی والدہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ لیا اور بتا دیا کہ ابنِ صیاد! ذرا دھیان کرو، یہ آ رہے ہیں، تو ایک دم وہ چوکنا ہو گیا، تو نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ اس کو چھوڑ دیتی تو بات واضح ہو جاتی۔ دجال کے بارے میں آتا ہے کہ اس کے پاس بڑی غیر معمولی صلاحیت ہوگی، اس اعتبار سے ابنِ صیاد کی آپ ﷺ نے ایک موقعے جانچ کی۔ آپ ﷺ نے اس سے کہا کہ میں اپنے جی میں ایک آیت رکھتا ہوں اور تم بوجھو اگر تم کاہن ہو؟ تو اس نے کہا: "دُخ"۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:«اخْسَأْ، فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ». (بخاری) "دور ہو جاؤ، تم کہانت میں کمزور ہو"۔ آپ ﷺ نے پوری آیت ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ

مُبِیْن﴾ ذہن میں رکھی تھی۔ چونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے ابنِ صیاد کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کن بات نہیں بتائی تھی، تو بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ خیال کرتے تھے کہ ابنِ صیاد ہی دجال ہے۔ جس میں سیدنا عمر، سیدنا جابر، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات لکھی ہے کہ یہ جو ابنِ صیاد کا قصہ ہے یہ بہرحال مشکلات میں سے ہے اور اس کا معاملہ مشتبہ تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال تھا۔ اور یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو دجال کا معاملہ بالکل متعیّن طور پر نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ کیا شخصیت ہوگی، اور اللہ کے نبی ﷺ کو دجال کی صفات کی وحی کی گئی تھی۔ نبی کریم ﷺ کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دجال کو شخص معین سمجھتے تھے نہ کہ کوئی تہذیب یا سماجی فتنہ وشیطنت۔ اسی طرح سے ایک حدیث میں آتا ہے: «يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي أُمَّتِي فَيَمْكُثُ أَرْبَعِينَ» لاَ أَدْرِي أَرْبَعِينَ يَوْمًا أَو أَرْبَعِينَ شَهْرًا، أَو أَرْبَعِينَ عَامًا. (مسلم) ''دجال میری امت میں ظاہر ہوگا پس وہ رہے گا چالیس''، (راوی کہتے ہیں کہ) میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ نے چالیس دن کہا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معین شخصیت ہوگی ورنہ فتنہ مادیت وشیطنت اور غلبہ مغربیت تو چالیس سال سے کہیں زیادہ مدت پر پھیلا ہوا ہے۔

عہدِ حاضر کی کچھ واضح گمراہیاں

اس باب کے ابتدائی حصے میں تفصیل سے ہم نے ان اصولوں کا جائزہ لیا جن کا علم اس نوعیت کے حساس موضوعات پر کلام کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح سے ہم نے یہ بھی سمجھنے کی کوشش کی کہ دین میں اتھارٹی کس کو سمجھا جائے گا اور 'کس کا فرمایا ہوا مستند ہوگا'۔ اب ہم کچھ ایسی آفات کی بابت کلام کریں گے جو ہمارے زمانے میں عام ہیں اور جن کی وجہ سے دین کا علم - جو ہمیشہ سے محکم بنیادوں پر استوار چلا آرہا تھا - اب اس مقام کو پہنچ گیا ہے کہ لونڈے لپاڑوں اور ڈوم ڈھاڑیوں کی قبیل کے لوگ بھی بے تکلف اس پر ہاتھ صاف کرتے نظر آتے ہیں۔

قحطِ علم قیامت کی نشانی ہے

احادیثِ اشراط الساعۃ میں بہت ساری احادیث میں آتا ہے کہ قربِ قیامت کے دور میں علم اٹھالیا جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی: «إِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ لَأَيَّامًا، يَنْزِلُ فِيهَا الجَهْلُ، وَيُرْفَعُ فِيهَا العِلْمُ، وَيَكْثُرُ فِيهَا الهَرْجُ وَالهَرْجُ: القَتْلُ». (بخاری) ”قیامت سے پہلے کچھ ایسے دن آئیں گے، جن میں جہل کا نزول ہوگا، ہر طرف جہل کا غلبہ ہوگا اور جس میں علم کو اٹھالیا جائے گا اور بہت فتنہ اور قتل وغارت پھیل جائے گی“۔ ایک روایت میں ہے: «مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ: أَنْ يَقِلَّ العِلْمُ، وَيَظْهَرَ الجَهْلُ، وَيَظْهَرَ الزِّنَا، وَتَكْثُرَ النِّسَاءُ، وَيَقِلَّ الرِّجَالُ، حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً القَيِّمُ الوَاحِدُ». (بخاری) ”قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ علم گھٹ جائے گا، جہل پھیل جائے گا، زنا عام ہوجائے گا، عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور مردوں کی تعداد کم ہوجائے گی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کی کفالت ونگرانی کے لیے ایک شخص دستیاب ہوگا“۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ اللهَ لاَ يَقْبِضُ العِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بِقَبْضِ العُلَمَاءِ، حَتَّى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا». (بخاری) ”بے شک اللہ تعالیٰ علم کو ایسے نہیں اٹھائے گا کہ بندوں کے سینوں سے اسے نکال ہی دے، بلکہ وہ علم کو اٹھائے گا علما کو اٹھاکر، یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہ بچے گا تو عوام، جاہل لوگوں کو اپنا بڑا مان لیں گے، پھر ان جاہل سرداروں سے مسئلے پوچھے جائیں گے، پس وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے“۔ یہاں قلتِ علم سے قلتِ علما مراد ہے، اسی طرح قلتِ علم سے قلتِ فہم بھی مراد ہوسکتی ہے۔ مطلب یہ کہ لوگوں کے پاس معلومات تو ہوں گی، لیکن رسوخ فی العلم اور تفقہ سے محروم ہوں گے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فیض الباری میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: فإنه يكون كثيرًا كَمًّا وقليلًا كَيفًا كما نشاهد في زماننا. ”علم کمیت کے اعتبار سے تو بہت زیادہ ہوجائے گا لیکن کیفیت اور پختہ جانکاری کے حوالے سے علم کم ہوجائے گا جیساکہ ہم اس زمانے میں

مشاہدہ کرتے ہیں"۔ آخری دور کے بارے میں ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں:«إِنَّهُ لَتُنْزَعُ عُقُولُ أَهْلِ ذَلِكَ الزَّمَانِ وَيُخَلَّفُ لَهُ هَبَاءٌ مِنَ النَّاسِ يَحْسِبُ أَكْثَرُهُمْ أَنَّهُمْ عَلَى شَيْءٍ، وَلَيْسُوا عَلَى شَيْءٍ». (مسندِ احمد) "اُس زمانے کے لوگوں کی عقلیں چھن جائیں گی اور اس زمانے میں لوگوں میں سے ہلکے (فہم والے) لوگ رہ جائیں گے ان میں سے اکثر سمجھتے ہوں گے کہ وہ بھی کسی چیز (دلیل یا دین) پر ہیں، حالانکہ وہ کسی شے پر نہ ہوں گے"۔

نااہل لوگوں کی قیادت وسیادت

قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی نااہل لوگوں کی پیشوائیت اور قیادت ہے۔ ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا:«سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ سَنَوَاتٌ خَدَّاعَاتُ، يُصَدَّقُ فِيهَا الْكَاذِبُ، وَيُكَذَّبُ فِيهَا الصَّادِقُ، وَيُؤْتَمَنُ فِيهَا الْخَائِنُ، وَيُخَوَّنُ فِيهَا الْأَمِينُ، وَيَنْطِقُ فِيهَا الرُّوَيْبِضَةُ». قيل: وما الرويبضة؟ قال: «الرَّجُلُ التَّافِهُ فِي أَمْرِ الْعَامَّةِ». (ابنِ ماجہ) "لوگوں پر ایسے سال آئیں گے جو دھوکے والے ہوں گے، ان میں جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا کہا جائے گا، خائن کو امانت دار اور امانت دار کو خائن کہا جائے گا اور ان سالوں میں رویبضہ کلام کرے گا"۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ رویبضہ کیا ہے؟ فرمایا: "ہلکا اور کم تر شخص امرِ عام میں کلام کرے گا"۔ مسندِ احمد کی ایک روایت میں ہے کہ:«إِنَّ أَمَامَ الدَّجَّالِ سِنِينَ خَدَّاعَةً». "بے شک دجال سے پہلے دھوکہ دہی کے سال ہوں گے"۔ دجال، دجل سے ہے اور اس سے پہلے بھی دھوکے کے ادوار چل رہے ہوں گے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ دجال یک دم کہیں سے برآمد ہو جائے گا، بلکہ پورا ماحول اس کے لیے تیار ہوگا، اس میں ایک بڑا دھوکا دینے والا دجال سامنے آئے گا۔ مسندِ احمد کی اس روایت میں الرویبضہ کی صفت یوں بیان کی گئی ہے:«الْفُوَيْسِقُ يَتَكَلَّمُ فِي أَمْرِ الْعَامَّةِ». (مسندِ احمد) "ایک بہت چھوٹا سا فاسق شخص عوام کے معاملات میں کلام کرے گا"۔ ایک اور روایت میں رویبضہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:«مَنْ لَا يُؤْبَهُ لَهُ». (المعجم الکبیر للطبرانی) "وہ شخص جس کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی مقام نہیں"۔ غور کیا

جائے کہ ایک آدمی جیسا تیسا بھی ہے وہ اپنے معاملات میں فیصلے کر رہا ہے یا اپنے گھر والوں کے معاملات میں الٹے سیدھے تصورات قائم کر رہا ہے، تو اُس کا یہ جہل اُس کی ذات اور اس کے گھر والوں تک محدود ہے، لہذا اس میں اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ایک شخص پبلک ڈومین میں آئے اور اپنی نااہلی کے باوجود قوم سے کلام کرے، ان کے معاملات سے متعلق گفتگو کرے اور انھیں مشورے دے اور ترغیب دلائے تو یہ بہت خطرناک ہے۔ ایسے نااہل، داعی، متکلّمین اور لیڈر بہت خطرناک ہیں اپنی آخرت کے حوالے سے بھی اور دوسرے لوگوں کو مبتلائے آزمائش کرنے کے حوالے سے بھی۔ احادیث میں ایسوں کو گمراہ کن امام ور ہنما قرار دیا گیا ہے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، یارسول اللہ! ہم جہالت اور برے حالات میں تھے، اللہ نے آپ کے ذریعے ہمیں خیر سے متعارف کرایا، کیا اس خیر کے بعد کوئی شر ہو گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، پوچھا گیا، یارسول اللہ! اس شر کے بعد کوئی خیر ہو گا؟ فرمایا: ہاں، خیر ہو گا، لیکن اس میں دھواں ہو گا۔ پوچھا: یارسول اللہ! دھویں کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: «قَوْمٌ يَهْدُونَ بِغَيْرِ هَدْيِي تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُ». ”ایسے لوگ ہوں گے جو میری ہدایت کے بغیر ہدایت تلاش کریں گے، تم ان سے اچھے برے ہر طرح کے اعمال دیکھو گے“۔ پوچھا: یارسول اللہ! کیا اس کے بعد کوئی شر کا دور ہو گا؟ فرمایا: «نَعَمْ، دُعَاةٌ إِلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا». ”ہاں، جہنم کے دروازوں پر کھڑے داعی ہوں گے جو ان کی بات مانیں گے وہ انھیں جہنم میں دھکیل دیں گے“۔ پھر پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! ذرا ان کے اوصاف بتائیے۔ فرمایا: «هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا، وَيَتَكَلَّمُونَ بِأَلْسِنَتِنَا». ”وہ ہمارے جیسے چہرے بشرے کے ہوں گے اور ہماری جیسی گفتگو کریں گے“۔ یعنی ہماری زبان میں بات کریں گے، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جیسے ہمارا ڈسکورس ہے وہ بھی ویسی ہی دینی اور قرآن و سنت کی باتیں کر رہے ہوں گے۔ یعنی یہ جو دوزخ کے داعی ہیں یہ کوئی پاپ سٹار نہیں ہیں، یہ کوئی کھلے ملحدین نہیں ہیں، agnostic یا Sceptic نہیں ہیں۔ یہ بظاہر اچھی باتیں کر رہے ہیں، ہماری جیسی زبان بول رہے ہیں۔ پھر صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ایسی صورت میں پھر کیا کرنا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت سے جڑے رہو، اس کے امام سے متعلق رہو۔ اور پھر جب پوچھا گیا کہ اگر کوئی جماعت

نہ ہو، کوئی پیشوا نہ ہو؟ تو فرمایا کہ: ''ان تمام جتھوں اور گروہوں سے علیحدہ ہو جاؤ، چاہے تمھیں کسی درخت کی جڑ کھا کر یا اس کو چوس کر، اس کو چبا کر اپنی زندگی گزارنی پڑے، یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے''۔ (بخاری) اس حدیث میں بغیر اہلیت کے لوگوں کی رہنمائی کرنے والوں کو جہنم کا داعی بتایا گیا ہے جو بہت قابل حذر بات ہے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: «لَغَيْرُ الدَّجَّالِ أَخْوَفُنِي عَلَى أُمَّتِي». ''دجال کے علاوہ مجھے کچھ اور چیزوں کا اپنی امت کے بارے میں اندیشہ ہے''۔ تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی، تو سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے نبی! اپنی امت پر دجال کے علاوہ کن لوگوں کے بارے میں آپ کو خدشات لاحق ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَئِمَّةً مُضِلِّينَ». (مسندِ احمد) ''گمراہ کرنے والے امام، پیشوا''۔ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں چند دوسری نشانیوں کے ساتھ گمراہ کن پیشواؤں کا بھی ذکر آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «وَإِنَّمَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الْأَئِمَّةَ الْمُضِلِّينَ، وَإِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِي أُمَّتِي لَمْ يُرْفَعْ عَنْهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَلَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَلْحَقَ قَبَائِلُ مِنْ أُمَّتِي بِالْمُشْرِكِينَ، وَحَتَّى تَعْبُدَ قَبَائِلُ مِنْ أُمَّتِي الْأَوْثَانَ، وَإِنَّهُ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي كَذَّابُونَ ثَلَاثُونَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ، وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي، وَلَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ -قال ابن عيسى: «ظاهرين» ثم اتفقا- لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ، حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ». (ابوداود) ''مجھے اپنی امت کے بارے میں جس چیز کا اندیشہ ہے وہ گمراہ کرنے والے پیشوا ہیں، اور جب میری امت میں تلوار نکال دی جائے گی تو قیامت تک داخل نیام نہ ہو سکے گی۔ اور قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ میری امت کے کچھ قبائل مشرکین سے جا ملیں گے اور میری امت کے کچھ قبائل بتوں کی پوجا شروع کر دیں۔ اور عن قریب میری امت میں تیس بڑے جھوٹے پیدا ہوں گے ان میں سے ہر ایک کو یہ زعم ہو گا کہ وہ نبی ہے جبکہ در حقیقت میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، مخالفین اس گروہ حق کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے''۔ یہاں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ پیش گوئیوں والی احادیث میں گمراہ کن پیشواؤں کا ذکر آرہا

ہے، یہ دراصل نااہل لوگ ہیں، جو بغیر علمی یا اخلاقی اہلیت و لیاقت کے لوگوں کے معاملات میں کلام کریں گے اور ناجائز طور پر لوگوں کی رہنمائی کے منصب پر فائز ہو کر ان کی گمراہی میں اضافہ کریں گے۔ اب یہ نشانی اس دور میں بچشمِ سر دیکھی جا سکتی ہے۔

اتھارٹی کا بحران

اس وقت ہمارا موضوع چونکہ خاص طرح کی احادیث کا فہم اور اس سے استنباط ہے، لیکن یہ بات عمومی طور سے بھی کی جا سکتی ہے کہ اس وقت جو بحران ہے، وہ اتھارٹی کا ہے، Legitimization problem یعنی قانونی حیثیت کا مسئلہ ہے۔ اس کا آغاز Colonial period میں بڑی تعداد میں ہو گیا۔ اگر ہم ایک کیس سٹڈی کے طور پر برصغیر ہی کو دیکھ لیں تو ہمارا معاشرہ ایک روایتی معاشرہ تھا، مگر انحطاط اور زوال کا شکار تھا اور زوال بھی ہمہ گیر تھا۔ ہمارے اندر کچھ ایسی اخلاقی، علمی خرابیاں آ گئی تھیں، جن کی وجہ سے ہم کالونائز ہونے کے لیے بالکل تیار تھے۔ یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا اور ہم کالونائز کیوں ہوئے۔ ہمارا موضوع یہاں یہ ہے کہ اتھارٹی کا بحران کب سے آیا۔ کیونکہ دورِ غلامی سے پہلے بہر حال جیسا تیسا ہمارا ایک اتھارٹی کا نظام تھا، یہاں حکمران اور علما تھے، اسی طرح سے قضاۃ کا نظام تھا اور باقاعدہ احکام نافذ تھے اگرچہ اس میں کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی تھیں۔ لیکن یہاں پر جب انگریز آیا تو اس نے ہمارے ہر سٹرکچر کو تباہ کر دیا اور زیادہ تر لوگوں کو اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ نوآبادیاتی نظام ان کو کتنا بڑا دھچکا پہنچایا ہے۔ انھوں نے مسلم امہ کو ایسا ڈینٹ ڈال دیا ہے کہ امتِ مسلمہ کو ڈی کالونائز ہوتے ہوئے ستر سال ہو چکے، لیکن ابھی تک ہم اس کے اثر سے نہیں نکل سکے:

اس نے اپنا بنا کر چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

یعنی انگریز نے کوشش کر کے اس کی روایتی، ذہنی اور روایتی سیاسی قیادت دونوں کو تباہ کر دیا: ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾ (النمل: ۳۴) ”بے شک جب بادشاہ (غاصبانہ طور پر)

کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد کرتے ہیں اور یہاں کے عزت والوں کو ذلیل کرتے ہیں"۔ سیاست میں انھوں نے یہ کیا کہ پرانی Hierarchy کو توڑ دیا اور وہ لوگ جو ان کے سائیس، ان کے گھوڑے دھلانے والے، ان کی مٹھی چاپی کرنے والے، ان کی خوشامدیں کرنے والے تھے ان کو سر پر بٹھا دیا۔ اسی طریقے سے جو علما اور روایتی خانقاہیں تھیں، ان کو ختم کر دیا، اوقاف اپنے قبضہ میں کر لیے۔ اسی طرح خانقاہوں کے ساتھ جو سارے اوقاف تھے وہ ختم کر دیے اور پھر جعلی مشائخ اور گدی نشینوں کا ایک پورا طبقہ پیدا کیا، جو آج تک ہم پر مسلط ہیں۔ جس طرح سیاست میں یہ ہم پر مسلط ہیں، اس طرح کی جعلی روحانیت یا تصوف جو مزاروں اور گدی نشینوں پر مشتمل ہے، جہاں ہر طرح کا استحصال جاری ہے، وہاں بھی یہی لوگ مسلط ہیں۔ یہ ایک پورا موضوع ہے کہ ان لوگوں نے کیسی کیسی غداریاں کی ہیں اور پھر کتنی بڑی بڑی جاگیریں ان کو دی گئیں۔ تو اس کے نتیجے میں ہمارا اتھارٹی کا نظام تباہ ہو گیا اور پھر معاملات وہی ہوئے کہ:

گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ

پھر جس کے گلے میں جو تان آئی، اڑاتا رہا اور ہر آدمی اپنی جگہ گویا مجتہد بن بیٹھا۔ اس پوری صورتِ حال میں علما مقاومت کرتے رہے اور اپنی جد وجہد جاری رکھی۔ مگر لوگ علما کے حوالے سے عجیب باتیں کرتے رہے کہ یہ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ لیکن اگر معمولی سے بھی انصاف سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کم از کم برصغیر کے علما کتنا سخت چنا ثابت ہوئے ہیں، کس طرح انھوں نے اس دینی تراث کو بچایا ہے، کس طرح اس روایت کو محفوظ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ دین کے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہے۔ اب یہ کسی کا دعویٰ نہیں کہ اس میں کوتاہی ان سے نہیں ہوئی، کوئی کمی نہیں ہوئی یا کچھ چیزوں سے انھوں نے صرفِ نظر نہیں کیا، لیکن بہر حال انھوں نے پوری جرات کے ساتھ یلغار کا مقابلہ اور دین و مذہب اور اس کی روایت کا تحفظ کیا۔ لیکن ایسی صورتِ حال میں عموماً نئی نئی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں، چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا، کئی بہروپیے پیدا ہوئے جنھوں نے علمی روایت سے ہٹ کر دین کی ترجمانی شروع کی۔ ایسے مواقع پر کچھ لوگ ہوتے ہیں، ان کی کچھ اُفتادِ طبع ہوتی ہے، اس سے مجبور ہو کر اور کچھ حالات کے جبر سے اور بعض مقتدر قوتوں کے مفادات کی وجہ سے حقیقت کے بجائے جعل کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جب یہ

تینوں چیزیں جمع ہوتی ہیں، تو پھر نئی نئی آوازیں برآمد ہوتی ہیں۔ جیساکہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ایک نیا نبی پیدا ہوا، پھر اسی طریقے سے انکارِ حدیث کا فتنہ پیدا ہوا، تو اُسی دور میں بہت سے معاملات یہاں پر سامنے آئے۔ لہٰذا مخلص اہلِ علم نے اس اہم دینی مسئلے کی طرف از سرِ نو توجہ کی کہ دین اور اس کی تعبیر و تفہیم میں کلام کرنے کا اہل کون ہے اور کس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دین کے مسائل میں کلام کرے۔

اکابر کو چھوڑ کر چھوٹوں سے علم حاصل کرنے کی نحوست

ہم اشراط الساعۃ میں سے ایک حدیث پڑھ چکے ہیں جو قلتِ علم کے بارے میں تھی، اب ایک اور حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں، جو علم کے چھوٹے پن کے بارے میں ہے: «إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ ثَلَاثَةً: إِحْدَاهُنَّ أَنْ يَلْتَمِسَ الْعِلْمَ عِنْدَ الْأَصَاغِرِ». (المعجم الکبیر للطبرانی) "قیامت کی تین نشانیوں میں سے ایک ہے کہ علم چھوٹوں سے لیا جائے گا"۔ اب یہ چھوٹے کون ہیں، کیا عمر میں چھوٹے ہیں یا علم میں چھوٹے ہیں، مرتبے میں چھوٹے ہیں یا احترام میں چھوٹے ہیں؟ تو حضرت عبد اللہ ابنِ مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: الأصاغرُ أهلُ البدعة. "چھوٹے لوگ اہلِ بدعت ہیں"۔ سیدنا عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک قول منقول ہے: لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا أَخَذُوا الْعِلْمَ عَنْ أَكَابِرِهِمْ وَعَنْ عُلَمَائِهِمْ وَأُمَنَائِهِمْ، فَإِذَا أَخَذُوهُ مِنْ أَصَاغِرِهِمْ وَشِرَارِهِمْ هَلَكُوا. (الآداب الشرعية والمنح المرعية) "کہ لوگ برابر خیر پر رہیں گے کہ جب تک وہ علم اپنے اکابر، علما اور امانت دار لوگوں سے لیتے رہیں گے، پھر جب وہ اپنے چھوٹوں اور شریر لوگوں سے علم حاصل کرنا شروع کر دیں، تو ہلاک ہو جائیں گے"۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فأما صغيرٌ يؤدِّي إلى كبيرِهم، فهو كبير. (التخريج الصغير والتحبير الكبير) "پس جب کوئی چھوٹا بڑوں کی طرف دوسروں کی رہنمائی کر دے، تو وہ کبیر ہے"۔ یہ بہت اہم جملہ ہے کہ ایک دور کے رہنے والے علما بھی ایک مرتبے کے نہیں ہوتے۔ ان میں سے کچھ بڑے علما ہوتے ہیں جو سینیر علما ہوتے ہیں اور کچھ جونیَر علما ہوتے ہیں، پھر اسی طرح وہ جنھوں نے ابھی نیا نیا علم کے راستے میں قدم رکھا ہے، سب کے الگ درجات ہیں۔ ان میں سے نچلے درجے کے

حضرات اپنے سے نہیں جوڑ رہے ہیں بلکہ اپنے اساتذہ اور اپنے بڑوں سے جوڑتے ہیں۔ یہی ایک درست طریقہ اور سند ہے اور یہی دین کی روایت ہے۔ ابراہیم الحربی رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگ ہیں وہ سیدنا عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے ماقبل ذکر کردہ قول کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: أَنَّ الصَّغِيرَ إِذَا أَخَذَ بِقَوْلِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَالصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ فَهُوَ كَبِيرٌ. (شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة للالكائي) "اگر کوئی چھوٹا شخص رسول اللہ ﷺ، صحابہ اور پھر تابعین سے باتیں لے کر بیان کرے تو وہ بڑا ہے"۔ تو اس تشریح سے معلوم ہوا کہ یہاں کبیر سے مطلب عمر میں بڑا ہونا یا صغیر سے عمر کا چھوٹا ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ اصل میں علمی بڑائی اور مقام مطلوب ہے۔ کوئی شخص عمر میں چھوٹا ہے لیکن اس کا علمی شجرہ صحیح ہے اور وہ درست ترتیب سے مصادر شریعت کو برت رہا ہے تو وہ بڑا ہے۔ اور اگر کوئی بڑی عمر کا شخص ہے اور بظاہر بڑا صاحبِ علم بھی ہے، لیکن وہ بس اپنی عقل ہی کو معیار بنائے رکھتا ہے اور لوگوں کو اسلاف سے نہیں جوڑتا، نئی نئی باتیں کرتا ہے، سنن یعنی اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال، ارشادات اور افعال، اسی طرح صحابہؓ کرام کی روایات کو چھوڑ دیتا ہے تو ایسا شخص چھوٹا ہے۔ اسی مضمون کی مزید وضاحت امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: ألا وإن الناس بخير ما أخذوا العلم عن أكابرهم ولم يقم الصغير على الكبير فإذا قام الصغير على الكبير فقد هلكوا. (شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة، للالكائي) "لوگ خیر پر رہیں گے جب تک علم اپنے بڑوں سے لیں گے اور چھوٹا بڑے پر مسلط نہ ہو، اور جب چھوٹے بڑوں پر مسلط ہو جائیں (بڑوں کے سر پر سوار ہو جائیں، بڑوں کو Dictate کرنا شروع کر دیں) تو پھر لوگ ہلاک ہو جائیں گے"۔ اس قول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ خیر پر رہیں گے جب ان کے پاس علم ان کے بڑوں کی طرف سے آتا رہے گا، جب علم ان کے چھوٹوں کی طرف سے آنے لگے گا تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ جب چھوٹا اپنے بڑوں سے کہنے لگے کہ آپ کو کیا پتا، آپ کیا جانتے ہیں؟ تو یہاں سے وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ دنیاوی علم میں بھی اب یہ ہو رہا ہے کہ جو نئی نسل ہے وہ اب یہ سمجھتی ہے کہ ہم ٹیکنالوجی کے لحاظ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ وہ اپنے باپ دادا کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ابا جی کو، دادا جی کو تو موبائل کا استعمال کرنا ہی نہیں آتا، ان کو تو پتا ہی

نہیں کہ میسیج کیسے کرتے ہیں، فیس بک کیسے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اب ہر علم میں ہو گیا ہے کہ نئے نئے لوگ آ رہے ہیں، کچھ لوگ الیکٹرانک میڈیا میں آ رہے ہیں۔ پھر وہاں سٹار بن کر بڑے بڑے علما کے منھ کو آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو تو پتا ہی کچھ نہیں ہے، یہ تو اپنے اپنے گوشوں میں بیٹھے ہیں اصل تو ہم ہیں۔ اور انھیں دعویٰ ہے کہ ہمیں اصل مسائل کا ادراک ہے اور آپ لوگ نہیں جانتے، آپ تو اگلے زمانوں کے لوگ ہیں۔ آپ یہ پرانے لوگ اپنی باتیں اپنے تک رکھیے، اب ان باتوں کا خریدار کوئی نہیں۔ تو یہ بہت خطرناک صورتِ حال ہے کیونکہ اس میں اہلیت کا معاملہ یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو ایک بڑی مصیبت ہے۔ ایک صاحب ربیعہ بن ابی عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے اور ان کو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں، ان سے پوچھا کہ آپ کو کیا چیز رلاتی ہے؟ کیا آپ کو کوئی مصیبت آئی ہے؟ کہنے لگے: لَا وَلَكِنِ اسْتُفْتِيَ مَنْ لَا عِلْمَ لَهُ وَظَهَرَ فِي الْإِسْلَامِ أَمْرٌ عَظِيمٌ. (جامع بیان العلم وفضلہ) ”نہیں، لیکن ایسے لوگوں سے فتویٰ طلب کیا جا رہا ہے جن کے پاس کوئی علم نہیں ہے اور یہ اسلام میں بہت بڑا حادثہ ہے جو ظاہر ہو گیا ہے“۔ یہی حضرت ربیعہ بن ابی عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض فتویٰ دینے والے ایسے بھی ہیں جو چوروں سے زیادہ اس کے حقدار ہیں کہ ان کو قید کیا جائے۔ آپ اندازہ کیجیے کہ وہ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جو آج سے بہت بہتر تھا اور اگر آج وہ ہوتے تو پتا نہیں کیا کہتے۔ یہاں تو جس کو گفتگو کرنی آتی ہے، جو بول بچن ہے، جس کو لفاظی کرنی آتی ہے، جو لَسَّان ہے اس کا سکہ چلتا ہے۔ یہ ان چیزوں میں سے ہے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تشویش ظاہر فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا: «إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَى هَذِهِ الْأُمَّةِ مُنَافِقٌ عَلِيمُ اللِّسَانِ». (شعب الایمان) ”مجھے اس اُمت پر سب سے زیادہ خوف اس منافق کے معاملے میں ہے جو عالمِ لسان ہے“۔ عالم اللسان کا مطلب ہے کہ علم کی باتیں اور روایتیں اس کی نوک زبان پر تو ہیں، لیکن اس کے دل میں اس علم کا کوئی اثر ہے نہ اس کے عمل پر اس کا کوئی اثر ہے۔ اس کا دل علم کی حقیقت اور خشیت سے خالی ہے جب کہ اس کا عمل تقویٰ اور اطاعت سے خالی ہے۔ تو اب ایسے لوگوں کا دین کو کوئی فیض نہیں پہنچ پا رہا بلکہ الٹا یہ ضرر ہی کا باعث بنتے ہیں۔

اب یہاں ایک مسئلہ تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکابرین چلے جاتے ہیں، ان کی نیابت کی اہلیت نہ رکھنے والے

لوگ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ پھر جب یہ مشہور ہو جاتے ہیں تو لوگوں انھیں شیخ الکل بنا لیتے ہیں اور زندگی کے ہر معاملے میں، دین کے ہر شعبے میں ان سے سوالات کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ معاملہ اکثر تو عوام کے ساتھ پیش آتا ہے مگر بعض بھلے مخلصین بھی اس جال میں آجاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دین کے ہر معاملے میں کلام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر وہی صورتِ حال پیش آجاتی ہے: «فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا». (بخاری) ''پھر ان سے دینی مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے''۔ قاسم ابنِ محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے کہ: لأن يعيش الرجل جاهلا خير من أن يقول على الله مالا يعلم. ''یہ بات کہ آدمی جاہل رہ جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایسی بات کرے جو وہ نہیں جانتا''۔ جو قرآنِ مجید نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا چیزیں حرام کی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: ﴿وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرۃ:۱۶۹) ''کہ تم اللہ کے بارے میں وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے''۔ یہ بہت بڑا گناہ اور حرام ہے۔ پھر اسی طرح سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ، إِنَّ اللهَ لَايَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (الانعام:۱۴۴) ''اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے تا کہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کر دے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔ یہ بہت خطرناک اور افسوس ناک بات ہے، جبکہ بدقسمتی سے اس دور میں یہ ٹرینڈز اور رویے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

دلیل کے قبول ہونے کے لیے اس کا معیاری ہونا ضروری ہے

آج کل یہ جملہ زبان زدِ عام ہے کہ فلاں آدمی اپنی ہر بات کی دلیل دیتا ہے۔ حالانکہ صرف دلیل کا ہونا کافی نہیں بلکہ دلیل کا معیاری ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾ (سورۃ الاحقاف:۴) ''میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے کی ہو یا کوئی اور مضمون منقول لاؤ''۔ یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے، وہ ان الفاظ کی شرح میں فرماتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ دلیل نقلی کے لیے ضروری ہے کہ اصل منقول عنہ کا قابلِ تقلید ہونا ثابت ہو اور سند اس تک متواتر یا متّصل موجود ہو، خواہ وہ منقول عنہ کسی نبی کی کتاب ہو یا ان کا زبانی قول ہو"۔ یعنی کوئی الہامی کتاب لے آؤ اور دکھا دو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام ہے، اللہ نے یہ کتاب نازل کی ہے اس میں یہ بات آئی ہے یا کسی نبی کی کوئی زبانی روایت جو چلی آرہی ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ یا تو اللہ کی کتاب میں تذکرہ ہو گا یا کسی رسول کا قول ہو گا، ورنہ قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ چنانچہ آج کل ہمارے لیے یہ رہنما اصول ہے کہ کتاب اللہ یا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم سے تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں ان میں کوئی ایسی بات ہو گی یا اس کی کوئی بنیاد ہو گی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم ہر چیز کو دلیل کے طور پر اور ثبوت کے طور پر قبول نہیں کریں گے۔

معلومات کی بہتات کی آفت

اس دور میں ایک اور آفت لاحق ہے اور وہ عمومی طور پر یہ ہے کہ ہر چیز میں بہت زیادہ بڑھوتری ہوئی ہے۔ چونکہ اس عہد کے بہت سے عنوانات قائم کیے گئے، ان میں سے ایک Age of excess ہے، یعنی ہر چیز کی بہتات ہے۔ ایک فتنہ لسّانی ہے کہ کلام بہت زیادہ ہو رہا ہے، گفتگو بہت زیادہ ہو رہی ہے، ایک بڑے صاحبِ علم یہ بات کہتے ہیں کہ اس دور کا سب سے بڑا فتنہ گفتگو کا فتنہ ہے۔ اب کلام کے لیے سوشل میڈیا آگیا ہے اور یہ بالکل ایک Personalize شے ہے۔ ہر ایک کے پاس اپنا ایک ذاتی Medium ہے۔ مثال کے طور پر فیس بک، ٹویٹر اور یوٹیوب ہیں جہاں کوئی بھی شخص چینل بنا سکتا ہے، اس کے لیے بس اس کے پاس ایک موبائل ہونا چاہیے۔ اگر اس موبائل میں کیمرہ ہے، تو اس میں مختلف کلپس بنا کر، دنیا کے ہر معاملے، ہر فیلڈ اور ہر موضوع پر بے تکلف کلام کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس پر کوئی پکڑ نہیں ہے، یعنی، کسی مارتے ہوئے کا ہاتھ تو آپ روک سکتے ہیں، بولتے ہوئے کی زبان کو تو نہیں روک سکتے، جو اس کے منہ میں آئے گا بولتا چلا جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الْحَدِيثِ عَنِّي، فَمَنْ قَالَ عَلَيَّ فَلَا يَقُولَنَّ إِلَّا صِدْقًا، وَمَنْ تَقَوَّلَ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ». (مسندِ احمد) "مجھ سے حدیث بہت زیادہ روایت کرنے سے بچو، پس جو بھی میرے بارے کوئی بات بیان کرے (یا مجھ سے کوئی بات

منسوب کرے) وہ ہرگز ہرگز کوئی بات نہ کرے سوائے سچائی کے اور جو کوئی ایسی بات بیان کرے جو میں نے نہیں کہی تو اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے''۔ ان الفاظ سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ کثرت میں غلطی کا امکان زیادہ ہوجاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے احتیاط کی تعلیم دیتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

انفرادیت پسندی کا فتنہ

ایک اور فتنہ جو عام ہے اور ہمارے اس موضوع سے متعلق ہے، وہ ہے نئی نئی باتیں نکالنا۔ بہت سے لوگ ہیں، جو اس فتنے کا شکار ہیں، ان میں سے کچھ لوگوں نے تو روایتی دین بھی حاصل کیا ہے، چنانچہ ان میں بھی یہ چیز پیدا ہوگئی ہے کہ اگر ہم وہی روایتی باتیں کرتے رہے جو سب کر رہے ہیں تو کیوں نہ ہم کچھ نیا پیش کریں۔ یہ نیا پیش کرنے کا جذبہ شہرت اور نام و نمود کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ علما اور مصلحین کے کیا فتنے ہیں؟ ان میں سے ایک یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ شہرت کی خواہش اور ہر دلعزیزی۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہر دلعزیزی کا فتنہ کہ مجھے کوئی اپنی جگہ نکالنی ہے، بڑوں کی باتیں کرتے رہیں تو اس سے لگے گا کہ ان کا اپنا تو کوئی دماغ ہے ہی نہیں، کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے، چنانچہ پھر وہ اس کے لیے نئی نئی چیزیں نکالتے ہیں۔ اسی لیے بعض علما یہ کہتے ہیں کہ لوگوں میں انفرادیت کی جو خواہش ہے کہ انسان شریعت کے معاملے میں اپنی عقل سے گفتگو کرے۔ لہذا تو یہ جو نئی بات نکالنے کی خواہش ہے، اس سے ہمارے بڑے بچتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تین جلیل القدر شاگرد ہیں: امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہم، ان کو یہ بات پسند نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنی باتیں کریں۔ بلکہ انھوں نے اپنے استاذ کے علوم کو منتقل کیا، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم زیادہ تر ان کے شاگردوں کے ذریعے منتقل ہوئے۔ حالانکہ یہ جلیل القدر شاگرد، اپنے استاذ کے علوم کا انتساب اپنی طرف کرسکتے تھے اور ان پر اپنا نام لگاسکتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے استاذ کے علوم کو ان کے حوالے سے نشر کرنے کا اہتمام کیا۔ اسی طرح فلسفے کے میدان میں ایک بہت بڑا فرد افلاطون ہے، یہ اتنا بڑا شخص ہے کہ Alfred North Whitehead ایک بڑا امریکن فلاسفر ہے، وہ یہ کہتا تھا کہ مغرب کا فلسفہ کیا ہے؟ وہ تو بس ایسا لگتا ہے کہ افلاطون

پر کسی نے حاشیے لکھے ہیں۔ افلاطون کے ڈائیلاگز ہیں، مگر حسن کی بات یہ ہے کہ اس کے ان ڈائیلاگز میں وہ اپنے استاد سقراط کے مکالمے نقل کرتا ہے۔ اسی طرح ہماری روایت میں بھی مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے آدمی تھے، کتنے بڑے عارف تھے، کتنے بڑے شاعر تھے، مگر ان کے غزل کے دیوان کا نام ''دیوانِ شمس'' ہے۔ اور کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی غزلیں ہیں، حالانکہ وہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی غزلیں ہیں، مگر اس میں انھوں نے دیوانِ شمس کا عنوان قائم کیا۔ ہمارے قریب کے دور کے مولانا ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، انھوں نے تفسیر لکھی اور اس تفسیر کا نام ''تفسیرِ مظہری'' رکھا، جو در اصل انھوں نے اپنے شیخ حضرت مرزا مظہر علی جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا۔ تو یہ بات بہت اہم ہے کہ نئی نئی باتیں نکالنا قابلِ تحسین نہیں ہے۔ سیدنا علی ابنِ حسین زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ليس ما لا يعرف من العلم إنما العلم عرف و تواتر عليه الألسنة. ''وہ چیزیں جو پہچانی نہیں جاتیں، نئی نئی ہیں، اچھوتی ہیں، وہ علم میں سے نہیں ہیں، بلکہ علم تو وہ ہے جو معروف ہے جو جانا پہچانا ہے اور جو زبانوں پر تواتر سے چلا آرہا ہے''۔ اسی طرح ابراہیم بن ابی عبلہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: من حمل شاذ العلم حمل شراً كثيرا. ''جو شاذ علم اٹھائے پھرتا ہے گویا وہ بہت بڑا شر اپنے اوپر لیے پھرتا ہے''۔ بہر حال، یہ انفرادیت پسندی اور نیا پیش کرنے کا ایک شوق ہے جس نے اس دور میں بہت سے لوگوں کو خراب کیا ہے۔

قبل از وقت نتائج اخذ کرنے کا منفی رویہ

عجلت اور قبل از وقت نتائج اخذ کرنے کا رویہ میڈیا میں عمومی طور پر پایا جاتا ہے۔ پرنٹ میڈیا کے زمانے میں اخبار چھپتے تو ان میں ایسی پیش گوئیاں ہوتیں اور پھر جب کوئی واقعہ ہوتا تو وہ کہتے کہ سب سے پہلے ہم نے یہ خبر دی اور ہم نے تو تین ہفتے پہلے یہ بتا دیا تھا، گویا سب سے پہلے ہم نے یہ کیا۔ الیکٹرانک میڈیا کے آنے کے بعد اس رجحان میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا کہ ہم نے سب سے پہلے یہ خبر بریک کی تھی اور پھر کافی دیر تک وہ اسی کیفیت میں رہتے ہیں کہ ہم ہی وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا۔ اسی طرح موجودہ حالات کا جائزہ لیں تو کچھ لوگ جیسے تیار بیٹھے ہوتے ہیں کہ کوئی واقعہ ہو، جیسا کہ نائن الیون ہوا تو جیسے پہلے سے

لوگ تیار بیٹھے تھے تو وہ اس طرح کی حدیثیں جمع کرکے، جھوٹی سچی روایتیں لکھ کے، ان کی تاویلات کرکے اور واقعے پر چسپاں کرکے ایک کتاب شائع کر دیں گے کہ ٹوئن ٹاورز کا قصہ حدیث میں کس طرح بیان ہوا ہے۔ گزشتہ سالوں میں بھی کرونا کے آنے پر کئی لوگ اپنی کتابیں مرتّب کر چکے ہوں گے جو اشاعت کے لیے تیار ہوں گی اور ''کرونا اور اشراط الساعۃ'' جیسے عنوانات پر بہت طویل گفتگو کی جا چکی ہو گی کہ کون کون سی حدیث کرونا کے اس واقعے پر چسپاں ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں نہایت تحمل سے کام لینا چاہیے اور واقعات کو ظہور پذیر ہونے دینا چاہیے۔ اخلاقِ حسنہ میں سے ایک نہایت اہم خصوصیت التَّأَنِّي ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

«التَّأَنِّي مِنَ اللهِ، وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ». (الفتح الكبير في ضم الزيادة إلى الجامع الصغير)

''سوچ سمجھ کر اور بردباری سے کام کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے''۔ تو ویسے عام زندگی میں بھی جلد بازی سے بچ کر تحمل و بردباری کو اختیار کرنا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا ہر واقعے پر انسان کا کلام کرنا ضروری ہے اور ہر موضوع کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنا کوئی ضروری ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ ہر واقعے اور ہر نئی صورتِ حال پر تبصرہ ضروری نہیں ہے۔ عبد اللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: إِنَّهَا سَتَكُونُ هَنَاتٌ وَأُمُورٌ مُشْبِهَاتٌ فَعَلَيْكَ بِالتُّؤَدَةِ فَتَكُونُ تَابِعًا فِي الْخَيْرِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَكُونَ رَأْسًا فِي الشَّرِّ. (الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار) ''عن قریب بڑے عجیب و غریب فتنے ہوں گے اور متشابہات ہوں گے تو تم پر لازم ہے کہ سوچ سمجھ کر، تحمل و بردباری سے معاملہ کرو۔ تم خیر میں کسی کی پیروی کرو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم شر کے لیڈر بن جاؤ''۔ سبحان اللہ! کتنی خوبصورت بات بیان کی ہے کہ خیر میں تمھارا کسی کے تابع بن جانا بہتر ہے اس سے کہ تم شر کے رہنما بن جاؤ۔ لہذا سوچنا چاہیے کہ کیا ہر واقعے پر انسان کا کلام کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں نام نہاد فیس بک دانشوروں کی کمی نہیں کہ جیسے ہی کوئی واقعہ ہوا انھوں نے کمنٹ ضرور کرنا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر وہ بیچارے خاموش رہ بھی جائیں تو وہ بیوقوف لوگ جو ان کو میسر آئے ہیں وہ ان کو مشتعل کریں گے کہ حضرت! اس موقعے پر آپ نے کچھ نہیں فرمایا۔ یہ جو واقعہ ہوا ہے اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟ حالانکہ ہر معاملے کے متعلق رائے دینا ضروری بھی نہیں ہے، لہذا کبھی رائے نہیں بھی دینی چاہیے۔ ایک

صاحب کا لطیفہ ہے کہ انھوں نے گھر بنایا تو لوگ اس کو دیکھنے آئے اور وہ لوگوں کو گھر دکھا رہے ہیں۔ گھر میں تین سوئمنگ پولز ہیں۔ دو میں پانی ہے، ایک خالی ہے۔ کسی نے پوچھا: حضور! یہ پول کس کے لیے ہے؟ کہا، جی، یہ گرم پانی کا ہے اور جب سردیاں ہوں تو اس میں نہائیں گے۔ دوسرے کے بارے میں بتایا کہ یہ ٹھنڈے پانی کا ہے، جب گرمیاں ہوں گی تب نہائیں گے۔ پھر اس شخص نے تیسرے کے متعلق پوچھا کہ یہ پول تو خالی ہے اس کا کیا مصرف ہے؟ تو جواب دیا گیا: کدی نہان نوں نہیں وی دل کردا"، یعنی کبھی نہانے کو نہیں بھی دل کرتا، تو یہ اس کے لیے ہے۔ تو ان حضرات کو بھی کبھی یہ کہنا چاہیے کہ کبھی آدمی کا گفتگو کو دل نہیں بھی کرتا۔ ہر واقعے پر کچھ کہنا ضروری بھی نہیں، دنیا آپ کے انتظار میں نہیں بیٹھی ہوئی۔ بعض اوقات لوگوں کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ جناب ہم اگر رہنمائی نہیں کریں گے تو اتنے سارے ہمارے فالوورز، جو ہمیں دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ہم سے توقع کرتے ہیں ان کا کیا ہو گا؟ اس لیے ضروری ہے کہ ویڈیو کلپ بنایا جائے یا پوسٹ لگائی جائے اور ان خام ذہنوں کو باور کروایا جائے کہ اس مسئلے میں آپ کی رائے (جو یقیناً درست بھی ہے) کیا ہے۔ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ فہم و فراست فی زمانہ حضرت ہی کے پاس ہے، باقی سب تہی دامن ہیں، لہٰذا اب انھی کی رائے فیصل ہو گی، ضروری ہے کہ وہ اپنی ماہرانہ رائے سے چاہے اس کے بارے میں الف ب بھی ان کو نہ پتا ہو، سب کو آگاہ کریں۔ آدمی کو چاہیے کہ دھیان کا رویہ اختیار کرے، تھوڑا سا تثبت، ثبات اور تھوڑا سا جماؤ اختیار کرے۔

مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ گیلانی کا معتدل اندازِ تاویل

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف "التذکیر بسورۃ الکہف" میں اس موضوع پر کافی طویل کلام کیا ہے۔ اس تصنیف میں انھوں نے غیر معیاری تاویلات کے مقابلے میں ایک معیاری تاویل کی ہے۔ اس کتاب کا ایک اقتباس یہاں پیشِ خدمت ہے، جس میں انھوں نے دجال اور دجالی فتنے کے بارے میں بہت سی اہم باتیں لکھی ہیں، فرماتے ہیں: "پچھلے دنوں بعض لوگوں نے عجلت سے کام لے کر یورپ اور امریکہ کے موجودہ تمدن اور تہذیب کو دجالی تہذیب و تمدن قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ المسیح الدجال جس کی پیش گوئی کی گئی ہے وہ آ گیا ہے اور اب مسلمانوں کو دجال کے انتظار کی زحمت نہیں کرنی چاہیے، اس میں شک

نہیں کہ یہ فیصلہ بھی زود فکری اور زود بیانی کا نتیجہ تھا اور اب بھی جن لوگوں کو اس خیال پر اصرار ہے تو سمجھنا چاہیے کہ زود فکری کے مرض سے وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں"۔ (دجالی فتنے کے نمایاں خدوخال، ص: ۲۳) کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں: "اس کے سوا بھی ایسے مختلف وجوہ واسباب ہیں جن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ نبوت کی پیش گوئیوں میں جس المسیح الدجال کا ذکر جن خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے خروج وظہور کا دعویٰ بھی قبل از وقت ہے ہاں اتنی بات صحیح ہے کہ مغرب کا جدید تمدن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "المسیح الدجال" کے خروج کی زمین تیار کر رہا ہے، کیونکہ اپنے اقتداری قوتوں سے وہی کام یورپ کے اس نشاۃ جدیدہ میں بھی لیا جا رہا ہے جس میں المسیح الدجال اپنی اقتداری قوتوں کو استعمال کرے گا"۔ تو یہ درست موقف ہے اور آگے اس کی تھوڑی تفصیل انھوں نے بیان کی ہے کہ: "خدا بے زاری یا خدا کے انکار کی ہر دلعزیزی کی راہ یورپ صاف کر رہا ہے یا کر چکا ہے لیکن بجائے خدا کے خود اپنی خدائی کے اعلان کی جرات ابھی اس میں پیدا نہیں ہوئی ہے"۔ (دجالی فتنے کے نمایاں خدوخال، ص: ۲۳) یہ تحریر غالباً گزشتہ صدی کی چالیس کی دہائی میں لکھی گئی، لیکن آج کے تناظر میں اس بات کو دیکھا جائے تو Yuval Noah Harari نے اپنی کتاب Sapien کے بعد، Homodeus کے نام سے کتاب لکھی، جس میں بیان کیا کہ مستقبل کا انسان اصل میں خدا بننے جا رہا ہے اور خدائی جیسی طاقتیں حاصل کرنے جا رہا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں کہ: "المسیح الدجال اسی قصے کی تکمیل کر دے گا کچھ بھی ہو صحیح اور صاف چچی تلی بات جس میں خوامخواہ نبوت کے الفاظ میں کھینچ تان اور رکیک تاویلوں کی ضرورت نہیں ہوتی یہی ہے کہ المسیح دجال کے خروج کا دعویٰ تو قبل از وقت ہے"۔ یعنی یہ وہی بات ہے جو میں یہاں عرض کر رہا ہوں کہ کھینچ تان کر اور رکیک تاویلات کر کے دجال کے ظہور کو ثابت کیا جا رہا ہے جس کی مثال ابھی ہم نے غلام احمد قادیانی کے ہاں دیکھی۔ پھر مولانا لکھتے ہیں: "اگر المسیح الدجال جس فتنے میں دنیا کو مبتلا کرے گا اس فتنے کے ظہور کی ابتدا کسی نہ کسی رنگ میں مان لینا چاہیے کہ ہو چکی ہے دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دجال آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن دجالیت کی آگ یقیناً بھڑک چکی ہے۔ آخر حدیثوں میں یہ بھی تو آیا ہے کہ المسیح الدجال سے پہلے دجاجلہ کا ظہور ہو گا بعض روایتوں میں ان کی تعداد تیس اور بعض میں ستر تک بتائی گئی ہے، دجال سے پہلے ان دجاجلہ کی طرف دجالیت کا انتساب بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے۔ بظاہر یہی

معلوم ہوتا ہے کہ المسیح الدجال جس فتنے کو پیدا کرے گا کچھ اسی قسم کے فتنوں میں اس سے پہلے دجاجلہ دنیا کو مبتلا کریں گے۔ اسی بنیاد پر میرا خیال یہ ہے کہ المسیح الدجال کے زہر کا علاج بھی جیسے بتایا گیا ہے کہ سورۃ الکہف کی آیتوں میں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح اگر چاہا جائے تو ہر دجالی فتن کے زہر کا ازالہ بھی اسی سورہ کی آیتوں اور جن معارف و مضامین پر یہ آیتیں مشتمل ہیں ان میں تلاش کیا جائے۔ چونکہ موجودہ مغربی تہذیب و تمدن جس کے زیر اثر دنیا کی اکثریت آچکی ہے اور آتی چلی جا رہی ہے دجالی جراثیم کا جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ تقریبًا وہی فتنہ جن کے ظہور کی خبریں المسیح الدجال کے عہد میں دی گئی ہیں، یورپ کے اس تہذیب و تمدن سے مل رہی ہیں"۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ گفتگو نہایت محتاط گفتگو ہے، لہٰذا یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم جب تجزیہ کریں اور اگر کچھ مشابہت پائی جا رہی ہے تو احتیاط سے گفتگو کریں۔ چنانچہ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن، دجالی تہذیب و تمدن ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دجال جس کو ایک مشخّص وجود کے طور پر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بیان فرمایا ہے، اس کا ظہور ہو گیا ہے۔

*****

معاصر مفکرین کی آرا کے مآخذ کا جائزہ

اب تک ہم معاصر مفکرین کی فتن و علاماتِ قیامت کے بارے میں آرا و توجیہات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ہم ان کے ماخذات پر کچھ بحث اس علم الاصول کی روشنی میں کریں گے جو دین اور امورِ دین کی تشریح کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہم بغور جائزہ لیں کہ اکثر ایسی کتب جو فتن پر بحث کرتی ہیں، ان میں کہاں سے استدلال کیا جاتا ہے، تو عام طور پر مندرجہ ذیل مصادر سامنے آتے ہیں:

۱۔ حدیث (ان کتب کے مصنفین سب سے پہلے احادیث سے استدلال کرتے ہیں، ان میں مرفوع احادیث بھی ہوتی ہیں اور موقوفات یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے افعال واقوال بھی شامل ہیں)

۲۔ اسرائیلیات ۳۔ علمِ نجوم

۴۔ وجدان ۵۔ خواب

۶۔ کشف ۷۔ مخطوطات

یہ ایک اجمالی فہرست ہے، اب ہم یہاں اس کی تفصیلات سے تعرض کریں گے، اور ہر مصدر و ماخذ کا الگ سے جائزہ لیں گے، ان شاء اللہ۔

حدیث

حدیث اصولِ دین میں کتاب اللہ کے بعد سب سے بڑا ماخذ ہے، مگر کتاب اللہ کو تواتر حاصل ہے، اس لیے اس کی تحقیق اور سند کی ضرورت نہیں ہوتی، جبکہ حدیث کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں ساری کی ساری احادیث متواتر نہیں ہیں بلکہ اس کا بڑا حصہ اخبارِ آحاد پر مشتمل ہے، اس لیے یہاں سب سے بڑا مسئلہ تثبت و تحقّق کا ہے۔ احادیثِ فتن ہوں یا عمومی احادیث ہوں، ان کے ثبوت کا مسئلہ بہت اہم ہے اور یہی قرآنِ

مجید میں اور احادیث میں ایک جوہری فرق ہے۔ مابین الدفتین جو قرآنِ مجید ہے یہ بلاشک وشبہہ وہی کتاب ہے جو اللہ کے نبی ﷺ جو کچھ ہمیں دے کر گئے، چنانچہ اس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ وہ محفوظ ہے اور اس کے اندر کوئی کمی پیشی نہیں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور غیرِ قرآن میں کسی قسم کے التباس کا امکان نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص عربی کی کوئی عام عبارت پڑھے اور کہے کہ یہ قرآن ہے اور کچھ لوگ اٹھ کر نہ کہیں کہ یہ تو قرآن نہیں ہے۔ لہذا قرآن کیا ہے کیا نہیں ہے، یہ اب مباحثہ طلب نہیں ہے (ہاں جہاں تک قراءت کا اختلاف ہے تو وہ بہت ضمنی ہے اور اس کی بھی اپنی پوری ایک سند ہے جس کو یہاں ہم زیرِ بحث نہیں لا رہے)۔

البتہ حدیث میں پہلا معاملہ ہی ثبوت کا ہے کہ یہ بات جو آپ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر رہے ہیں کیا نبی ﷺ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے بھی کہ نہیں۔ اسی لیے حدیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی جو علمی تعریف کی جاتی ہے تو اس کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے: ما أضيف إلي النبيﷺ من قول أو فعل أو تقرير أو سيرة أو وصف خَلقي أو خُلقي. ''جو چیز بھی منسوب کی جائے نبیٔ اکرم ﷺ کی طرف قول، فعل، تقریر (آپ کا کسی معاملے کو دیکھ کر سکوت اختیار کرنا)، سیرت، تخلیقی حسن یا اچھی عادت سے متعلق؛ وہ حدیث ہے''۔ یعنی ہر وہ چیز جسے نبیٔ اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جائے، تو علمِ حدیث سارا کا سارا نسبت کا علم ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا یہ حدیث ضعیف ہے یا یہ حدیث موضوع ہے، یعنی آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ حدیث بڑی مضبوط ہے اور یہ حدیث ذرا سی کمزور ہے اور یہ حدیث تو جعلی ہے، تو معاذ اللہ نبیٔ اکرم ﷺ کی کوئی بات کمزور تو نہیں ہے اور نہ ہی آپ ﷺ کی کوئی بات جھوٹی ہے۔ یہ جو آپ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ یہ حدیث تو بڑی مضبوط ہے تو وہ مضبوطی نسبت میں ہے اور جہاں آپ کہتے ہیں کہ ضعف ہے تو وہ ضعف بھی نسبت میں ہی ہے اور اگر حدیث جعلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نسبت جھوٹی ہے۔ اس سے پتا لگتا ہے کہ یہ جو ہمارا موضوع ''احادیثِ فتن کی تفہیم کے اصول'' اس سے متعلق جو روایات ہیں، وہاں پر بھی نسبت کی مضبوطی یا ضعف والا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔

احادیث کی اسناد کی اہمیت اور حسّاسیت

حدیث کی بنیاد سند ہے، چونکہ جنابِ رسول اللہ ﷺ اور ہمارے درمیان کئی صدیاں حائل ہیں، تو آپ ﷺ کی طرف سے اگر کوئی قول یا کسی عمل یا تقریر کے متعلق کوئی بات ہم تک آئے، تو اسے ہم تک منتقل کرنے والوں کا متّصل ایک سلسلہ ہونا چاہیے، اسی سلسلے کو سند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پہلے بھی یہ بات ذکر کی جا چکی ہے ہمارا دین اسناد کا دین ہے، اس حوالے سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: الإسناد من الدين ولو لا الإسناد لقال من شآء ما شآء. ”اسناد دین میں سے ہے اگر اسناد نہ ہو تو کوئی شخص جو چاہے بیان کرے“۔ چونکہ آپ ﷺ کے فرامین اور افعال میں سے کچھ تو متواتر روایت سے نقل ہوئے ہیں، لیکن زیادہ تر احادیث جو آج ہمیں معلوم ہیں، وہ خبر آحاد کی نوعیت سے ہیں اور ان کو تواتر کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس لیے حدیث کے تثبّت اور تحقّق کا مرحلہ اہمیت کا حامل ہے۔ نبی کریم ﷺ کو نقلِ حدیث کی حساسیت کا اندازہ تھا اور آپ ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ موقع پرست لوگ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے غلط انتسابات کیا کرتے ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّ كَذِبًا عَلَيَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلَى أَحَدٍ، مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ». (بخاری) ”مجھ پہ جھوٹ باندھنا کسی عام شخص پر جھوٹ باندھنے کے برابر نہیں ہے۔ جو مجھ پہ جان بوجھ کر جھوٹ گھڑے گا، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے“۔ اندازہ کر لیجیے کہ جو عام جھوٹ ہے اسے آپ ﷺ نے اکبر الکبائر یعنی کبیرہ گناہوں سے بھی بڑا گناہ قرار دیا ہے تو آپ ﷺ پر جھوٹ باندھنا کتنا عظیم گناہ ہو گا! ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: «لاَ تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ يَلِجُ فِي النَّارِ». (ترمذی) ”مجھ پر جھوٹ نہ کہا کرو اس لیے کہ جو مجھ پر جھوٹ گھڑے گا وہ دوزخ میں داخل ہو گا“۔ آخری دور میں جھوٹی حدیث کا فتنہ بہت بڑھ جائے گا اور یہ بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سَيَكُونُ فِي آخِرِ أُمَّتِي أُنَاسٌ يُحَدِّثُونَكُمْ مَا لَمْ تَسْمَعُوا أَنْتُمْ وَلاَ آبَاؤُكُمْ فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ». (مسلم) ”میری امت کے آخری حصے میں ایسے لوگ ہوں

گے کہ وہ تمھیں ایسی باتیں بیان کریں گے جو نہ تم نے سنی ہیں نہ تمھارے باپ دادوں نے سنی ہیں، ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا اور اپنی حفاظت کرنا''۔ ایک اور روایت میں فرمایا: «يَكُونُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُونَ كَذَّابُونَ يَأْتُونَكُمْ مِنَ الْأَحَادِيثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّونَكُمْ وَلَا يَفْتِنُونَكُمْ». (مسلم) ''آخرالزمان میں بہت دجال، بہت فریبی اور جھوٹے ہوں گے جو تمھارے پاس ایسی احادیث یا ایسی باتیں لے کر آئیں گے جو نہ تم نے سنی ہوں گی نہ تمھارے باپ دادا نے، پس ان لوگوں سے بچنا کہ یہ نہ تمھیں گمراہ کریں اور نہ ہی فتنے میں ڈالیں''۔ تو اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ نبیِ اکرم ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا بڑی ذمے داری کی بات ہے۔

کتبِ فتن میں ضعیف احادیث کی کثرت

جب ہم کتبِ فتن کو دیکھتے ہیں تو یہاں جن احادیث واخبار سے استدلال کیا ہے، ان میں زیادہ تر میں صحت حدیث کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ جن حضرات نے اس موضوع پر کلام کیا تو انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی طرف احادیث کی نسبت میں تثبّت اور تحقّق سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنی کتابوں میں ہر طرح کا رطب ویابس جمع کر دیا۔ ہمیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ یہ جو فتن اور ملاحم کی روایتیں ہیں عموماً ان میں صحیح احادیث کی تعداد بہت کم ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ثَلَاثَةُ كُتُبٍ لَيْسَ لَهَا أُصُولٌ: الْمَغَازِي وَالْمَلَاحِمُ وَالتَّفْسِيرُ. (الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع) ''تین طرح کے موضوعات پر کتابیں ایسی ہیں جن کی کوئی پختہ بنیادیں نہیں ہیں یعنی جنگوں وغیرہ کے معاملات (اور اس سے مراد عمومی سیرت بھی ہوتی ہے) اور ملاحم (اور خاص طور پر ملاحم سے مراد وہ جنگیں ہیں جو آخرالزمان میں ہوں گی) اور تفسیر''۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی حدیث بھی ٹھیک نہیں ہے یا کوئی حدیث بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس میں صحیح احادیث کی تعداد کم ہے اور ضعیف اور جھوٹی احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور جس طرح امام خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تشریح میں ان موضوعات پر کتابوں کے

معاملہ میں فرمایا: غَيْرُ مُعْتَمِدٍ عَلَيْهَا وَلَا مَوْثُوقٍ بِصِحَّتِهَا. "اس میں زیادہ تر کتابیں غیر معتبر ہیں جن کی صحت کے بارے میں اعتماد سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی"۔ لِسُوءِ أَحْوَالِ مُصَنِّفِيهَا وَعَدَمِ عَدَالَةِ نَاقِلِيهَا وَزِيَادَاتِ الْقُصَّاصِ فِيهَا. "اس وجہ سے کہ اس طرح کی کتابوں کے مصنفین و مرتبین کے معاملات ٹھیک نہیں ہیں اور زیادہ تر ان حدیثوں کے راوی ثقہ نہیں ہیں، عادل نہیں ہیں کیونکہ اس میں قصہ گو لوگ بہت زیادہ ہیں"۔ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ وضعِ حدیث کا ایک بڑا محرک قصہ گوئی ہے اور اس طرح کی کتابوں میں جو احادیث ہیں، ان میں ایک ڈرامائی پن ہوتا ہے اور ایک پوری تصویر سامنے آتی ہے۔ بہت سی ایسی قدیم کتابیں ہیں جو الہامی کتابیں بھی سمجھی جاتی ہیں، وہ اس نوعیت کی ہوتی ہیں جیسے طویل رزمیہ نظم جو کسی جواں مرد کی ذات پر مرتکز ہو اور ان میں بڑی بڑی جنگوں کی تفصیل بیان ہوتی ہے، انگریزی میں جس کو Epic کہتے ہیں۔ ہندوؤں کی تو کوئی آسمانی کتابیں یا مذہبی کتابیں Epic نوعیت ہی کی ہیں۔ امام خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: فَأَمَّا كُتُبُ الْمَلَاحِمِ فَجَمِيعُهَا بِهَذِهِ الصِّفَةِ. "ملاحم کی جو کتابیں ہیں وہ تو تقریباً ساری کی ساری اسی طرح کی ہیں"۔ تو یہ ہے وہ معاملہ کہ اس طرح کی احادیث میں لوگوں نے اسناد کی طرف کوئی بہت زیادہ التفات نہیں کیا، صحت کی طرف دھیان نہیں کیا اور ایسی احادیث جمع کر دی ہیں کہ جو ثبوت کے درجے کو نہیں پہنچتیں۔

فتن کے موضوع پر امام نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الفتن کی اہمیت

فتن کے موضوع پر جو لوگ لکھتے ہیں، ان کے ہاں امام نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الفتن کا حوالہ بار بار آتا ہے، اس موضوع پر کلام کرنے والے مصنفین نے مذکورہ کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں لگ بھگ دو ہزار کے قریب روایتیں ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ یہ کتاب اس لحاظ سے ایک اہم کتاب ہے، لیکن امام نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت و ثقاہت کے بارے میں اختلاف ہے، ان کے بارے میں ہمیں مختلف آرا ملتی ہیں، جو کتب الجرح والتعدیل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ عمومی طور پر ان کے بارے میں اچھی رائے رکھی گئی ہے، لیکن کچھ معاملات خاص طور پر ان کا مذکورہ بالا یعنی فتن وغیرہ اور ملاحم کی

روایتوں کے معاملے میں ان کے بارے میں رائے کمزور ہے۔ اگرچہ وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں سے ہیں، لیکن ان کے بارے میں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں: من کبار أوعیة العلم لکنه لا ترکن النفس إلی روایاته. ”ان کی ذات تو ہے علم کا بڑا ذخیرہ، لیکن ان کی جو روایتیں ہیں ان کی طرف زیادہ مائل نہیں ہونا چاہیے“۔ اس کا سبب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ بہت سے عجائب اور مناکیر لے کر آتے ہیں۔ اور یہاں یہ بات اہم ہے کہ امام نے ایسا کیوں کیا؟ تو ظاہر بات ہے کہ جب کوئی مصنف ایک کتاب مرتّب کرتے ہیں تو اس موضوع کے متعلق جتنی روایات ہوتی ہیں انھیں جمع کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کا زیادہ اہتمام نہیں ہوتا۔ اور جب کوئی محدث روایات سند کے ساتھ جمع کر دیتا ہے تو پھر گویا ایک لحاظ سے وہ بری ہو جاتا ہے کہ اب جو بھی یہ بحث پڑھے گا تو وہ راویوں کو دیکھ کر ان کی ثقاہت کے مطابق اس پر فیصلہ دے گا۔ مگر یہاں امام نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ کتاب کی ضعیف احادیث کو موجودہ دور کے مصنفین نے بغیر تحقیق کے لینا شروع کیا ہے۔ حالانکہ پہلے حدیث کی کتابیں اہلِ علم کے ہاتھوں میں جاتی تھیں اور وہ ہی ان کو پڑھتے پڑھاتے تھے اور ان کے مباحث کی تحقیق بھی کر لیا کرتے تھے۔ اگر کچھ لوگ بغیر تحقیق کے بھی قبول کر لیں تو اس کا اثر محدود ہوتا تھا اور وہ عوام تک نہیں جاتا تھا۔ اب مسئلہ یہ ہو گیا ہے کہ ہر چیز کی پیداوار بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے، چنانچہ مختلف موضوعات کی طرح فتن اور اشراط الساعۃ پر جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں، یہ بڑے پیمانے پر لکھی جا رہی ہیں اور نشر بھی اسی پیمانے پر ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ان کتابوں کا ماخذ ایک کمزور سورس ہے اور ان کتب کی زیادہ تر احادیث سند کے اعتبار سے کمزور احادیث ہیں۔ ان کی بڑے پیمانے پر نشر واشاعت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ کمزور راویتیں ہر آدمی کی رسائی میں آ گئی ہیں۔

وقوعِ قیامت کے وقت کا تعین ایک غیر حقیقی رویہ

اشراط الساعۃ، ملحمۃ العظمٰی اور فتن کی روایتوں سے متعلق آخری بات ایک بہت بڑی خرابی سے متعلق ہے جو خاص طور پر جدید ادب میں سامنے آئی ہے۔ اور وہ ہے کہ پیش گوئیوں کا بہت بار یکی میں تعین کرنے لگنا، سال مہینوں کا تعین کرنا کہ اس سال میں یہ ہو گا، پھر یہ ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جدید

مصنفین، افسانوں اور فلمی کہانیوں سے خوب متاثر ہیں اور ان کی طرح کی منظر کشی کرتے ہیں، پورا نظام الاوقات مرتب کر کے رکھ دیتے ہیں کہ رواں سال میں یہ واقعہ ہو گا پھر یہ ہو گا۔ چنانچہ یہاں ایک اصول سمجھنا بہت ضروری ہے کہ قیامت کب آئے گی، اس بارے میں بالکل سال مہینے کے ساتھ تعین کرنے والی سب روایتیں جعلی ہیں۔ حافظ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المنار المنیف موضوع احادیث، ان کی اقسام، محرکات اور علامات کے حوالے سے ایک بہت مشہور کتاب ہے، اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ وہ کیا علامتیں ہیں جو متن میں پائی جائیں تو پتا لگتا ہے کہ یہ روایت جعلی، گھڑی ہوئی اور طبع زاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں: أن يكون في الحديث تاريخ كذا وكذا مثل قوله: إذا كان سنة كذا وكذا وقع كيت وكيت وإذا كان شهر كذا وكذا وقع كيت وكيت. (المنار المنيف في الصحيح والضعيف، ص:۶۴) ”اگر حدیث میں اس طرح کی بات ہو کہ فلاں تاریخ میں یہ ہو گا، جب فلاں مہینا ہو گا تو یہ ہو گا، جب یہ مہینا ہو گا تو یوں ہو گا، تو یہ سب کی سب جھوٹی باتیں ہیں“۔ یعنی جس حدیث میں آپ کو اس طرح کی باتیں ملیں تو یہ اس کے جعلی اور من گھڑت ہونے کا ثبوت ہے۔ مزید کہتے ہیں: كقول الكذاب الأشر إذا انكسف القمر في المحرم: كان الغلاء والقتال وشغل السلطان وإذا انكسف في صفر كان كذا وكذاواستمر الكذاب في الشهور كلها وأحاديث هذا الباب كلها كذب مفترى.(المنار المنيف في الصحيح والضعيف، ص:۶۵) ”اسی طرح کسی بہت بڑے جھوٹے اور لپاٹیے کی بات سے لوگوں نے ایک حدیث گھڑ لی جس میں کہا کہ جب محرم میں چاند گرہن ہو گا تو پھر بڑی بربادی ہو گی، جنگ ہو گی اور بادشاہ یا حکومت بالکل انتشار کا شکار ہو جائیں گے اور اگر صفر میں چاند گرہن ہو گا تو پھر یوں یوں ہو گا، اس طرز کی روایات جھوٹی ہیں“۔ اس طرح کی روایتیں ہمارے ہاں بھی بہت مشہور ہیں کہ محرم میں یہ ہو گا، اس سال رمضان میں یہ ہو گا، پھر یہ ہو گا، ایسی زیادہ تر روایتیں جعلی ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ یہ جھوٹا آدمی، جس نے یہ حدیثیں گھڑی ہیں، وہ مختلف مہینوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتا رہتا ہے اور اس نوعیت کی کہ جس میں مہینے اور سن کے تعین کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے، ساری حدیثیں جھوٹی ہیں۔ اس ضمن

میں عبرت کے لیے ایک مصری مصنف فہد سالم صاحب کی تحقیق پیشِ نظر ہے جو انھوں نے اپنی ایک کتاب أسرار الساعة وهجوم الغرب میں شائع کی ہے۔

فہد سالم صاحب نے اپنی کتاب میں اشراط الساعۃ کی روایات کو باقاعدہ متعیّن کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ دجال مسلمان ہوگا، مہدی کے ظہور سے پہلے وہ ایران کا حکمران ہوگا، یہی نہیں بلکہ صراحت سے بتا دیا کہ محمد خاتمی ہی بنیادی طور پر دجال ہے۔ اس کا نام انھوں نے آیت اللہ گورباچوف رکھا ہے۔ انھوں نے وقوعِ قیامت سے پہلے ایک ترتیب بیان کی ہے کہ یہ سارے معاملات ایک ترتیب سے متعیّن تاریخوں میں وقوع پذیر ہوں گے۔ انھوں نے اس کی جو ترتیب بتائی ہے، اس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ پندرہ شعبان ۱۴۲۰ھ (تیئیں نومبر ۱۹۹۹ء) کو مسیح الدجال کا خروج ہو جائے گا۔

۲۔ یکم جنوری ۱۹۹۹ء کو مسجدِ اقصیٰ دھماکے سے تباہ ہو جائے گی۔

۳۔ اس کے بعد مغربی افواج اردن میں آ موجود ہوں گی، بیت المقدس کا محاصرہ کر دیں گی۔

۴۔ اس واقعے کے بعد مہدی، پچیس محرم ۱۴۲۰ھ کو ظاہر ہو جائیں گے۔

۵۔ اسی سال جمادی الثانی، رجب اور شعبان میں ملحمہ ہو جائے گی۔

۶۔ دجال ۱۴۲۰ھ کے آٹھویں مہینے میں ظہور کرے گا۔

۷۔ نزولِ مسیح ۱۴۲۰ھ کے نویں مہینے میں ہو جائے گا۔

۸۔ پھر اسرائیل کے لدا ہوائی اڈے پر دجال کو سیدنا مسیح علیہ السلام قتل کر دیں گے۔

۹۔ ۲۰۰۷ء میں سیدنا مسیح کی وفات ہو جائے گی۔

۱۰۔ دنیا کا خاتمہ ۲۰۱۰ء میں ہو جائے گا کہ جب سورج مغرب سے طلوع ہو جائے گا۔

اب تو ۲۰۱۰ء کے گزرے ہوئے ایک عشرے سے زیادہ زمانہ گزرا ہے، اور ان پیش گوئیوں میں سے کوئی بھی رونما نہ ہو سکی، لیکن ان حضرت نے ۲۰۱۰ء ہی میں سب کچھ ختم کر دیا تھا۔ یہ تو خیر بالکل ہی گپّی اور لپاٹیا آدمی لگتا ہے لیکن سفر الحوالی جو بہت سنجیدہ اور بڑے عالم ہیں، انھوں نے بہت احتیاط سے کلام کیا ہے جیسے ایک بڑے عالم کو کلام کرنا چاہیے، لیکن انھوں نے بھی یوم الغضب، جو اسرائیل کا beginning of the end

ہے، ۲۰۱۲ء میں قرار دیا تھا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ احادیث کی تفہیم کے حوالے سے ہمیں اوپر بیان کردہ پہلوؤں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

موقوفاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور کتبِ فتن

موقوف کا مطلب ہے وہ قول جو کسی صحابی سے منقول ہو اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت نہ ہو، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اگر کوئی قول منسوب ہو تو اس کو مرفوع کہا جاتا ہے۔ پھر موقوفاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی تفصیل ہے کہ اگر صحابی کوئی ایسی بات بیان کرے جو اجتہاد سے نہ کی جا سکتی ہو، مثلاً غیب کی خبر ہے، کہ دنیا کیسے وجود میں آئی، اس کا خاتمہ کیسے ہوگا، جنت جہنم میں کیا ہوگا، فلاں شخص کو کیا عذاب دیا جائے گا، فلاں شخص کو کیا اجر ملے گا؟ اس نوع کی بات ہو، اور پھر اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب بھی نہ کرے، تو اس کو حکماً مرفوع کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یقیناً یہ بات صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی، کیونکہ اس میں اجتہاد اور رائے کی گنجائش نہیں ہے۔ تو علاماتِ قیامت پر کلام کرنے والے ان مصنفین کے حوالے سے ایک یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ لوگ علاماتِ قیامت کے استدلال کے طور پر بہت سے موقوفات صحابہ رضی اللہ عنہم بھی لے کر آتے ہیں۔

اسرائیلیات

فتن پر کلام کرنے والے مصنفین کا ایک بڑا ماخذ اسرائیلی روایات ہیں۔ جو لوگ اس موضوع پر کام کرتے ہیں وہ اسرائیلیات انتہائی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ اسرائیلیات کی اصطلاح اسرائیل سے ماخوذ ہے، اسرائیل سیدنا یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام اور ان کے گیارہ بھائی سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ ان بارہ بیٹوں سے جو اولاد چلی ہے وہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں ہزاروں انبیاے کرام مبعوث ہوئے اور کئی کتابیں بھی لے کر آئے، جن میں تورات، زبور اور انجیل بھی ہیں۔ اور پھر صرف یہ نہیں ہے بلکہ ان کی زبانی روایت بھی ہے، یعنی عام طور پر ہمارے لٹریچر میں اور عام واعظوں کے ہاں حضرت

عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاے بنی اسرائیل کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ اگر آپ پوری بائبل پڑھ جائیں چاہے عہد نامہ قدیم ہو یا عہد نامہ جدید، اسی طرح تورات، انجیل اور زبور بھی پڑھ جائیں، تو آپ کو وہ باتیں وہاں نظر نہیں آئیں گی۔ لہذا اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعات سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر آئے ہیں۔ جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو وہاں پر اہلِ کتاب سے ان کا تعارف ہوا، جبکہ مسلمان اہلِ کتاب سے ایک لحاظ سے متاثر بھی تھے اور ان کے بارے میں اچھی رائے بھی رکھتے تھے، ان سے معروف کی امید بھی رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زیادہ تر بنی اسماعیل میں سے تھے اور ان کے ہاں کتاب اور شریعت کی روایت ہی نہیں تھی۔ لیکن جو لوگ اہلِ کتاب تھے، تورات اور انجیل کے وارث تھے، ان سے توقع تھی کہ یہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی توثیق کریں گے۔ اسی لیے قرآنِ مجید ان سے کہتا ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ (البقرۃ:۴۱) ”تم تو کم از کم اس کے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو“۔ بہر حال، وہ تو بحیثیت جماعت اسلام نہیں لائے مگر ان میں سے کچھ مثلاً، عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ عنہ، بعد میں کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ اور بھی بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو ایمان لائے۔ تو اہلِ کتاب کے تعامل سے بہت سی وہ روایتیں جو اہلِ کتاب کی تھیں، مسلمانوں میں ان کا شیوع ہوا۔ اسی وجہ سے حدیث کے مجموعے میں بھی اور پھر تفسیر کی کتابوں میں بھی اسرائیلیات بہت زیادہ آگئیں۔

اسرائیلیات کی قبولیت اور عدمِ قبولیت کا اصول

علما نے اسرائیلیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور ان کی تقسیم کے حساب سے قبولیت اور عدمِ قبولیت کی درجہ بندی حسب ذیل طریقے پر کی ہے:

ا۔ اسرائیلیات کا ایک حصہ وہ ہے جو کتاب و سنت کی تعلیمات کے موافق ہے اور اسلامی تعلیمات اس کی توثیق کر رہی ہیں، وہ حصہ صحیح ہے، اسے ہم قبول کر لیں گے۔ اس کے متعلق اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ». ”بنی اسرائیل سے روایت کیا کرو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے“۔ لیکن یہاں

پر بھی ایک احتیاط کی ضرورت ہے کہ جب ہم اس کا ذکر کریں گے تو استشہاد کے لیے نہیں بلکہ اہلِ کتاب پر حجت قائم کرنے کے لیے ذکر کریں گے۔ یعنی اگر ان سے آپ نے گفتگو کرنی ہے، ان سے مکالمہ کرنا ہے، تو پھر اس لحاظ سے اسرائیلیات سے ہم استدلال کریں گے، تاکہ اہلِ کتاب پر حجت قائم ہو جائے کہ تمھاری اپنی کتابوں میں بھی تو یہ بات موجود ہے۔ خاص طور پر نبی ﷺ کے بارے میں جو بشارتیں موجود ہیں تو ان کا ذکر بطورِ استدلال کریں گے۔ مشہور روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب تورات کا کچھ حصہ پڑھ رہے تھے تو نبی اکرم ﷺ غضبناک ہو گئے اور آپ ﷺ نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ مُوسَى كَانَ حَيًّا، مَا وَسِعَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي». (مسندِ احمد) ''اگر موسیٰ بھی زندہ ہوں تو ان کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ میری پیروی کریں''۔ تو یہاں پر یہ بات ہے کہ جو چیزیں قرآن و سنت کے موافق ہیں ہم ان کو احتیاط کے ساتھ لے لیں گے اور جو مخالف ہیں انھیں چھوڑ دیں گے۔ چونکہ یہ ایک الگ بحث ہے اور اصولِ فقہ کا موضوع ہے، جبکہ ہمارے لیے حجت قرآن و سنت ہے۔

۲۔ اسرائیلیات کا دوسرا حصہ جو قرآن و سنت کے خلاف ہے اور اس سے نقیض و تضاد کی نسبت رکھتا ہے اس کو ہم چھوڑ دیں گے، اس کا لینا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، یعنی یہ وہ حصہ ہے جس میں تحریف ہوئی ہے، ورنہ ظاہر بات ہے کہ اگر وہ کتابیں اپنی اصل حالت میں ہوتیں تو پھر ممکن نہیں تھا کہ قرآن و سنت کے ساتھ ان کا تضاد ہوتا۔ کیونکہ ہر کتاب اپنے وقت میں نور بھی تھی، ہدایت بھی تھی، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ﴾ (المائدہ: ۴۴) ''بے شک ہم نے تورات نازل کی ہے اور اس میں ہدایت بھی تھی اور نور بھی''۔ لیکن اس میں تحریف ہو گئی اس وجہ سے اس میں بہت سا حصہ ایسا آ گیا جس میں انبیا علیہم السلام کی معاذ اللہ کردار کشی بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں بھی ایسی ایسی باتیں ہیں جو اس کی شان کے لائق نہیں ہیں، تو یہ سب قابلِ رد ہے۔

۳۔ اسرائیلیات کا تیسرا حصہ جس میں تعلیماتِ اسلام سے نہ بظاہر موافقت ہے نہ کوئی معارضت ہے۔ جس طرح قرآنِ مجید میں بہت سی چیزیں بیان ہوئی ہیں، انباء الرسل ہیں اور قصص الانبیاء ہیں، ان میں عام طور پر

اجمال سے کام لیا گیا ہے، زیادہ تفصیل نہیں ہے، لیکن تورات میں تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس کی مثال سیدنا نوح علیہ السلام کے واقعات ہیں، یعنی تورات میں پرانے صحیفے بھی ہیں، Book of Genesis کا تذکرہ ہے۔ اس میں طوفانِ نوح کا تذکرہ ہے جو قرآنِ مجید میں بھی ہے اور بائبل میں بھی، لیکن وہاں پر تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کشتیٔ نوح کی کتنی منزلیں تھیں؟ کتنے اس کے عرشے تھے؟ اور کس عرشے پہ کون سا جانور داخل کیا گیا؟ جبکہ قرآنِ مجید میں اس کشتی کا ذکر اجمال کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مائدے کا ذکر ہے مگر تفصیل نہیں ہے کہ وہ نازل ہوا یا نہیں ہوا۔ لیکن بائبل سے معلوم ہے اور اسرائیلی روایتوں میں ہے کہ وہ نازل ہوا، اس میں فلاں فلاں کھانے تھے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا تذکرہ قرآنِ کریم میں اجمال کے ساتھ ملتا ہے، لیکن اسرائیلی روایات میں اس کی تفصیلات درج ہیں، مثلاً، وہ عصا کیسا تھا، کس درخت کی لکڑی تھی، وغیرہ۔ تو یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لاَ تُصَدِّقُوا أَهْلَ الكِتَابِ وَلاَ تُكَذِّبُوهُمْ». (بخاری) ''اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو''۔ ایک روایت میں اس کی وضاحت یوں فرمائی: «لَا تَسْأَلُوهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوكُمْ بِحَقٍّ فَتُكَذِّبُوا بِهِ، أَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوا بِهِ». (مسندِ احمد) ''ان سے کوئی چیز نہ پوچھو، وہ تمھیں اگر کوئی ایسی بات بتائیں جو صحیح ہو اور نفسِ واقعہ کے مطابق ہو اور پھر تم تکذیب کر دو تو یہ بری بات ہے یا وہ کوئی ایسی بات بتائیں جو باطل ہو اور تم اس کی تصدیق کر دو''۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو، بس ایسے معاملات میں خاموشی اختیار کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بات غلط ہو اور تم اس کی تصدیق کر دو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک بات صحیح ہو تم اس کی تکذیب کر دو۔ یہاں تک ایک اصولی بات مکمل ہو گئی، مگر یہاں پھر وہی عملی مشکل آن پڑی کہ اسرائیلیات کے قرآن و سنت کے موافق و مخالف ہونے کا فیصلہ کون کرے گا۔ چونکہ اہلیت کے موضوع پر ماقبل تفصیلی بحث کی جا چکی ہے کہ یہ پختہ کار علما ہی کا کام ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور اسرائیلی روایات کی موافقت اور عدمِ موافقت کا فیصلہ کریں گے۔

اسرائیلیات کے بارے جدید مصنفین کا طرزِ عمل

اگر ہم اشراط الساعۃ پر جدید مصنفین کی کتب کا جائزہ لیں تو اسرائیلیات کے حوالے سے غیر پختہ مصنفین نے ہر طرح کی اسرائیلی روایات؛ مثلاً، دانیال کا مکاشفہ، یوحنا کا مکاشفہ اور دیگر پرانی کتابوں کے الہام نامے لے کر استدلال کرنا شروع کر دیا۔ دوسرا بڑا مسئلہ ان مصنفین کے ساتھ یہ ہوا کہ انھوں نے ان کتابوں کی روایات لینے کے بعد مزید یہ کیا کہ بائبل کے علما نے اس کی جو تفسیریں لکھی ہیں وہ تفسیریں بھی قبول کر لیں۔ یعنی پہلے ایک نص قبول کی جس کو قبول کرنے کی بھی ان کے اندر اہلیت نہیں تھی، پھر اس پر مزید ستم یہ ڈھایا کہ ان نصوص کی جو تاویلات عیسائی یا یہودی مصنفین نے کی ہیں، وہ بھی قبول کر لیں: ﴿ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (النور: ۴۰) ”اوپر تلے اندھیرے ہی اندھیرے ہیں“۔ خلاصہ یہ کہ جدید مصنفین کے مصادر بہت مخدوش ہیں اور وہ اشراط الساعۃ میں بغیر کسی تحقیق کے ان اسرائیلیات سے استدلال کرتے چلے گئے ہیں، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

علمِ نجوم

کتب احادیثِ فتن کا تیسرا مصدر علمِ نجوم ہے۔ جس کی بدولت اس علم کے ماہرین نجومیوں کی پیش گوئیاں بطورِ استدلال پیش کی جاتی ہیں۔ اس میں خاص طور پر پروفیسر نوسٹراڈیمس کا تذکرہ بار بار آتا ہے اور اس کی ذات جدید مصنفین کے لیے بڑا سرمایۂ علم ہے۔ ان مصنفین نے اس شخص کے متعلق ایک قصہ بھی بنا لیا کہ اصل میں یہ جو پروفیسر نوسٹراڈیمس ہیں، ان کے پاس ہماری میراث سے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا تھا، اس کی وجہ سے انھوں نے اتنی ٹھیک پیش گوئیاں کر دیں۔ اس طرح ان مصنفین نے بے تکلف ہو کر مذکورہ شخص کی پیش گوئیاں بیان کرنی شروع کیں۔ اس موضوع پر کام کرنے والے حضرات کا طریقۂ واردات عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے ضعیف و منکر قسم کی احادیث سے ایک نقشہ کھینچا جاتا ہے، پھر اگر وہاں پر کوئی اجمال تھا تو اس کی تفصیل یہاں سے لے لی جاتی ہے اور پھر ان نجومیوں سے اس کی توثیق کی جاتی۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے عرّاف، کاہنوں اور نجومیوں کے پاس جانے سے منع کیا ہے، اس لیے کہ اس سے انسان اپنے دین ایمان کو خطرے میں ڈالتا ہے۔

علمُ الاعداد

ایک اور علم جس سے یہ مصنفین ضمنی طور پر اشراط الساعۃ اور وقوعِ قیامت کے باب میں استدلال کرتے ہیں، وہ ابجد کا علم ہے، جسے Numerology کہتے ہیں۔ اس میں حروفِ ابجد سے عدد نکالے جاتے ہیں اور اس کی بنیاد پر پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ علم الاعداد، علمِ جَفر اور علمِ رمل ہے وغیرہ کی نسبت جعلی طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف یا سیدنا جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کر دی جاتی ہے۔ تو یہ مستدل بنیادی طور پر بالکل باطل ہے، اس سے غیب نہ دریافت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی شریعت کی رو سے جائز ہے۔

مصنّفین کے خواب

دلچسپ بات یہ ہے کہ پھر اس طرح کی کتابوں میں خوابوں سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ بھی یہ ہوتا ہے کہ پہلے کچھ جھوٹی سچی احادیث کی بنیاد پر ایک منظر بنایا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر اپنے خوابوں کو بنیاد بنایا جاتا ہے کہ مجھے بتا دیا گیا ہے کہ اس وقت یہ جو صورتِ حال ہے یہ وہی ہے، جو ان احادیث میں آئی ہے۔ حالانکہ خواب کوئی دلیل نہیں ہوتے، اس لیے خوابوں کے متعلق جب ہم تعلیماتِ اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوابوں کی تین قسمیں فرمائی ہیں: ایک قسم کے خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ (بخاری) جن کو ہمارے ہاں رحمانی خواب کہا جاتا ہے۔ بعض خواب تسویل الشیطان یعنی شیطانی خواب ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض خواب احادیث النفس ہوتے ہیں، جن میں انسان کا نفس اس سے کلام کرتا ہے۔ انسان جن چیزوں کے بارے میں غور و فکر کرتا رہتا ہے، سوچتا رہتا ہے اور جو امیدیں آرزوئیں باندھتا ہے، وہی چیزیں علامتی طور پر مشخّص ہو کر اس کے خوابوں میں آتی رہتی ہیں۔ چونکہ حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے: «إِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ تَكَدْ تَكْذِبُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ، وَرُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ». (بخاری) ”جب دنیا کے خاتمے کا وقت قریب آجائے گا تو کسی مسلمان کا خواب کم ہی ہو گا کہ جھوٹا نکلے اور مسلمان کا خواب نبوت کا چھیالیس واں حصہ ہے“۔ تو جدید مصنفین اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں، حالانکہ خوابوں کے بارے میں شریعت کے کچھ اصول بھی ہیں جن کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

خوابوں کی تعبیر کے کچھ اصول

بعض لوگوں کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ خواب میں ایک چیز ہمیں دکھائی گئی ہے اور وہ ایسی ہی ہوگی، تو اس کے متعلق جاننا چاہیے کہ بات اتنی سادہ بھی نہیں ہے بلکہ خوابوں کے بارے میں شریعت کے کچھ اصول بھی ہیں جن کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی الہام ہو، وہ کوئی اللہ کی طرف سے ہی کوئی اشارہ ہو، بلکہ خواب ہر طرح کے ہوتے ہیں، شیطان کی دراندازی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاعلیہم السلام کے خواب بھی وحی کے قبیل سے ہوتے ہیں، وہ بھی حجت ہوتے ہیں، لیکن غیر نبی کو تو کوئی استثنا حاصل نہیں ہے، اس کو تو کوئی بچت نہیں ہے کہ وہ جو خواب دیکھ رہا ہے اس میں کتنا حصہ رحمانی ہے اور کتنا حصہ شیطانی ہے۔ اسی طریقے سے یہ بات کہ کوئی آدمی خواب کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کر دے تو یہ ایسے ہی نہیں مانا جائے گا بلکہ دیکھا جائے گا کہ وہ آدمی کیسا ہے، اس کا کردار کیسا ہے، جیسے ہمیں اصولی بات بتائی گئی: ﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ (الحجرات:٦) ”اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو“۔ تو خواب بیان کرنا بھی تو ایک خبر ہی ہے، تو خواب دیکھنے والے کو بھی دیکھیں گے، اس کے کردار کو بھی دیکھیں گے کہ کیا یہ آدمی قابلِ اعتماد بھی ہے یا نہیں؟ چونکہ خواب کا معاملہ بہت ناقابلِ اعتماد اور انوکھا ہے، آپ اسے باطل بھی قرار نہیں دے سکتے اور نہ ہی اس کی صحت وصداقت کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے اس معاملے میں بہت تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: «إِنَّ مِنْ أَفْرَى الْفِرَى أَنْ يُرِيَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ فِي الْمَنَامِ مَا لَمْ تَرَيَا». (مرقاۃ المفاتیح) ”بہت بڑا بہتان ہے کہ انسان آنکھوں کو وہ خواب دکھائے جو اس نے نہ دیکھا ہو“۔ جب آپ جاگتے میں جھوٹ بولتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے فلاں آدمی کو یہ کرتے دیکھا، تو اس میں پھر کوئی امکان ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور آدمی بھی وہاں موجود ہو اور وہ اس کی اس گواہی کو رد کر دے کہ یہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے، معاملہ ایسے نہیں ہوا تھا۔ لیکن خواب کو کسی گواہی سے یا کسی دوسرے کے انکار سے رد نہیں کیا جا سکتا، اس لحاظ سے یہ بہت حسّاس معاملہ ہے، کیونکہ خواب کے نام پر کوئی بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ پھر اسی طریقے سے خوابوں میں جو کچھ انسان کو دکھائی دیتا ہے وہ

علامتوں میں ہوتا ہے، جس طرح احادیث میں آتا ہے کہ دودھ کو فطرت سے تعبیر کیا گیا۔ جیسے خواب میں سیدنا عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کا "کرتا" لمبا دکھایا جانا، جس کی تعبیر اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دین سے کی، یعنی کہ ان کا دین کامل ہے۔ نبیٔ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک موقعے پر ایک طویل خواب بیان فرمایا اور سیدنا ابوبکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ بھی وہاں موجود تھے۔ تو سیدنا ابوبکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے نبیٔ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اجازت سے اس خواب کی کچھ تاویل بیان کی اور پھر انھوں نے کہا: فَأَخْبِرْنِي يَا رَسُولَ اللهِ، بِأَبِي أَنْتَ أَصَبْتُ أَمْ أَخْطَأْتُ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَصَبْتَ بَعْضًا وَأَخْطَأْتَ بَعْضًا». (بخاری) "یا رسول اللہ! میرا باپ آپ قربان ہو، کیا میں نے یہ صحیح بیان کر دیا یا غلطی کر دی؟ تو نبیٔ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ بعض حصے میں آپ کی تعبیر ٹھیک تھی اور بعض میں غلط تھی"۔ سیدنا ابوبکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ جیسی فراست، ایمان وبصیرت کس کو حاصل ہوگی، لیکن رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ بعض حصہ آپ نے ٹھیک حل کیا اور بعض نہیں کیا۔ تو اب یہاں پر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے بھی تاویل بیان کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے تو پھر کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ تو خوابوں کا معاملہ اور ان کا استعمال اس طرح کے لٹریچر میں بھی ناقابلِ اعتماد ہے۔

کشف والہام

دیگر مصادر کی طرح ان مصنفین کا ایک اور مصدر وماخذ کشف والہام ہے۔ بعض اوقات کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ مجھے یہ کشف ہوا ہے، مجھے یہ دکھایا گیا ہے۔ تو یہ ظاہر بات ہے کہ کشف ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ سجھا سکتے ہیں بتا سکتے ہیں، خواب میں بھی بتا سکتے ہیں، بیداری کی حالت میں بھی بتا سکتے ہیں۔ لیکن اس کو طے کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس خارج میں قرآن وسنت کی کسوٹی موجود ہے۔ یعنی نہ کسی خواب کی بنیاد پر نہ کسی کشف اور الہام کی بنیاد پر کسی ایسی چیز کو قبول کیا جائے گا جو قرآن وسنت کے خلاف ہے یا جو اس سے ٹکراتی ہے۔ جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ پرانے لوگوں نے بہت سی احادیث کی بھی تاویلات کی ہیں۔ خاص طور پر وہ جو ایک شخص کا تذکرہ ہے کہ دجال اس کو قتل کرنا چاہے گا، لیکن اسے قتل نہیں کر پائے گا۔ لوگوں نے اس کی تاویل کی کہ وہ خضر ہیں، تو اس طرح کی باتیں بہت سے لوگوں نے کہی ہیں، لیکن کشف

میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔

مخطوطات

اور پھر ان تمام مصادر کے علاوہ ایک اور مصدر بھی ہے جو امین جمال الدین صاحب نے بھی بیان کیا اور کوئی بھی اس مصدر کو اختیار کر لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ جی مجھے فلاں جگہ یا لائبریری سے مخطوطہ ملا ہے اور وہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ کسی کے علم میں نہیں تھا اور اس میں یہ روایات موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں ہر وقت یہ دیکھنا ہے کہ جو چیز ان کتابوں میں بیان کی جا رہی ہے اور جن مآخذ و مصادر کو متعیّن کیا جا رہا ہے ان کی حیثیت کیا ہے؟ ضابطہ کیا ہے؟ جو بھی روایت بیان کی جا رہی ہے اس کا درجہ کیا ہے؟ اور یہ جو مستدل بیان کیا جا رہا ہے، چاہے وہ کشف کی شکل میں ہو چاہے خواب کی شکل میں ہو، چاہے وہ کسی اسرائیلیات کے حوالے سے ہو تو اس کی حیثیت کیا ہے؟ جب تک ہم دینی معاملات میں کوئی بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچائیں گے تو اس کی علمی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

* * * * *

احادیثِ فتن کا اطلاق و انطباق اور راہِ اعتدال

نصوصِ دینیہ میں ہمیشہ یہ ایک اہم معاملہ رہا ہے کہ کسی نص کی تطبیق کس طرح کی جائے، یعنی کسی نص سے حکم کیسے اخذ کیا جائے اور کسی معاملے پر اس کا اطلاق کیسے کیا جائے۔ چنانچہ احادیثِ فتن کے باب میں بھی جب کوئی حدیث سامنے آتی ہے تو اس کے بعد یہ پہلو اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ حدیث کا درست فہم حاصل ہونے کے بعد اب ہم نے اسے کسی واقعے پر منطبق بھی کرنا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک جائز امر ہے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہ اطلاقات کیے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دجال کی جو اخبار و صفات بتائی گئی تھیں ان کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ صیاد کا جائزہ لیا۔ اسی طرح خوارج والی روایات کا اطلاق خوارج پر کیا گیا اور اگرچہ وہ علامات عام ہیں، بعد کے دور میں بھی ایسا اطلاق ہو گا یعنی جدید دور میں بھی ایسے گروہ پیدا ہوئے جن میں وہی علامات پائی گئیں جو اس دور کے خوارج میں تھیں۔ جس طرح نوآبادیاتی نظام میں اعتزالِ جدید پیدا ہوا، اسی طرح اب مابعد از نوآبادیاتی نظام میں جدید خارجیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بعض احادیث کا اطلاق اپنے دور کے حالات پر کیا، فرماتے ہیں: حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم وِعَاءَيْنِ: فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ، وَأَمَّا الآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هَذَا البُلْعُومُ. (بخاری) ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (علم کے) دو برتن یاد کر لیے ہیں، ایک کو میں نے پھیلا دیا ہے اور دوسرا برتن اگر میں پھیلاؤں تو میرا یہ نرخرا کاٹ دیا جائے''۔ وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں لونڈوں کی امارت سے اور ساٹھ کی دہائی سے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ رَأْسِ السَّبْعِينَ وَإِمَارَةِ الصِّبْيَانِ». (مسندِ احمد) ''ساٹھ کی دہائی اور لونڈوں کی امارت سے اللہ کی پناہ مانگو''۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے: «هَلَكَةُ أُمَّتِي عَلَى يَدَيْ غِلْمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ». (بخاری) ''میری امت کی

ہلاکت قریش کے کسی لڑکے کے ہاتھوں میں ہوگی"۔اس کے بعد بنوامیہ نے جو معاملات کیے توان احادیث کے اطلاقات بنوامیہ پر بھی کیے گئے۔

یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ انطباق میں احتیاط کی خاص ضرورت ہے جو بھی انطباق کیاجائے گاخارج میں پیش آنے والاواقعہ یاتواس کی تائید کردے گایااس کی تکذیب کردے گا۔جس طرح سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: قَامَ فِينَا رَسُولُ اللهِ ﷺ مَقَامًا مَا تَرَكَ شَيْئًا يَكُونُ فِي مَقَامِهِ ذَلِكَ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا حَدَّثَ بِهِ حَفِظَهُ مَنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مَنْ نَسِيَهُ، قَدْ عَلِمَهُ أَصْحَابِي هَؤُلَاءِ وَإِنَّهُ لَيَكُونُ مِنْهُ الشَّيْءُ قَدْ نَسِيتُهُ فَأَرَاهُ فَأَذْكُرُهُ كَمَا يَذْكُرُ الرَّجُلُ وَجْهَ الرَّجُلِ إِذَا غَابَ عَنْهُ، ثُمَّ إِذَا رَآهُ عَرَفَهُ.(مسلم)"ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے کھڑے ہوئے اور آپ نے اس وقت سے لے کر قیامت تک ہونے والی کوئی (اہم) بات نہ چھوڑی مگراسے بیان فرمادیا،جس نے اسے یادرکھااس نے اسے یادرکھااور جس نے اسے بھلادیااس نے اسے بھلادیا،وہ سب کچھ میرے ان ساتھیوں کے علم میں ہے۔پھران میں سے کوئی چیز پیش آتی ہے جو میں بھول چکاہوتاہوں توجب اسے دیکھتاہوں تووہ مجھے یادآجاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے انسان کسی غائب شناساشخص کاچہرہ جب دیکھتاہے تواسے پہچان لیتاہے"۔یعنی وہ کہتے ہیں کہ خارج میں کوئی واقعہ،شخصیت یااحوال دیکھ کر مجھے یادآتاہے کہ یہ تووہی بات ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔اس کا مطلب ہے کہ خارجی واقعات،اخبار کی تصدیق کردیتے ہیں،البتہ اس میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔اپنی تطبیق اور اطلاق کوحتمی نہیں سمجھنا چاہیے، واقعات پراحادیث کا اطلاق کرنے میں جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ خوب تامل اور غور وفکراور اس واقعے یااشخاص کے اوصاف معلوم کرلینے کے بعد ہی ایساکرنا چاہیے،اس لیے کہ یہ واقعہ کی تصدیق وتکذیب کا محتاج ہے۔اس کی مثال ہمیں اس واقعے سے ملتی ہے،سیدنا عبداللہ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب انھوں نے بنوامیہ کی امارت کاانکار کرتے ہوئے مکہ میں اپنی حکومت قائم کرلی توایک بڑافتنہ وقوع پذیر ہوا۔وہ یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ کے خلاف اقدام کے دوران کعبہ شریف پر بھی حملہ کردیاگیااور منجنیق سے اس پر سنگ باری کی گئی۔ اب ایک حدیث بھی ایسی موجود تھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ کے گرائے جانے کاذکر فرمایاتھا:«يُخَرِّبُ

الْكَعْبَةَ ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ، وَيَسْلُبُهَا حِلْيَتَهَا، وَيُجَرِّدُهَا مِنْ كِسْوَتِهَا، وَلَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ أُصَيْلِعَ أُفَيْدِعَ، يَضْرِبُ عَلَيْهَا بِمِسْحَاتِهِ وَمِعْوَلِهِ». (مسندِ احمد) ”کعبہ کو چھوٹی اور پتلی پنڈلیوں والا ایک حبشی برباد کردے گا، وہ اس کے زیورات کو لوٹ لے گا اور اسے غلاف سے محروم کردے گا۔ میں گویا اس کو دیکھ رہا ہوں؛ گنجا، ٹیڑھے ہاتھ پاؤں والا، کعبے کو اپنے بیلچے اور کدال کے ذریعے سے ڈھا رہا ہے“۔ توجب بنوامیہ کی طرف سے خانۂ کعبہ پر چڑھائی کی گئی تو جن لوگوں نے یہ حدیث سن رکھی تھی ان کے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ وہی واقعہ تو نہیں ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ ان میں مشہور تابعی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں جنھوں نے یہ روایت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے سنی تھی۔ آپ خود بیان کرتے ہیں کہ جب عبداللہ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کعبے پر تاراج کیا گیا اور یہ منہدم ہوگیا تو میں دیکھنے گیا کہ ان لوگوں کے اوصاف کیا وہی ہیں جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں کہ وہ حبشی اور گنجا ہوگا جو خانۂ کعبہ کو گرائے گا، تو یہ اوصاف مجھے وہاں نظر نہیں آئے۔ میرا ایک وہم تھا کہ کہیں یہ وہی تو نہیں جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی کی تھی۔ چنانچہ تسلی کرنے کے بعد میرا وہم ختم ہوگیا۔ اس میں بھی ہمارے لیے رہنمائی ہے کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے واقعے پر حدیث کا انطباق کرنے میں جلدی نہیں کی بلکہ تامل اور غور وفکر سے کام لیا اس طرح وہ غلطی سے بچ گئے۔ ایک روایت میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَنَّ فِي ثَقِيفٍ كَذَّابًا وَمُبِيرًا». (مسلم) ”بنوثقیف میں ایک بہت بڑا کذاب ہوگا اور ایک بہت بڑا سفاک ہوگا“۔ اس کے بارے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: قولها في الكذاب فرأيناه تعني به المختار بن أبي عبيد الثقفي كان شديد الكذب ومن أقبحه ادعى أن جبريل صلى الله عليه وسلم يأتيه واتفق العلماء على أن المراد بالكذاب هنا المختار بن أبي عبيد وبالمبير الحجاج بن يوسف. (شرح النووی علی مسلم، ج:۱۶، ص:۹۹) ”کذاب، یعنی ایک بڑا جھوٹا بنوثقیف میں پیدا ہوگا، اس کے بارے میں جو کہا کہ اسے ہم نے دیکھ لیا، اس سے مراد مختار بن ابی عبید الثقفی تھا اور اس نے جو یہ دعویٰ کیا کہ میرے پاس جبرائیل علیہ السلام آتے ہیں، اور علما کا اتفاق ہے کہ کذاب سے مراد یہاں مختار بن ابی عبید ہے اور مبیر سے مراد حجاج بن یوسف ہے“۔ یعنی مبیر بہت بربادی کرے گا، فساد مچائے گا، لوگوں کی گردنیں کاٹے گا،

اس پر علما کا اتفاق ہوا کہ اس کا بڑا اطلاق حجاج بن یوسف پر کیا گیا۔ اسی طرح ایک روایت میں اللہ کے نبی ﷺ نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «وَيْحَ عَمَّارٍ، تَقْتُلُهُ الفِئَةُ البَاغِيَةُ». (بخاری) ”افسوس، عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی“۔ چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ جنگِ صفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے لڑتے ہوئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جب یہ واقعہ ہوا تو اس وقت کچھ لوگوں نے جنگ چھوڑ دی، بلکہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کا ساتھ بھی چھوڑ دیا کہ جیسے یہ واضح ہو گیا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا جتھا ہی باغی گروہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ ساری بات رکھی گئی کہ عمار شہید ہو گئے ہیں اور یہ روایت بیان کی گئی ہے تو انھوں اس کی ایک تاویل کرلی، کہا کہ اصل میں اس کو قتل انھوں نے کیا ہے جو اسے لے کر آئے ہیں، یعنی ان کو شہید کروانے کا سبب ہم نہیں بلکہ دوسرا گروہ ہے۔ اسی طرح سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ نے پیش گوئی کی اور وہ بھی سامنے آگئی۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ نے پیش گوئی کی کہ: «إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ المُسْلِمِينَ». (بخاری) ”میرا یہ بیٹا سردار ہے اور شاید اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا“۔ اس کا بھی مکمل اطلاق ان کی خلافت کے دور میں ہوا جب انھوں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کی۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ پیش گوئیوں پر واقعات کا پورا پورا اطلاق کیا گیا اور کچھ پیش گوئیاں افراد کے حوالے سے تھیں وہ بھی پوری ہوئیں، بعض اوقات کچھ اوصاف بیان ہوئے، ان کا تعین کیا گیا جو درست ثابت ہوا اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔

اصطلاحات کو بگاڑنے کا عمل اور اس کے نتائج

احادیث میں عموماً اور فتن و اشراط الساعۃ میں خصوصاً، درست تفہیم میں اہم مسئلہ اصطلاحات کا ہے۔ پہلا ضروری امر یہ ہے کہ اصطلاحات جیسی ہیں ان کو ویسے ہی سمجھا جائے، ان کو بگاڑا نہ جائے۔ جیسے حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: ضل قوم فرووه

المسيخ بالخاء المعجمة وشدد بعضهم السين ليفرقوا بينه وبين المسيح عيسى بن مريم بزعمهم وقد فرق النبيﷺبينهما بقوله في الدجال مسيح الضلالة فدل على أن عيسى مسيح الهدى. (فتح الباری، ج: ۱۳، ص: ۹۴) ’’کچھ لوگ گمراہ ہو گئے اور انھوں نے المسیح الدجال کو ’’ح‘‘ کے بجائے ’’خ‘‘ سے المسیخ پڑھا۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے اپنے تئیں سیدنا مسیح عیسیٰ ابنِ مریم علیہما السلام سے تفریق کرنے کے لیے ’’مسیح‘‘ کو ’’مسّیح‘‘ مشدد پڑھا۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے بھی ان میں تفریق کی ہے اور دجال کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ مسیح الضلالہ ہے، گویا آپ ﷺ نے بتا دیا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مسیح الہدیٰ ہیں‘‘۔ یہاں قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ جن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اصطلاحات کو بگاڑنے کی کوشش کی۔ اُس زمانے میں بھی یہ ہوتا رہا اور آج بھی محمد عیسیٰ داؤد اور ان جیسے کئی لوگ المسیح الدجال کو المسیخ الدجال کہتے ہیں۔

اجنبی اصطلاحات کا استعمال

اسی طرح ایک غلط رویہ یہ بھی سامنے آیا کہ کچھ ایسی اصطلاحات جو ہماری دینی روایت میں اجنبی ہیں، ان کو کچھ دیگر دینی اصطلاحات یا احادیث میں وارد اصطلاحات کا مرادف سمجھا جانے لگا اور پھر بے تکلف ان کی جگہ استعمال کرنا شروع کیا گیا اور بار بار ایسے انداز میں بیان کیا گیا جیسے وہ ہماری نصوص سے نکلی ہوئی کوئی شرعی اصطلاح ہے۔ اس کی بہت بڑی مثال ’’ہرمجدون‘‘ ہے جس کو بائبل کی روایتوں میں Armageddon کہا گیا ہے، اس کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ احادیث میں الملحمة یا الملحمة العظمٰی کا تذکرہ گویا اس کا مترادف ہے۔ یہ ایک غلط تصور ہے، اس لحاظ سے احتیاط برتنی چاہیے۔ اسرار عالم صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے ہاں اصطلاحات کی بھرمار ہے۔ ایک محتاط اندازہ ہے کہ ان کی دجال سیریز کی کتابوں میں سینکڑوں اصطلاحات ہیں، جو انھوں نے خود سے گھڑی ہیں، جن میں سے کچھ عربی، کچھ عبرانی، کچھ سریانی اور کچھ دیگر زبانوں کی ہیں۔ ان کی کتابیں تو جیسے ایک چیستان ہے۔ فلسفے کی رو سے موجودہ دور مابعد از جدیدیت کا دور ہے، اگر آپ اس دور کے مصنفین Jacques Derrida، Michel Foucault اور جان

Jean Baudrillard کا مطالعہ کریں تو ان کے ہاں بھی آپ کو بہت بھاری بھرکم، مشکل اور Hybrid قسم کی اصطلاحات ملیں گی یعنی کئی زبانوں سے مل کر ایک اصطلاح بنائی گئی ہے۔ ان کے مدمقابل ہم اسرار عالم صاحب کو فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی ایک صاحب ہیں جو پوسٹ ماڈرن یونزا میں لکھتے ہیں۔ اصطلاحات کو ٹھیک رکھنے اور بگاڑنے سے بچنے کے حوالے سے نبیؐ اکرم ﷺ نے ایک موقعے پر فرمایا:

«لَا تَغْلِبَنَّكُمُ الْأَعْرَابُ عَلَى اسْمِ صَلَاتِكُمْ، فَإِنَّهَا الْعِشَاءُ، وَإِنَّهُمْ لَيُعْتِمُونَ بِالْإِبِلِ». (ابنِ ماجہ)

''اعرابی تمھاری نماز کے نام میں تم پر غالب نہ آجائیں، یہ عشا ہے، وہ لوگ اونٹنیوں (کا دودھ اندھیرے کے وقت دوہنے) کی وجہ سے اسے عتمہ (اندھیرے کی نماز) کہتے ہیں''۔ اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ صلاۃ العتمۃ مغرب کے لیے بھی بول دی جائے اور عشا کے لیے بھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عتمہ کا لفظ بولا جائے، اصل میں مراد عشا کی نماز ہو، لیکن غلطی سے لوگ اس کو مغرب کی نماز سمجھ لیں۔ آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ شرعی اور دینی اصطلاح کو بدلا نہ جائے۔

اصطلاحات کی من مانی تشریح

اصطلاحات کے حوالے سے ضروری ہے کہ ان کے بیان کردہ اوصاف کے علاوہ خود ساختہ اضافے نہ کیے جائیں۔ مثلاً، مہدی یا دجال یا دیگر اصطلاحات کی جو صفات یا اوصاف، صحیح احادیث میں بتائے گئے ہیں ان میں اپنے قیاس سے مزید اوصاف شامل نہ کیے جائیں۔ ہم نے عیسٰی داؤد صاحب کے ہاں پڑھا تھا کہ مہدی طویل القامت ہوں گے اور ان کا قد ۱۸۰ سے ۱۹۰ سینٹی میٹر تک ہوگا، اسی طرح وہ عِقال نہیں باندھیں گے بلکہ جدید رومی لباس پہنیں گے، ان کا لباس بدویانہ نہیں ہوگا بلکہ ایک جدید مغربی لباس ہوگا اور باقاعدہ فلاں طرز کا ان کا کوٹ ہوگا، فلاں طرز کی رومی ٹوپی ہوگی۔ یہ سب بلاوجہ کی اختراعات ہیں اور تلعّب بالدّین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے قاری ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا ہو جس میں کہیں احادیث بیان ہوئی ہوں اور کہیں مصنف کا اپنا قول تو ایک عام قاری کی حالت زار یوں ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات وہ مصنف کے

اپنے قول کے متعلق بھی سمجھنے لگتا ہے کہ شاید یہ معلومات بھی کسی حدیث سے لی گئیں ہیں، لہٰذا دھیان کرنا چاہیے کہ بلاوجہ خود ساختہ اضافے نہ کیے جائیں۔

قیامت برپا کرنے کی انوکھی خواہش

ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ فی زمانہ مقالات، تصانیف نیز گفتگو میں لوگ اس حوالے سے عجلت کا شکار ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ چاہ رہے ہیں کہ ایسے حالات برپا ہوں، یعنی حالات اس نہج پر پہنچ جائیں کہ مہدی کا ظہور ہو جائے، دجال مشخّص ہو کر سامنے آجائے اور پھر سیدنا مسیح کا نزول ہو۔ ہمارے ہاں تو کچھ لوگوں کی یہ محض خواہش ہے کہ ایسے معاملات ہوں، جبکہ مغربی اقوام، جن کا ایک بڑا طبقہ یہود و نصاریٰ پر مشتمل ہے، وہ تو اسرائیل کے حوالے سے باقاعدہ اس کی کوشش کرتے ہیں، بہت سے معاملات میں چاہتے ہیں کہ وہ منظر نامہ پیدا ہو۔ یہود تو صدیوں سے انتظار میں ہیں کہ ان کا مسیحا آئے گا اور ان کے برے دن ختم ہوں گے، دنیا پر غلبہ ہوگا۔ نوّے کی دہائی کے اواخر میں Grace Halsell نامی خاتون، جو متعدّد امریکی صدور کے مشیر کے طور پر کام کرتی رہی، نے ایک کتاب Forcing God's Hand کے نام سے تحریر کی۔ یہ اس حوالے سے نہایت عمدہ کتاب ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ کس طرح صیہونی یہودی اور صیہونی اور ایونجلیکل عیسائی چاہتے ہیں کہ ایسے حالات برپا ہوں، تاکہ ان کا مسیحا آجائے۔ کتاب کا عنوان بھی واضح ہے کہ Forcing God's Hand یعنی خدا کو مجبور کرنا کہ ہم ایسے حالات پیدا کر دیں تاکہ ہمارا مسیحا آئے۔ جیسے ہمارے ہاں بھی بیان ہوتا ہے کہ وہ مسجدِ اقصیٰ کے نیچے سرنگیں بنا رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا جب وہ اس کو گرا دیں گے، جس کے ردعمل میں عربوں میں اشتعال پیدا ہو جائے گا اور جنگیں برپا ہو جائیں گی، نتیجتاً ان کا مسیحا آئے گا۔ لہٰذا اس رویے کے بارے میں ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب کسی انتشار، ہنگامے، جنگ یا برے حالات کی خبر انھیں ملتی ہے تو ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ دیکھیں! ہم نہ کہتے تھے کہ تیسری عالمگیر جنگ ہونے والی ہے۔ کبھی کبھی ان پر ہنسی آتی ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ کو وہ ایسے بیان کرتے ہیں کہ جیسے وہ تقدیراتِ الٰہیہ میں سے کوئی مشروع امر ہے جس بارے قرآن وسنت کی

نصوص بھی وارد ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ ملحمہ کی روایات، جو ویسے بہت کمزور ہیں، ان روایات سے وہ ایک مکمل نظریہ گھڑ کر کہتے ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ ہی ملحمہ ہوگی اور اس کے بعد تمام واقعات یوں ظہور پذیر ہوں گے۔ ایک عنصر اس میں یہ بھی ہے کہ عوام میں ایک مایوسی بھی ہے، کتنے ہی لوگ ہیں جنھوں نے پوری پوری زندگیاں دین کے غلبے، اسلامی انقلاب اور اچھے حالات کے لیے لگا دیں مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ اتنی جد وجہد کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکل پا رہا تو اسی مایوسی میں وہ اس رویے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ احیائی تحریکوں کو بھی اب لگ بھگ سو برس ہونے کو آ رہے ہیں لیکن بظاہر خارج میں کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے، چنانچہ اب وہ چاہتے ہیں کہ چلیں ان سے تو کچھ ہو نہیں پایا، تو اب تکوین ہی محرک ہو جائے، اللہ کی قدرت حرکت میں آئے اور اس خدائی مداخلت کے ذریعے سے وہ سب اہداف حاصل ہو جائیں۔ ایسے میں بعض اوقات بہت المناک صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے مشہور شاعر انور مسعود یوں تو مزاحیہ شاعر ہیں، لیکن انھوں نے کچھ سنجیدہ شاعری بھی کی ہے جس میں ان کی ایک غزل کے کچھ اشعار مجھے بار بار یاد آتے ہیں:

کب ضیا بار ترا چہرۂ زیبا ہوگا
کیا جب آنکھیں نہ رہیں گی تو اجالا ہوگا

مشغلہ اس نے الگ سونپ دیا ہے یارو
عمر بھر سوچتے رہیے کہ وہ کیسا ہوگا

یعنی وہ اسلامی انقلاب، اسلامی حکومت، خلافت معلوم نہیں کب ظہور پذیر ہوگی، جب ہماری آنکھوں سے روشنی ختم ہو جائے گی تو کیا پھر اس کا ظہور ہوگا؟ انور مسعود صاحب کی ان اشعار سے مراد تو کچھ اور ہے مگر ہم اس کا اطلاق یوں کر رہے ہیں۔ جو امور تکوینی ہیں اس میں ہمیں کچھ نہیں کرنا، یعنی معاذ اللہ، اگر روایتوں میں آیا ہے کہ بدکاری پھیل جائے گی، جہالت عام ہو جائے گی، پھر قیامت آئے گی تو کیا اب ہم یہ کہیں کہ چونکہ اللہ کے نبی نے پیش گوئی کی ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس پیش گوئی کو پورا کریں اور ان خرابیوں میں پڑیں تاکہ وہ بات پوری ہو، معاذ اللہ! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایسے حالات چونکہ ہم پر آئیں گے اس لیے ہمیں تشریعی امور میں کچھ ہدایات دی گئی ہیں اور ہماری رہنمائی کی گئی ہے لیکن یہ سمجھنا کہ ہمیں یہ حالات پیدا کرنے ہیں، یہ منظر نامے تشکیل

دینے ہیں بالکل غلط تصور ہے، یہ ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس رویے میں مارکسسٹ تصورات کا دخل ہو۔ ان کے ہاں یہی نظریہ ہے کہ حالات کو خراب ہونا چاہیے، حالات خراب ہوں گے اور ایک خاص نہج تک پہنچیں گے تو ہی انقلاب کی راہ ہموار ہوگی۔ اس لیے ان خیالات کی حامل انقلابی جماعتیں عوامی فلاح و بہبود کے کام کے خلاف کہتے ہیں کہ یہ عوامی فلاح و بہبود کا کام بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے ڈھانچے کو تھامے رکھنے اور اس کی مدد کرنے کے لیے ہے اور اس کی حیثیت انقلاب کی راہ کو روکنے والے ایک حفاظتی بند کی ہے۔ تمام NGOs اور One Point Agenda رکھنے والی جماعتیں اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں حالات ابتر ہوں اور مزید ابتر ہوتے چلے جائیں۔ جب حالات خرابی کی انتہا تک پہنچیں گے تبھی عوام مشتعل ہوں گے، مزدور طبقہ مشتعل ہوگا، اٹھے گا اور انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس حوالے سے ایک ماثور قول ہے کہ: الْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَعَنَ اللہ مَنْ أَيْقَظَهَا. (کنز العمال) "فتنہ سورہا ہے، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس شخص پر جو اس کو بیدار کرتا ہے"۔ واضح ہوا کہ ہمیں Forcing God's Hand کا کام نہیں کرنا۔

تاریخ میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ لوگوں نے اس کو برپا کرنے کے لیے یا وہ منظر نامہ تشکیل دینے کے لیے کچھ تحریف بھی کی۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن عبد اللہ بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ جنھیں نفسِ زکیہ کہا جاتا ہے، انھوں نے اپنا لقب مہدی قرار دے دیا۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ: وتلقب بالمهدي طمعا أن يكون هو المذكور في الأحاديث فلم يكن به، ولا تم له ما رجاه ولا تمناه. (البداية والنهاية: ج:۱۰، ص:۹۰) "انھوں نے اس آرزو میں مہدی لقب کر لیا کہ وہی مہدی ہوں جس کا تذکرہ احادیث میں ہوا ہے، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ان کی امید اور تمنا پوری نہیں ہوئی"۔ اسی طرح عباسی خلیفہ مہدی ابن المنصور نے بھی اپنا لقب اسی امید پر مہدی رکھا۔ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: وَإِنَّمَا لُقِّبَ بِالْمَهْدِيِّ طَمَعًا أَنْ يَكُونَ هُوَ الْمَوْعُودَ بِهِ فِي الْأَحَادِيثِ، فَلَمْ يَكُنْ بِهِ، وَإِنِ اشْتَرَكَا فِي الِاسْمِ؛ لِأَنَّهُ لَمْ يُشْبِهْهُ فِي الْفِعْلِ، ذَاكَ يَأْتِي آخِرَ الزَّمَانِ وَعِنْدَ فَسَادِهِ، فَيَمْلَأُ الْأَرْضَ عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا وَظُلْمًا. وَقَدْ قِيلَ: إِنَّ فِي أَيَّامِهِ يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بِدِمَشْقَ. (البداية والنهاية، ج:۱۳، ص:۵۴۰) "انھوں نے بھی مہدی کا لقب

اختیار کیا اس امید پر کہ وہی ہے جس کا احادیث میں تذکرہ آیا ہے۔ ایسا نہیں تھا، اگر نام مشترک ہو بھی گیا ہو تو فعل یا حالت میں کچھ مشابہت نہیں، وہ تو آخر الزمان میں آئیں گے جب دنیا فساد سے بھری ہوئی ہوگی۔ وہ زمین کو یوں عدل سے بھر دیں گے جیسے وہ پہلے ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی، جیسا کہ (روایت میں) کہا گیا کہ ان کے دور میں عیسیٰ ابنِ مریم علیہما السلام کا دمشق میں نزول ہوگا"۔ اسی طرح مہدی جون پوری کے حوالے سے ہم دیکھ چکے کہ اس کا نام محمد بن یوسف تھا، اس نے اپنا نام بدلا، پھر اپنے والد کا نام بھی بدلا اور عبد اللہ رکھ دیا، اپنی ماں کا نام آمنہ رکھ دیا اور ان کے یہ نام لوگوں میں پھیلائے تاکہ یقین دلائے کہ علامتیں اس میں پائی جا رہی ہیں۔ اسی طرح برصغیر میں غلام احمد قادیانی نے مختلف حیلے کیے، چونکہ روایتوں میں آیا ہے کہ دمشق کے مشرقی جانب ایک مینار ہوگا جس پر سیدنا مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا، تو اس نے اس پیش گوئی کو پورا کرنے کے لیے قادیان میں ایک مینارہ تعمیر کرایا جو آج بھی وہاں موجود ہے۔ لہٰذا جعلی طور پر ان علامات کو پورا کرنے کی کوشش کرنا یا ایسے حالات برپا کرنے کی کوشش کرنا کہ جس میں یہ واقعات ظہور پذیر ہوں، یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے۔

دورِ فتن میں دین کے معاملے میں ثبوت کی اہمیت

جب حالات اچھے ہوں، سماج بھی خیر پر ہو، دینی روایت بھی مضبوط ہاتھوں میں ہو، تب تو ہم عام اعتماد پر لوگوں سے چیزیں لے لیتے ہیں۔ لیکن جب ہم دیکھیں کہ دینی اتھارٹی کے معاملات بھی مخدوش ہو گئے ہیں اور خاص طرح سے معلومات کا ایک طغیان ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص کے ہاتھ میں یوں لگتا ہے کہ اوزار آ گئے ہیں، علم کے ادوات آ گئے ہیں، آلات آ گئے ہیں، جس کی بنیاد پر وہ دینی معاملات پر کلام کرنے لگا ہے۔ تو اس صورتِ حال میں اس کی ضرورت تھی کہ ہم اس بات کو بھی واضح کریں کہ ثبوت کو بھی دیکھنا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں یعنی اہلیت اور ثبوت جڑی ہوئی ہیں۔ یعنی کس سے لینا ہے اور کون کلام کرے گا، اور جو مصدر ہے اس کو متعیّن کرنا ہے۔ بشیر العدوی ایک تابعی ہیں وہ سیدنا عبد اللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور ان سے باتیں کرنے لگے اور کہنے لگے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تو سیدنا عبد اللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کوئی زیادہ التفات نہیں کر رہے تھے، کوئی بہت توجہ سے بات نہیں سن رہے تھے، تو انھوں نے گلہ کیا کہ اے ابنِ عباس! کیا وجہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ

آپ میری بات کوئی توجہ سے نہیں سن رہے، جبکہ میں آپ سے رسول اللہ ﷺ کی بات بیان کر رہا ہوں؟ تو سیدنا عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے جو جواب دیا وہ بہت اہم ہے، فرمایا: إِنَّا كُنَّا مَرَّةً إِذَا سَمِعْنَا رَجُلًا يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، ابْتَدَرَتْهُ أَبْصَارُنَا، وَأَصْغَيْنَا إِلَيْهِ بِآذَانِنَا، فَلَمَّا رَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَ، وَالذَّلُولَ، لَمْ نَأْخُذْ مِنَ النَّاسِ إِلَّا مَا نَعْرِفُ. (مقدمة الإمام مسلم، ص:۱۳) ”ہمارا معاملہ یہ تھا کہ ایک وقت وہ تھا جب ہم کسی شخص کو یہ کہتا ہوا سنتے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا، تو ہماری صورتِ حال یہ ہوتی کہ ہماری نگاہیں اس کی طرف لپکتیں اور ہم اپنے کانوں کے ساتھ اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتے، لیکن اب جب لوگوں نے ہر طرح کا رطب ویابس اور صحیح غلط بیان کرنا شروع کر دیا، تو اب ہم لوگوں سے نہیں لیتے مگر وہی جسے ہم پہچانتے ہیں“۔ تو یہ بات اہم ہے یہ جو سوشل میڈیا کا سائبر ایج ہے، جس میں کوئی بھی شخص آجائے خاص طرح کا حلیہ بنا کر اور بڑے اچھے Gadgets کے ذریعے وہ چیزیں ریکارڈ کر لے، اور سیٹ بھی بہت اچھا ہو اور پھر اس میں اچھوتی اور نئی نئی باتیں، ندرت والی باتیں، چونکا دینے والی باتیں، سنسنی خیزی والی باتیں کرنا شروع کر دے تو اسے قبولیت حاصل ہو جائے گی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ کون صاحب ہیں؟ کہاں سے پڑھے ہیں؟ ان کے استاد کون ہیں؟ ان کی سند کیا ہے؟ اور علوم کی تحصیل انھوں نے کہاں سے کی ہے؟ بس اب تو ایک سلیبر ٹی کلچر ہے اور کچھ کلٹ ہے، کچھ پرسنالیٹیز کو ہم نے بت جیسا درجہ دے دیا ہے اور ان کے Credentials کو دیکھنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ بس ایک دفعہ کوئی چیز کلک کر جائے اور فیس بک کی زبان میں لائیکس اور یوٹیوب کی زبان میں ویوز بڑھ جائیں، تو جب ایک خاص تعداد سے آپ کے ویوز بڑھ جاتے ہیں تو یہ بجائے خود آپ کی شہرت کے لیے اور ان ویوز کو آگے بڑھانے کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں۔ یعنی اگر آپ سمجھ لیں کہ بیس ہزار، پچیس ہزار ویوز ہو گئے ہیں تو وہ آرام سے تین چار لاکھ ہو سکتے ہیں۔ زیادہ ویوز سے لوگوں کو احساس ہو گا کہ یہ کوئی ایسی بات ہے کہ جس کی طرف لوگ التفات کر رہے ہیں۔ امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اس دور کے حوالے سے بہت ہی کار آمد اور متعلق ہے، وہ کہتے ہیں: لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْإِسْنَادِ، فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ، قَالُوا: سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ، فَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ، وَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدَعِ فَلَا يُؤْخَذُ

حَدِيثُهُمْ. (مقدمہ مسلم، ص:۱۵) صحابہ اور پھر تابعین اسناد کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے (اعتماد کی ایک فضا تھی)، جب فتنہ واقع ہو گیا تو وہ کہنے لگے ہمیں بتاؤ، تم جو یہ بات بیان کر رہے ہو اس کی سند کیا ہے؟ تم نے کسی صحابی سے یہ بات سنی ہے یا کسی اور تابعی سے بات سنی ہے؟ اور پھر دیکھا جانے لگا کہ راویانِ حدیث اگر اہل السنۃ میں سے ہیں، تو پھر ان کی احادیث لی جانے لگیں اور جو اہلِ بدعت تھے، ان کی روایتوں کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ لہذا جو فتنہ ابتداءاً اس امت میں واقع ہوا وہ سیاسی نوعیت کا تھا، چنانچہ شیعانِ علی اور شیعانِ معاویہ کی جو جنگیں ہوئیں، ان سے ایک پولیٹیکل تقسیم ہو گئی۔ اس دور میں عبداللہ ابنِ سبا اور خوارج کا فتنہ بھی نمودار ہوا، تو محمد ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پہلے تو معاملہ اس طرح کا نہیں تھا، پہلے اسناد کے بارے میں لوگ نہیں پوچھتے تھے، سوال نہیں کرتے تھے، لیکن جب سے فتنہ پھیلا ہے تو اب وہ اسناد کے بارے میں سوال کرنے لگے۔

دین پر ثابت قدمی کی دعا

عام حالات میں بھی اور خاص طور پر فتنوں کے دور میں جماؤ اور ثبات کی دعا کی بہت ضرورت ہے، جامع ترمذی کی ایک روایت ہے، حضرت شہر بن حوشب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے امِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: ام المؤمنین! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام آپ کے یہاں ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ تر دعا کیا ہوتی تھی؟ انھوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر یہ دعا پڑھتے تھے: «يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ». "اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جما دے"۔ امِ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ خود میں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ اکثر یہ دعا کیوں پڑھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا أُمَّ سَلَمَةَ! إِنَّهُ لَيْسَ آدَمِيٌّ إِلاَّ وَقَلْبُهُ بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللهِ، فَمَنْ شَاءَ أَقَامَ، وَمَنْ شَاءَ أَزَاغَ». (ترمذی) "اے امِ سلمہ! کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جس کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے اس کی دو انگلیوں کے درمیان نہ ہو، تو اللہ جسے چاہتا ہے (دینِ حق پر) قائم و ثابت قدم رکھتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کا دل ٹیڑھا کر دیتا ہے"۔ پھر راویٔ حدیث معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی روایت کرنے کے بعد یہ آیت پڑھی: ﴿رَبَّنَا لاَ تُزِغْ

قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا﴾ (آل عمران:۸) ”اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہدایت دے دینے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی (گمراہی) نہ پیدا کر“۔ لہٰذا بہت ڈرنا چاہیے اور قرآنِ مجید میں یہ جو دعا آئی ہے اس کو بہت کثرت سے پڑھنا چاہیے، خاص طور پر ان ایامِ فتن میں جس سے ہم دوچار ہیں۔ نبیٔ اکرم ﷺ کی ایک دعا ہے: «اللهُمَّ رَبَّ جَبْرَائِيلَ، وَمِيكَائِيلَ، وَإِسْرَافِيلَ، فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ، اهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ، إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ».(مسلم) ”اے اللہ! جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے رب! آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمانے والے! پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والے! تیرے بندے جن باتوں میں اختلاف کرتے تھے تو ہی ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، جن باتوں میں اختلاف کیا گیا ہے تو ہی اپنے حکم سے مجھے ان میں سے جو حق ہے اس پر چلا، بے شک تو ہی جسے چاہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے“۔ لہٰذا یہ دعا بھی کثرت سے کرنی چاہیے اور جن معاملات میں اختلاف کر لیا گیا ان میں یہ دعا کی جائے کہ اے اللہ! تو اس میں اپنے حکم سے صحیح راہ اور حق کی طرف ہماری رہنمائی فرما۔

فتنوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت

اختلاف کا دور ہے، طرح طرح کی، بھانت بھانت کی آوازیں لگ رہی ہیں، ہر طرف سے فتنے نمودار ہو رہے ہیں۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الْفِتْنَةَ تُعْرَضُ عَلَى الْقُلُوبِ، فَأَيُّ قَلْبٍ أُشْرِبَهَا نُكِتَتْ فِيهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ، فَإِنْ أَنْكَرَهَا نُكِتَتْ فِيهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ، فَمَنْ أَحَبَّ مِنْكُمْ أَنْ يَعْلَمَ أَصَابَتْهُ الْفِتْنَةُ أَمْ لَا فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ كَانَ يَرَى حَرَامًا مَا كَانَ يَرَاهُ حَلَالًا، أَوْ يَرَى حَلَالًا مَا كَانَ يَرَاهُ حَرَامًا، فَقَدْ أَصَابَتْهُ الْفِتْنَةُ».(حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، ص:۲۷۲) ”فتنے دلوں پر ڈالے جائیں گے، جو دل ان سے سیراب کر دیا گیا (اس نے ان کو قبول کر لیا اور اپنے اندر بسا لیا)، اس میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جائے گا اور جس دل میں ان کو رد کر دیا اس میں سفید نقطہ پڑ جائے گا، جو

شخص تم میں سے چاہتا ہے کہ وہ جانے کہ اس کو فتنہ لاحق ہو گیا ہے یا نہیں، تو ذرا دھیان کرے کہ وہ چیز جس کو حرام جانتا تھا اب وہ اس کو حلال جانتا ہے یا جس کو وہ پہلے حلال سمجھتا تھا اب اس کو حرام تصور کرتا ہے، (اگر ایسا ہے) تو وہ فتنے میں ملوث ہو گیا ہے"۔ یعنی اگر فتنہ آیا، دل پر پیش ہوا اور اس نے قبول کر لیا، تو فتنے میں پڑنے کی علامت ہے۔ ظاہر بات ہے فتنے کی قبولیت کی وجہ دل کا شکی ہونا ہے، کیونکہ اسے درست علم حاصل نہیں تھا، صحیح صحبت میسر نہیں تھی اور اعمال قبیح تھے۔ دین کو اہلِ علم سے لینے کے بجائے دانشوروں سے لینے سے یہی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جب کوئی میڈیا اور میڈیا کے دانشوروں سے دین لینے کا عادی ہو جائے تو پھر لا محالہ نتیجہ یہی ہو گا۔ البتہ وہ شخص جس کا دل اچھا اور پاکیزہ ہو گا اور اس نے دل کے آئینے کو سنبھال کر رکھا ہو گا، اس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص اس فتنے کا انکار کرتا ہے، تو اس کے دل پر ایک سفید نقطہ پڑ جاتا ہے، یہ عزیمت والا عمل انسان کو بلند کرنے والا ہوتا ہے، جیسے کہتے ہیں: عند الامتحان يكرم المرء أو يهان. یعنی امتحان کے موقعے پر یا تو آدمی کی تکریم ہو جاتی ہے یا اس کو رسوا کر دیا جاتا ہے۔ تو یہاں بھی دو ہی نتیجے ممکن ہیں یا تو اس کا دل سیاہ ہوتا جائے گا یا اس کا دل اللہ تعالیٰ مزید منوّر کرتے چلے جائیں گے۔ یہاں جانچ کا طریقہ بھی اس روایت نے بتا دیا، جو نہایت اہم بات ہے کہ وہ جس چیز کو حرام جانتا تھا اور اب اسے حلال سمجھتا ہے یا جس کو پہلے حلال دیکھتا تھا اب اس کو حرام دیکھتا ہے، تو وہ فتنے میں پڑ چکا ہے۔ تصویر کا فتنہ دیکھ لیجیے، ہمارے استاد کا ایک جملہ ایک زمانے میں بہت پھیلا، کہہ لیجیے کہ بڑا وائرل ہوا: "ایک دور تھا کہ تصویر حرام تھی پھر وہ وقت آیا کہ تصویر مباح (جائز) ہو گئی اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تصویر واجب ہو گئی ہے"۔ یعنی تصویر کے بغیر اب دین کا کام کرنا ناممکن ہو چکا ہے، فتنے میں یوں ہی ہوتا ہے:

تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

آج کی ہماری غلامی قبل از آزادی کے دور سے زیادہ بڑی غلامی ہے۔ تب ہمارا تن نوآبادیاتی نظام کے شکنجے میں آیا، دل و دماغ بھی اس غلامی کا شکار ہوئے، لیکن پھر تن تو آزاد ہو گیا لیکن دل و دماغ پہلے سے بھی زیادہ کالونائز ہو چکے ہیں۔ جگر مراد آبادی کا بڑا خوبصورت شعر ہے:

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ہمارے نوآباد کار آقاؤں نے پورے عالمِ اسلام کو اس وقت چھوڑا جب اسے پوری طرح برباد کر کے رکھ دیا۔ آپ کے لاشعور کی سطح تک رسائی حاصل کی اور ایک پورا تعلیمی نظام نصب کر گیا، جس کے بارے میں علامہ اقبال نے یوں اظہارِ خیال کیا:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

اور

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

جبکہ اکبر الٰہ آبادی نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بد نام نہ ہوتا
افسوس کے فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بہر حال مختصر بات یہی ہے کہ فتنوں کا دور ہے، یہاں قدم قدم پر ہمیں نئے فتنوں کا سامنا ہے، ایسے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ مشتبہ امور سے دور رہنے اور معروف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم تثبت کا رویہ اختیار کریں، ہر نئی دعوت ہر نئی پکار ہر نئی کانسپیریسی تھیوری کے پیچھے دوڑنا، حدیث کا کوئی بھی نادر سا اور اچھوتا سا مطلب بیان کرنے والے کی طرف لپکنا درست رویہ نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لیں، دھیان کرلیں اور معاملات کو ان کے مقام پر پہنچنے دیں۔ لہذا درکار رویہ یہی ہے کہ تحمل سے کام لینا حتیٰ کہ واقعہ وقوع پذیر ہو جائے اور معاملہ پختہ ہو جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ عدل وانصاف میں بعض لوگوں کو محسوس ہوا گویا آپ ہی مہدی ہیں۔ تو حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ (مشہور

تابعی) سے پوچھا گیا کہ کہیں عمر بن عبدالعزیز مہدی تو نہیں ہیں؟ چونکہ ان کے دور میں غیر معمولی خوشحالی تھی اور انصاف کا دور دورہ تھا، تو یہ علامت مہدی کے بارے میں بھی بتائی گئی ہے۔ اسی طرح مال کی کثرت ہوگئی جب حکمرانوں کے ہاتھوں بیت المال سے ناجائز فائدے اٹھانے اور چوری کا خاتمہ ہوا اور عوام کو ان کا حق ملنے لگا۔ حضرت طاوس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: لا إنه لم يستكمل العدل كله. ''نہیں، وہ کامل عدل جس کا تذکرہ مہدی کے ہاں ملتا ہے وہ یہاں بہر حال ہم نہیں دیکھتے''۔ (سیر اعلام النبلاء، ص: ۱۳۰)۔ لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم ایک نظریہ قائم کریں، حالات پر اس کا اطلاق کریں، پھر ہم دیکھیں کہ جو منظر نامہ ہم نے بنایا ہے، کچھ اجزا کا اس پر انطباق نہیں ہو رہا، تو ہم ان اجزا کا انکار کر دیں یا ان کی کوئی تاویل کر دیں۔

غیب پر ایمان کی اہمیت

بعض باتیں انسان کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں یا کسی خاص وقت تک وہ سمجھ نہیں آتیں۔ لیکن اگر وہ باتیں قرآنِ کریم یا صحیح احادیث میں منقول ہوئی ہیں تو ہمیں بلا چوں چراں ان پر ایمان لانا چاہیے، یعنی ہمارا ایمان ہماری سمجھ کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتیں ایسی بتائیں جو اس زمانے کے لوگوں کے لیے بہت مشتبہ تھیں لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس میں کوئی چوں چراں نہیں کی، کوئی اعتراضات نہیں کیے، بلکہ ان کو مان لیا۔ جیسے ایک صحیح روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الحِجَازِ تُضِيءُ أَعْنَاقَ الإِبِلِ بِبُصْرَى».(مسلم) ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ارضِ حجاز سے ایک آگ نکلے گی جو بُصریٰ میں اونٹوں کی گردنوں کو روشن کردے گی''۔ جان لیجیے کہ یہ تقریباً ساڑھے تین سو میل کی مسافت ہے اور اتنی مسافت سے آگ کا نظر آنا بظاہر بہت محال ہے، لیکن چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ بات نکلی تو سلف نے اس کو قبول کر لیا۔ اسی طرح وہ احادیث بھی ہیں جن میں تاتاری فتنے اور ترکوں کا تذکرہ ہے۔ ایک حدیث یوں ہے کہ: «لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُونَ التُّرْكَ، قَوْمًا وُجُوهُهُمْ كَالْمَجَانِّ الْمُطْرَقَةِ يَلْبَسُونَ الشَّعَرَ، وَيَمْشُونَ فِي الشَّعَرِ».(مسلم) ''قیامت قائم نہیں ہوگی

یہاں تک کہ مسلمان ترکوں سے جنگ کریں گے یہ ایسی قوم ہے جن کے چہرے کٹی ہوئی ڈھالوں کی طرح ہوں گے۔ یہ لوگ بالوں کا لباس پہنتے ہوں گے، بالوں (کے جوتوں) میں چلتے ہوں گے"۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں کہتے ہیں: وقد وجدوا في زماننا هكذا. وهذه كلها معجزات لرسول الله ﷺ فقد وجد قتال هؤلاء الترک بجميع صفاتهم التي ذكرها ﷺ صغار الأعين، حمر الوجوه، ذلف الأنف. (المنهاج شرح صحيح مسلم، ج:۱۸، ص:۳۷) "ہمارے دور میں (جو فتنۂ تاتار ہے اس میں) ہم نے یہ سب دیکھ لیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ ہم نے ان ترکوں سے قتال کیا تو ان میں یہ تمام صفات جو آپ ﷺ نے بیان کی تھیں وہ ہم نے دیکھ لیں؛ مثلاً، آنکھوں کا چھوٹا ہونا، سرخ چہرے والا ہونا اور چپٹی ناک والا ہونا"۔ تو اس سے یہ پتا چلا کہ بہت ساری باتیں ہمیں سمجھ نہیں آتیں، اور یہ ضروری بھی نہیں کہ ہم ہر پوشیدہ معاملے سے واقفیت حاصل کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم دین کے معاملے میں بہت سارے معاملات میں خبرِ صادق پر اعتماد کریں، محض عقل کے گھوڑے نہ دوڑائیں۔

*****

احادیثِ فتن کا بیان اور معتدل راستہ

ہم تفصیل سے گزشتہ ابواب میں یہ مباحث پڑھ چکے ہیں کہ احادیثِ فِتَن کے بیان میں کس قدر عدم توازن اور غیر ذمے دارانہ رویے کا مظاہرہ کیا گیا۔ لہذا یہ سوال بہت سے لوگوں کی طرف سے اٹھایا گیا ہے اور یقیناً یہ اہم سوال ہے کہ احادیثِ فتن کے بیان کی ضرورت ہے بھی کہ نہیں، اور اگر ضرورت ہے تو کس قدر ہے؟ تو اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ ان احادیث کا بیان ہونا چاہیے اس لیے کہ اگر ضرورت نہ ہوتی تو نبیٔ کریم ﷺ بھی اس موضوع پر کلام نہ فرماتے۔ جب نبیٔ اکرم ﷺ نے اس موضوع پر کلام فرمایا تو اس سے واضح ہوا کہ یہ موضوع اہم ہے اور اس سے واقفیت ضروری ہے۔ جب آپ ﷺ نے احادیثِ فتن ارشاد فرمائیں تو ان میں ہمارے لیے عبر و موعظت کا سامان ہے اور اس کی دیگر حکمتیں بھی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے خروج سے پہلے لوگوں کی اکثریت غافل ہو چکی ہوگی: «لَا يَخْرُجُ الدَّجَّالُ حَتَّى يَذْهَلَ النَّاسُ عَنْ ذِكْرِهِ، وَحَتَّى تَتْرُكَ الْأَئِمَّةُ ذِكْرَهُ عَلَى الْمَنَابِرِ». (مسندِ احمد) ''دجال کا خروج نہیں ہوگا یہاں تک کہ لوگ اس کے ذکر سے غافل ہو چکے ہوں گے یہاں تک کہ ائمہ منبروں سے اس کا ذکر کرنا چھوڑ دیں گے''۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یاد دہانی کے لیے ان احادیث کا بیان ہوتے رہنا چاہیے، لیکن یہ بات سمجھنی چاہیے کہ یہ موضوع دین کا محض ایک حصہ ہے، پورا دین نہیں ہے۔ دین کے اور بہت سے پہلو بھی ہیں، دین کے بعض مستقل موضوعات ہیں، جیسے: ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معاملات، تو اصل تعلیم و تربیت تو ان بڑے موضوعات کے دائرے میں رہنی چاہیے۔ رسمی تعلیم چاہے لمبے دورانیے والی ہو یا مختصر دورانیے والی اسی طرح غیر رسمی تعلیم جسے عام طور پر دعوت و تبلیغ یا حلقہ ہائے دروس یا دورۂ تربیت کہا جاتا ہے وہ بھی اسی دائرے ہی کے متعلق رہنی چاہیے، اس

لیے کہ یہ دین کا مستقل اور بڑا میدان ہے۔ اب اس کے مقابلے میں احادیثِ فتن کو لیں تو یہ دین کا محض ایک چھوٹا سے جز ہے، لہٰذا اس موضوع کو اپنی توجہ و محنت کا اتنا ہی حصہ دینا چاہیے جتنا کہ یہ ہے۔ علما کی اکثریت ایسا ہی کرتی ہے، آپ دیکھتے ہوں گے کہ ہر دور میں کم لوگ ہوتے ہیں جن کو احادیثِ فتن یا اس طرح کی احادیث میں اشتغال ہوتا ہے۔ لیکن میں نے عرض کیا کہ یہ جو دور ہے اس کی صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ جس میں چونکہ لوگوں کے ہاں لذت اندوزی بہت بڑھ گئی ہے، بہت سی چیزوں میں تفریح کرنا غالب آتا جارہا ہے اور ٹھوس، گہرا، واقعی اور حقیقی علم لوگوں کا مطمحِ نظر نہیں رہا، بلکہ سنسنی خیزی اور اس طرح کی چیزیں مطلوب ہیں۔ اس لیے عام لوگ احادیثِ فتن کی طرف زیادہ رغبت کرتے ہیں۔ اس میں اتنی زیادہ محنت کرنا کہ ایسا لگے کہ گویا دین کا اصل فرض ان احادیث کی توجیہ وانطباق ہے، درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس موضوع کو اعتدال کی حدود کے اندر سمجھنے کی کوشش کریں اور ان موضوعات کو جو لوگ بیان کر رہے ہیں انھیں چاہیے کہ نسبت وتناسب کا خیال رکھیں۔

سنسنی خیز باتوں کی طرف رجحان میں اضافہ

اگر آپ جائزہ لیں تو جو واقعی بڑے علما ہیں، وہ کوئی غیر محتاط باتیں نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ سوشل میڈیا پر ان کی تشہیر بہت کم ہوتی ہے، کیونکہ لوگوں کی دلچسپی سنسنی خیز باتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ محتاط علما دین کے عمومی اور ضروری موضوعات کے متعلق گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے موضوعات میں بہت کم ویوز آتے ہیں۔ اسی طرح آپ دیکھ لیں کہ پینتالیس منٹ کا ان کا ایک درس ہے یا کوئی بیان ہے تو اس کو سننے والے بہت تھوڑے ہوں گے۔ لیکن اب جو کاروبارِ گلشن چل رہا ہے، وہ کلپس پر چل رہا ہے، پانچ پانچ منٹ کے کلپس بنائے جاتے ہیں، اور اس میں بھی ایک طریقۂ واردات ہوتا ہے، کچھ لوگ خاص طرح کے سنسنی خیز Captions بناتے ہیں، جس میں کوئی چونکا دینے والی بات یا Controversial بات ہو۔ اس طرح کے کلپس کے لائیکس بعض اوقات لاکھوں میں چلے جاتے ہیں۔ تو یہ بدذوقی پھیل گئی ہے اور ایسے دور میں پھر اس طرح کی احادیث کے بارے میں گفتگو اور وہ بھی بعض اوقات نااہل لوگوں کی طرف سے وہ

لوگوں کو بہت Attract کرتی ہے اور لوگ مائل بھی ہوتے ہیں۔ پہلے بھی بیان ہوا کہ پچھلے کچھ سالوں میں کثرت سے ایسی تحریریں لکھی گئیں، جن میں بغیر کسی اہلیت یا صلاحیت کے، بغیر یہ دیکھے کہ جو روایات وہ استعمال کر رہے ہیں ان کا درجہ کیا ہے اور بغیر استنباط کا طریقۂ کار برتتے ہوئے بڑے بڑے دعوے کیے گئے۔ بطور عبرت و نمونہ ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے، جو مصری صحافی محمد عیسیٰ داؤد نے -جن کا ہم پہلے بھی تذکرہ کر چکے ہیں- اپنی کتاب کتاب المفاجات کے تمہیدی حصے میں لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں: اللهم تقبّل عملي هذا واجعلني، اللهم من كتبته في لوحك المحفوظ أول رجل في أمة سيدنا محمد صلى الله عليه و آله وسلم يمهد للمهدي سلطانه كما تفضلت على من قبل وجعلتني أول رجل في الكرة الأرضية يكشف أن المسيخ الدجال له قلعة في برمودة، وأنه صاحب الأطباق الطائرة وأنه السامري وأنه صاحب الختم على العملة الأمريكية بشعاره هو لا الماسونية وأنه هو الذي صاغ بروتوكولات شيوخ صهيون، وأنه صاحب الوجه الآخر للموامرة على البشرية، فاجعلني اللهم أول من يبنى منبرا للمهدي في مصر والعالم الإسلامي والكرة الأرضية، وهيئ العقول للخير القادم، حاملا سنبلة خضراء يتضاعف عطاؤها رزقا واسعا لكل أبناء آدم، وفي اليد الأخرى سيف ليقطع عنق الشر والأشرار اللهم وكما جعلت كتبي وأفكاري رزقا واسعا للكثيرين في كل مسارات أرضك، فسلط اللهم سيف انتقامك على من يسرق فكري أو يحاول تعطيل مسيرتي بأي كيد وضيع كوضاع أهل الكيد والسرقة والشر والكذب. (المفاجاة، ص:۹) ”اے اللہ! تو میرے اس عمل کو قبول فرما۔ اے اللہ! امتِ محمد ﷺ میں پہلے شخص کے طور پر میرا نام تو لوحِ محفوظ میں لکھ دے جو مہدی کی سلطنت اور حکومت کے لیے تیاری کرتا ہے یا اس کی راہ ہموار کرتا ہے۔ جیسے کہ تو نے اس سے پہلے بھی مجھے فضیلت دی، مجھ پر کرم و عنایت کی کہ تو نے مجھے کرۂ ارضی پر وہ پہلا شخص بنایا جس نے اس بات کو کھول کر رکھ دیا کہ مسیخ الدجال (مسیح الدجال کو یہ صاحب مسیخ الدجال لکھتے ہیں) کا قلعہ برمودا تکون میں ہے، اور یہ کہ اڑن

طشتریوں میں جو مخلوقات سفر کرتی ہیں وہ دجال کے لوگ اور اس کی فوج ہیں، اور یہ کہ دجال ہی سامری ہے، اور یہ کہ امریکی اسٹیبلشمنٹ کی رہنمائی بھی وہی کرتا ہے نہ کہ فری میسنز اور یہ کہ اسی نے در حقیقت Protocols of Elders of Zionist تحریر کیے ہیں اور یہ کہ وہی انسانیت کو حکم دینے والی دوسری شخصیت ہے۔ (یعنی وہ اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ انھیں یہ فضیلت ملی کہ سب سے پہلے انھوں نے یہ "عظیم انکشافات" کیے)۔ اے اللہ! تو مجھے ان پہلے لوگوں میں شامل کر کہ جو مصر، عالمِ اسلام اور تمام کرۂ ارضی میں مہدی کے لیے پہلا منبر نصب کریں۔ اور مجھے توفیق دے کہ میں انسانی عقول کو آنے والے خیر کے لیے تیار کروں۔ وہ خیر کہ جو ایک سبز شاخ (شاخِ زیتون) کا حامل ہے جس کی عطائیں بہت زیادہ ہوں گی اور جو بنی آدم کو وسیع رزق عطا کرے گا۔ مہدی کے ایک ہاتھ میں تو یہ سبز شاخ ہوگی جس سے وہ بنی آدم کو نوازے گا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہوگی جس سے وہ برے اور بدکار لوگوں کی گردنیں مارے گا۔ اے اللہ جیسے تو نے میری کتابوں اور میرے افکار کو زمین کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے لیے وسیع رزق بنا دیا (ان کے لیے ایک نہایت فکری خوراک مہیا ہوئی)۔ اے اللہ! تو اپنے انتقام کی تلوار ہر اس شخص پر مسلط کر دے جو میرے افکار کو چوری کر رہا ہے (حضرت کو یہ گلہ بھی ہے کہ وہ نادر اور اچھوتی باتیں، جو سب سے پہلے انھوں نے منکشف کیں، لوگ اپنے ناموں سے ان باتوں کو پھیلا رہے ہیں یعنی ادبی سرقہ کیا جا رہا ہے) اور ان لوگوں پر بھی تلوار مسلط کر دے کہ جو میرے اس مشن کو معطل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اپنی چالوں کے ذریعے سے، اور چالیں چلنے والوں، چوری کرنے والوں، برائی اور جھوٹ پھیلانے والوں پر اپنی تلوار مسلط کر کے ان کو گرا دے، ذلیل کر دے"۔ یہ اقتباس یہاں عبرت کے لیے درج کیا گیا تاکہ آپ دیکھیں کہ ان کو اپنی رائے پر کتنا تیقن ہے، حالانکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں بالکل بے سروپا باتیں لکھی ہیں، جن کا مطالعہ گزشتہ صفحوں میں ہم کر چکے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ دعا بھی ہے کہ اللہ مجھے اس پر فضیلتیں عطا فرمائے۔

قربِ قیامت کے واقعات کی ترتیب کے بیان میں احتیاط

اشراط الساعۃ کی روایات کے حوالے سے ایک مسئلہ واقعات کی ترتیب کا ہے، کئی احادیث سے محسوس

ہوتا ہے کہ یکے بعد دیگرے معاملات ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک مشہور حدیث سیدنا حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ ہم نے کہا کہ قیامت کا ذکر کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتَّى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ – فَذَكَرَ – الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُولَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَيَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ: خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذَلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ». (مسلم) ”قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ دس نشانیاں اس سے پہلے نہیں دیکھ لو گے۔ پھر ذکر کیا دھوئیں کا، دجال کا، زمین کے جانور کا، سورج کے مغرب سے نکلنے کا، عیسیٰ علیہ السلام کے اترنے کا، یاجوج ماجوج کے نکلنے کا، تین جگہ خسف کا یعنی زمین کا دھنسنا ایک مشرق میں، دوسرے مغرب میں، تیسرے جزیرۂ عرب میں۔ اور ان سب نشانیوں کے بعد ایک آگ پیدا ہوگی جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی ان کے (میدان) محشر کی طرف لے جائے گی“۔ اس حدیث میں دس علامات بیان ہوئیں، جن میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ خاص طور سے آخری بات جو بیان کی، دیگر احادیث سے پتا چلتا ہے کہ وہ سب سے آخری واقعہ ہے۔ ورنہ یہاں دجال کا ذکر پہلے ہے، اسی طرح طلوع الشمس بالمغرب پہلے اور نزول عیسیٰ علیہ السلام بعد میں ہے جبکہ ترتیب کے لحاظ سے ایسا نہیں ہے۔ ایک روایت ہے: هَاجَتْ رِيحٌ حَمْرَاءُ بِالْكُوفَةِ، فَجَاءَ رَجُلٌ لَيْسَ لَهُ هِجِّيرَى إِلَّا: يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ مَسْعُودٍ جَاءَتِ السَّاعَةُ، قَالَ: فَقَعَدَ وَكَانَ مُتَّكِئًا، فَقَالَ: إِنَّ السَّاعَةَ لَا تَقُومُ، حَتَّى لَا يُقْسَمَ مِيرَاثٌ، وَلَا يُفْرَحَ بِغَنِيمَةٍ. (مسلم) ”ایک مرتبہ کوفہ میں سرخ آندھی آئی تو ایک شخص آیا، اس کا تکیۂ کلام ہی یہ تھا: عبداللہ بن مسعود! قیامت آگئی ہے۔ وہ (عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) ٹیک لگائے ہوئے تھے (یہ بات سنتے ہی) اٹھ کر بیٹھ گئے، پھر کہنے لگے: قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ نہ میراث کی تقسیم ہوگی نہ غنیمت حاصل ہونے کی خوشی“۔ کچھ روایتوں میں تذکرہ ہے کہ بہت بڑی بڑی جنگیں ہوں گی جن میں بے تحاشا لوگ مارے جائیں

گے، ان میں جو فاتح ہوگا تو وہ بھی اس غنیمت کا کیا کرے گا جبکہ اس کے اپنے قبیلے اور گھر کے لوگ بھی مارے جائیں۔ چند دوسری احادیث میں ایک ترتیب سامنے آتی ہے جیسے کہ: «تَغْزُونَ جَزِيرَةَ الْعَرَبِ فَيَفْتَحُهَا اللهُ، ثُمَّ فَارِسَ فَيَفْتَحُهَا اللهُ، ثُمَّ تَغْزُونَ الرُّومَ فَيَفْتَحُهَا اللهُ، ثُمَّ تَغْزُونَ الدَّجَّالَ فَيَفْتَحُهُ اللهُ». قَالَ: فَقَالَ نَافِعٌ: يَا جَابِرُ، لَا نَرَى الدَّجَّالَ يَخْرُجُ، حَتَّى تُفْتَحَ الرُّومُ.(مسلم) ''تم پہلے تو عرب کے جزیرے میں (کافروں سے) جہاد کرو گے، اللہ تعالیٰ اس کو فتح کردے گا۔ پھر فارس (ایران) سے جہاد کرو گے، اللہ تعالیٰ اس پر بھی فتح کردے گا پھر نصاریٰ سے لڑو گے روم والوں سے، اللہ تعالیٰ روم کو بھی فتح کردے گا۔ پھر دجال سے لڑو گے اور اللہ تعالیٰ اس کو بھی فتح کردے گا (یہ حدیث آپ ﷺ کا بڑا معجزہ ہے)۔ نافع نے کہا کہ اے جابر! ہم سمجھتے ہیں کہ دجال روم فتح ہونے کے بعد ہی نکلے گا''۔ اس طرح کی متعدّد احادیث ہیں جن میں ایک ترتیب بیان ہوئی ہے۔ تو امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: إن أول الآيات ظهور الدجال، ثم نزول عيسى عليه السلام، ثم خروج يأجوج ومأجوج .(التذكرة بأحوال الموتى وأمور الآخرة، ص: ۱۲۶۴) ''سب سے پہلی نشانی دجال کا ظہور ہے، پھر عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، پھر یاجوج ماجوج کا خروج''۔ دجال سے پہلے مہدی ہیں یا مہدی کے دور میں ہی دجال کا ظہور ہوگا یا اس سے پہلے ہوگا، اس کے بعد نزولِ مسیح ہے پھر یاجوج ماجوج کا خروج ہے، یہ ترتیب بالکل واضح ہے۔ اسی طریقے سے ایک روایت میں فرمایا: «عُمْرَانُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ خَرَابُ يَثْرِبَ، وَخَرَابُ يَثْرِبَ خُرُوجُ الْمَلْحَمَةِ، وَخُرُوجُ الْمَلْحَمَةِ فَتْحُ قُسْطَنْطِينِيَّةَ، وَفَتْحُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةِ خُرُوجُ الدَّجَّالِ». (ابوداود) ''بیت المقدس کی آبادی یثرب (مدینے) کی بے آبادی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اور یثرب کی بے آبادی کے نتیجے میں بڑی جنگ ہوگی اور اس جنگ کا ظہور قسطنطنیہ کی فتح ہوگا۔ اور قسطنطنیہ کی فتح کے بعد دجال آئے گا''۔ جس طرح بعض روایتوں میں آتا ہے کہ دجال کو ایک بڑا واقعہ اشتعال دلائے گا جس کے نتیجے میں وہ خروج کرے گا۔ شارحین کہتے ہیں کہ فتحِ قسطنطنیہ وہ واقعہ ہے جو دجال کے خروج کا سبب بنے گا۔ ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ چند روایات کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترتیب سامنے آئے گی لیکن بہت سی باتوں میں ہمیں معلوم نہیں ہے، مثال کے طور پر

طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، یعنی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کو کچھ لوگوں نے دابۃ الارض سے پہلے دکھایا ہے، جبکہ کچھ لوگوں نے تین خسوف کے بعد دکھایا ہے۔ حالانکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بالکل آخری نشانیوں میں سے ہے، روایت میں آتا ہے: «إِنَّ أَوَّلَ الْآيَاتِ خُرُوجًا طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَخُرُوجُ الدَّابَّةِ عَلَى النَّاسِ ضُحًى وَأَيُّهُمَا مَا كَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا فَالْأُخْرَى عَلَى إِثْرِهَا قَرِيبًا». (مسلم) ''نمودار ہونے والی سب سے پہلے نشانی مغرب سے سورج کا طلوع ہونا اور دن چڑھے لوگوں کے سامنے زمین کے چوپائے کا نکلنا ہے۔ ان میں سے جو بھی نشانی دوسری سے پہلے ظاہر ہوگی، دوسری اس کے بعد جلد نمودار ہوجائے گی''۔ اس حدیث میں در حقیقت ان واقعات کا بیان ہے جن کے وقوع پذیر ہوتے ہی توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ جس طرح ایک انفرادی شخصیت یا انسان کے لیے توبہ کا دروازہ نزع کے عالم میں بند ہوجاتا ہے۔ اسی طرح الساعۃ دنیا کی اجل یا موت ہے، تو دنیا کی نزع کیا ہے کہ سورج کا مغرب سے نکلنا اور دابۃ الارض کا آکر بالکل حق و باطل کو مبرہن کر دینا، اس کے بعد کوئی رجوع کرنا بھی چاہے تو اس کا رجوع قبول نہیں ہوگا۔ اس بحث سے واضح ہوا کہ جہاں ہم پر ترتیب کو بھی بالکل واضح کر دیا گیا وہاں تو ہم تیقن کے ساتھ ترتیب کو بھی مانیں، لیکن اس کے علاوہ باقی معاملات کو متشابہات سمجھ کر ان کے بہت زیادہ تعین کی تگ و دو نہ کریں بالکل ویسے ہی جیسے قیامت کے بہت سے معاملات متشابہات میں سے ہیں۔

موجودہ دور کی پیچیدگی اور احتیاط

یہ تو واقعہ ہے کہ جس دور میں ہم رہ رہے ہیں اس میں دھوکے اور شبہے کی کثرت ہے۔ اور یہ بات ٹھیک ہے کہ موجودہ دور میں Capitalism نے جو Empire of illusion قائم کی ہے، اگر آپ سچائی کے ساتھ اور علمی اعتبار سے اس کا تھوڑا سا مطالعہ کریں اور اس کے اندر اتریں تو آپ بالکل بھونچکے رہ جائیں گے۔ اس کے اندر جو دجل اور استحصال ہے، انسانوں کے ساتھ جس طرح کا معاملہ کیا جاتا ہے واقعتاً حیران و پریشان کر دینے والا ہے۔ بینکنگ سسٹم کو اٹھا لیں، کچھ لوگ اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیں تو پریشان ہوجائیں گے۔ میڈیا انڈسٹری کیا کر رہی ہے؟ فیشن انڈسٹری کیا ہے اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ تعلیمی نظام کتنا پیچیدہ ہے؟ اور جمہوریت

کا پورا ایک ڈھکوسلا ہے اس کو دیکھ لیں۔ تو واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے اندر لوگ جائیں گے تو بہت پریشان ہوں گے اور ان کو لگے گا کہ اس میں تو دجل ہی دجل ہے، فریب ہی فریب ہے۔ اور پھر ہوتا یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ عام طور پر عالم نہیں ہوتے یا دین کی بنیادی تعلیمات انھوں نے گہرائی سے پڑھی نہیں ہوتیں، تو پھر ان کو کسی خاص چیز کا جنون ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھنا شروع کر دیتے ہیں یا ویڈیوز بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ تو ایک چیز ان کے دماغ پہ مسلط ہو جاتی ہے اور پھر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس وقت امت کے لیے جو سب سے اہم ایشو ہے، وہ یہ ہے جس کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ اور یہ جو باقی علما اور باتوں پر گفتگویں کر رہے ہیں، یہ بالکل بیکار کام ہے اور بالکل Counter productive ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب لوگوں کو چاہیے کہ تبلیغ کا کام معطل کر دیا جائے، مدارس کو بند کر دیا جائے، خانقاہوں پر تالے ڈال دیے جائیں اور جہاد کی ایکٹیویٹی ختم کر دی جائے، اور ایک دفعہ سب مل کر اس ایشو پر فوکس کریں جو ان صاحب کے دماغ میں آیا ہے۔ ممکن ہے اس کا موضوع اہمیت کا حامل ہو، لیکن یہ ضد کرنا کہ سب لوگ اس پر گفتگو شروع کر دیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ ایسے حضرات کی طرف سے ایک یوٹوپیا سا گھڑ لیا جاتا ہے اور کچھ نوجوان بے چارے ان کی بات سن کے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرف نکل پڑتے ہیں۔ مگر کچھ عرصے بعد وہ صاحب جو اس طرف لگانے والے ہیں وہ خود پھر پرانے سسٹم میں آکر مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن تب تک کئی لوگ خراب ہو چکے ہوتے ہیں۔ تو یہ جو چیزیں ہیں ان کے بارے میں احتیاط کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن بات وہی ہے کہ معاملات بہت پیچیدہ ہیں اور ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے: «إِنَّهُ سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ فِتَنٌ بَاقِرَةٌ، تَدَعُ الْحَلِيمَ حَيْرَانًا، النَّائِمُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَاعِدِ، وَالْقَاعِدُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ، وَالْقَائِمُ فِيهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِي، وَالْمَاشِي فِيهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِي. فَقَطِّعُوا أَوْتَارَكُمْ، وَكَسِّرُوا السُّيُوفَ بِالْحِجَارَةِ». (المعجم الاوسط) ”عن قریب لوگوں پر ایسے فتنے آئیں گے جو ہمہ گیر ہیں، بہت عظیم ہیں، جو بڑے ہی سمجھدار فہیم ہوش مند دانا آدمی کو بھی حیران کر دیں گے، اس فتنے میں؛ سونے والا بیٹھے ہوئے سے بہتر ہے اور جو اس میں بیٹھا ہے وہ کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہے اور اس میں

چلنے والا دوڑنے والے سے، پس اپنی کمانوں کو توڑ ڈالو اور اپنی تلواروں کو پتھروں پر مار کر کند کر ڈالو"۔ اس حدیث سے جو عمومی رہنمائی معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ فتنے میں انسان Step back ہو جائے یعنی پیچھے ہٹ جائے خود کو روکے رکھے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ یہاں پاکستان کے سماج میں یہ سب کچھ ہو چکا ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ بعض اوقات جب فتنہ بڑھ جاتا ہے تو غیر فعال ہونا زیادہ بہتر رویہ ہوتا ہے بھاگ دوڑ کرنے سے، ان حالات میں فعالیت مضر ہوتی ہے، اور غیر فعالیت اور چیزوں کو وقت لینے کا موقع دینا مفید ہوتا ہے، کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر موقعے پر آدمی کودے اور کود کر ایک چومکھی لڑنے کی کوشش کرے۔

زبان کا فتنہ

آج کل جب بعض نوجوانوں کے اندر دینی جذبہ ابھرتا ہے، کوئی تقریر سنتے ہیں یا کسی عالم سے متعلق ہوتے ہیں، جب کوئی دینی دعوت ان تک پہنچتی ہے، تو ایک دم جذباتی ہو جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اب ہمیں جیسے بہت زور وشور سے کام کرنا ہے۔ اور پھر کئی لوگ جو آئی ٹی کے شعبے سے وابستہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے شعبے میں بڑی گڑبڑیں ہیں تو اب ضرورت ہے اس بات کی کہ سوشل میڈیا؛ فیس بک، انسٹاگرام، ٹویٹر اور یوٹیوب پر محاذ بنایا جائے، جس میں ان لبرلز، ماڈرنسٹ، سیکیولرسٹ اور ایتھیسٹ سب کا ہم نے قلع قمع کرنا ہے اور ان کی طبیعت صاف کرنی ہے۔ یہ ایک اہم میدان ضرور ہے مگر یہاں بھی احتیاط کی بہت ضرورت ہے، اگرچہ یہ بات بہت عجیب لگے گی مگر کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ کر جائیں اور خاموشی اختیار کریں۔ یہ بات ابھی شاید لوگوں کو سمجھ میں نہ آئے، لیکن جو کچھ ہمارے ہاں پروڈیوس ہو رہا ہے، جس طرح کے سائبر مجاہدین پیدا ہو رہے ہیں، ان میں سے کئی ایسے ہیں کہ دین کا بہت بھلا ہو اگر وہ خاموشی اختیار کر لیں۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا اسی طرح مسندِ احمد کی ایک روایت میں بعض فتنوں کے حوالے سے زبان کو تلوار سے زیادہ نقصان دہ بتایا گیا ہے: «اللِّسَانُ فِيهَا أَشَدُّ مِنْ وَقْعِ السَّيْفِ». "اس فتنے میں زبان، تلوار نکال لینے سے زیادہ خطرناک ہے"۔ اس لیے کہ تلوار نکالنے والا ہو سکتا ہے دو چار کو ٹھکانے لگا کر خود بھی کھیت رہے لیکن زبان ہو سکتا ہے کوئی ایسا فتنہ چلا دے جو لوگوں کے دین

وایمان کو غارت کردے۔ اس لیے دورِ فتن میں خوب سوچ سمجھ کر کلام کرنا چاہیے۔ تو عرض یہ ہے کہ گفتگو ہونی چاہیے لیکن گفتگو وہ لوگ کریں کہ جو اس کے اہل ہوں۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ جو صاحبِ علم ہے وہ ہمیشہ ٹھیک بات بیان کرے گا یا اس سے غلطی نہیں ہوگی، نہیں یہ کوئی بھی نہیں کہہ رہا۔ سلف وخلف میں اس پر باتیں لوگوں نے کی ہیں اور ان سے غلطیاں بھی ہوئیں، بعض اوقات فاش غلطیاں بھی ان سے ہوئیں۔ مثال کے طور پر مشہور مفسر امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ جن کے بڑے علمی کارنامے ہیں، مگر ان کی ایک کتاب ہے اس کا ہم نے تذکرہ کیا تھا کہ انھوں نے بھی اس امت کی عمر کے حوالے سے ایک رسالہ تصنیف کیا، مگر وہ کوئی کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان سے بے تحاشا تسامحات ہوئیں۔ اس لیے اس کی حیثیت بس ان کے ایک تفرد کی سی ہے، اسے تفرد کے طور پر ہی دیکھا جائے گا۔

معروفات کو اختیار کرنا

سیدنا عبد اللہ بنِ عمرو بنِ عاص رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنے والی صورتِ حال کے بارے میں کچھ ہدایات دی ہیں۔ اس حدیث کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں: «اِلْزَمْ بَيْتَكَ، وَامْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَخُذْ بِمَا تَعْرِفُ، وَدَعْ مَا تُنْكِرُ، وَعَلَيْكَ بِأَمْرِ خَاصَّةِ نَفْسِكَ، وَدَعْ عَنْكَ أَمْرَ الْعَامَّةِ». (ابوداود) ”اپنے گھر کو لازم پکڑ لو اور اپنی زبان کو روکے رکھو اور معروف کو اختیار کرو اور منکر کو چھوڑ دو اور خاص اپنے معاملے کو لازم پکڑو اور امرِ عام کا خیال جانے دو“۔ تو یہ بات بہت اہم ہے کہ فتنوں کے دور میں معروف اشخاص، معروف افکار، معروف اعمال اور معروف احوال کو اختیار کریں۔ یہ جو لوگوں کو ندرت پیدا کرنے کا، نئے افکار، نئے نسخے بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے اس سے بچیں اور فتنے کے دور میں جو معروفات ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے۔ بہت معروف روایت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللهُ وَرَسُولُهُ. (بخاری) ”لوگوں سے وہ باتیں بیان کرو جو ان کی جان پہچان کی ہیں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا

جائے"۔ کنزالعمال کی ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: وَدَعُوا مَا يُنْكِرُون. "اور جو چیزیں لوگوں کے اندر نکارت پیدا کرتی ہیں ان کو چھوڑ دو"۔ اسی طرح عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ، إِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً. (مقدمہ مسلم) "تم جب بھی کسی قوم سے ایسی بات بیان کرو جو ان کی عقلوں تک نہ پہنچے تو پھر ان میں سے بعض کے لیے وہ چیز فتنہ بن جاتی ہے"۔ جس طرح کہ عام لوگوں کے سامنے اگر آپ تقدیر کی بہت پیچیدہ باتیں شروع کر دیں تو یہ بعض اوقات ان کے لیے فتنہ کا باعث بن سکتی ہیں۔ تو اس کو اس لحاظ سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں یا جو کچھ ہمارے علم میں ہے یہ بھی ضروری نہیں ہو تا کہ وہ سارا کا سارا لوگوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بعض روایتوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر میں وہ بیان کرنا شروع کروں تو میری گردن کاٹ دی جائے۔ یہ وہ روایات تھیں جو سیاسی نوعیت کی تھیں، جس میں حکمرانوں کی بداعمالیوں کا تذکرہ تھا۔ اور وہ حالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، تو ان کو لگتا تھا کہ اگر میں یہ باتیں بیان کروں گا، تو بنوامیہ اور ان کے عاملین سمجھیں گے کہ گویا یہ ہم پر اٹیک ہو رہا ہے، اور بلاوجہ میں اس انتشار اور فتنے کی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ تو یہ چیز بہت اہم ہے کہ انسان کو جو بات بھی معلوم ہو اور اس کو بتانا ضروری نہیں ہے بلکہ سامعین کا دھیان کرنا ضروری ہے، اس بات کا لحاظ کرنا ضروری ہے کہ یہ جو باتیں میں بیان کر رہا ہوں لوگ اس کو کس طرح لیں گے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کو غلط طریقے سے انٹرپریٹ کریں اور پھر اس سے کچھ نتیجے نکالنا شروع ہو جائیں، پھر یا تو خود وہ فتنے میں مبتلا ہو جائیں یا دوسرے فتنے کا ذریعہ بن جائیں۔

غیر مستند کلام اور اس کا نقصان

پہلے ہم نے دیکھا ان کتابوں کے مصنفین نے لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ جی فلاں "مہدی" ہے اور یہ "سفیانی" ہے، جو مہدی کا دشمن ہے۔ یہ جو مختلف سیاسی کردار تھے ان کے بارے میں انطباق کیا گیا کہ فلاں مہدی کا دشمن ہے اور فلاں دوست ہے۔ جیسا کہ صدام حسین کے بارے میں کہا گیا کہ یہ سفیانی ہے اور پھر یہ انطباق کیا کہ جو اُس کے مخالف گروہ ہیں، یہ ان کو گرا دے گا ان کو شکست دے دے گا۔ اب جب خارج میں یہ

سب نہیں ہو رہا تو میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ ان باتوں کے انکار کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اصل میں ایک تو بات یہ ہے کہ کچھ روایتیں تو ہیں ہی نہیں، اللہ کے نبی ﷺ نے ایسا فرمایا ہی نہیں۔ اور آپ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایسا فرمایا تو ایک تو (معاذ اللہ) آپ اللہ کے نبی ﷺ کی شخصیت کی تکذیب کا باعث بن رہے ہیں، دوسرا یہ کہ اگر کوئی صحیح حدیث ہے بھی تو آپ اس کی ایک باطل اور عبث تاویل کر رہے ہیں اور پھر جب وہ خارج میں ظہور پذیر نہیں ہوتی تو لوگ اس کے بارے میں شبہے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ جو مہدی کی روایتیں ہیں بارہا ان کا استحصال ہو چکا ہے اور بارہا لوگوں نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا۔ تو اب کئی لوگوں کے اندر اس حوالے سے توحش پیدا ہو چکا ہے اور ان کو اس تصور ہی سے گویا اب گھن آنے لگی ہے کہ یہ جو مہدیت ہے اس نے اسلام کو کیا دیا ہے اور خرابی ہی پیدا کی ہے اور عمل ہی کو معطل کیا گیا ہے۔ دین کے معاملے میں نت نئی تعبیرات کے پیچھے بھاگنا اور آئے دن نئے نظریات اختیار کرنے سے بچنا چاہیے۔ سیدنا ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ، سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: ”اے ابو عبد اللہ! ہمیں کوئی نصیحت فرمائیے“۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ”کیا تمھارے پاس یقین نہیں آگیا؟ (یقین سے مراد قرآن و سنت ہے)“، تو ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: ”کیوں نہیں، میرے رب کی قسم! ہم تک یقین پہنچ گیا ہے“۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فَإِنَّ الضَّلَالَةَ حَقَّ الضَّلَالَةِ أَنْ تَعْرِفَ الْيَوْمَ مَا كُنْتَ تُنْكِرُ قَبْلَ الْيَوْمِ، وَأَنْ تُنْكِرَ الْيَوْمَ مَا كُنْتَ تَعْرِفُ قَبْلَ الْيَوْمِ، وَإِيَّاكَ وَالتَّلَوُّنَ فَإِنَّ دِينَ اللهِ وَاحِدٌ. (الجامع معمر بن أبي عمرو راشد) ”بے شک حقیقی اور واقعی گمراہی یہ ہے کہ آج تم ان چیزوں کو معروف (شناسا) سمجھنے لگو، جن کے بارے میں آج سے پہلے تمھارے اندر نکارت تھی (ان کو اجنبی سمجھتے تھے)، اور وہ چیزیں جن کو آج سے پہلے تم بھلا سمجھتے تھے (جن کو تم سمجھتے تھے کہ یہ شناسا اور دین میں جانی پہچانی چیزیں ہیں) تم ان کا انکار کرنے لگو (اس سے اجنبیت محسوس کرنے لگو)۔ دیکھو! تلوّن (یعنی بہت رنگا رنگی، بار بار اپنی رائے اور مزاج بدلنے) سے بچو! کہ بے شک اللہ کا دین ایک ہی ہے“۔ چاہیے کہ انسان اللہ سے دعا کرے کہ وہ ہدایت پر ہو اور ایسا نہ ہو کہ فتنے اس پر اتنے مؤثر ہو جائیں کہ اس کے معروفات، منکرات بن جائیں اور منکرات، معروفات میں بدل جائیں۔

دورِ پُرفتن میں مطلوب رویہ

ہم نے احادیثِ فتن وعلاماتِ قیامت کے فہم کے اصول وضوابط اور احتیاطیں پڑھ لیں، غلط اور فاسد تعبیرات اور صحیح ومعتدل تعبیرات سے بھی ہم واقف ہوگئے۔ یہ بات بھی تفصیل سے ہم سمجھ چکے کہ ہم دورِ فتن میں رہ رہے ہیں تو اب سوال ہے کہ ہمیں کرنا کیا چاہیے؟ اس حوالے سے چند رہنما نکات تحریر کیے جاتے ہیں:

۱: معروفات کے میدان میں معطل کے بجائے متحرک ہونا چاہیے!

پیچھے ہم نے معطل ہونے کی بات کی تھی تو وہ یا تو فتنے کی صورتِ حال کے دوران کی ہدایت تھی یا ان باتوں میں ملوث ہونے کے بارے میں تھی جن سے انسان یا تو خود فتنے میں مبتلا ہو جائے یا دوسروں کے فتنے میں پڑنے کا ذریعہ بن جائے۔ اب یہاں ہم جس تحرک اور مصروفیت کا کہہ رہے ہیں وہ معروف (نیکی) یا معروفات (دین کی مسلمہ تعلیمات) کے میدان میں متحرک ہونا ہے۔ فتن وملاحم پر مشتمل لٹریچر کے مطالعے کا لوگوں کے عمل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسلام کا غلبہ ہونے والا ہے، مہدی آنے والے ہیں اور اب دین غالب ہونے والا ہے، تو ان کے اندر ایک عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اگر ان کو معلوم ہو کہ ابھی تو معاملہ بہت دور ہے اور ابھی تو اس میں بہت سے مراحل آنے والے ہیں، تو وہ بجھ کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ عجیب سی بات ہے کیونکہ دین اللہ نے دیا ہے اس کے مستقل تقاضے ہیں، حالات خارج میں کیسے ہی ہوں ہمیں اس پر عمل کرنا ہے، ہاں یہ الگ بحث ہے کہ مشکل حالات میں عمل کرنے والے کے لیے اجر زیادہ ہے۔ نبیؐ اکرم ﷺ نے بہت سخت حالات کا ذکر فرمایا کہ اس دور میں عمل کرنے والا ایسا ہوگا جیسے اپنی ہتھیلی میں انگارہ تھامنے والا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اس دور میں عمل کرے گا اس کے لیے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا، تو صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ جو پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہے کیا یہ ہمارے پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر اجر ملے گا یا ان لوگوں کے پچاس لوگوں کے برابر؟ تو فرمایا: «بَلْ أَجْرُ خَمْسِينَ رَجُلاً مِنْكُمْ». (ترمذی) ”نہیں بلکہ تمھارے پچاس لوگوں کے برابر“۔ تو اتنے بڑے اجر کی بشارت کیا ہمیں

متحرک کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: «الْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَهِجْرَةٍ إِلَيَّ». (مسلم) ”ہرج، فتنے اور قتل وغارت کے زمانے میں اللہ کی بندگی پر قائم رہنے والا ایسا ہی ہے گویا کہ میری طرف ہجرت کر کے آنے والا“۔ لہذا عمل تو ہمیں ہر صورت میں کرنا ہی ہے، حالات اچھے ہوں تب بھی کرنا ہے، حالات خراب ہوں تو تب بھی کرنا ہے۔ خراب حالات میں جو بہت عزیمت کے ساتھ کھڑا رہے گا تو اسے پچاس کے برابر اجر ملے گا اور اگر آدمی بس پورا پورا دین پر چل رہا ہو تو اس کو مارجن بھی مل سکتا ہے۔ ایک روایت بہت معروف ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ مَنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عُشْرَ مَا أُمِرَ بِهِ هَلَكَ ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا أُمِرَ بِهِ نَجَا». (ترمذی) ”تم ایک ایسے دور میں ہو کہ جس میں اگر کوئی شخص دین کا ایک بٹا دس چھوڑ دے گا تو ہو سکتا ہے اس کو پکڑ لیا جائے اس کا مواخذہ ہو جائے۔ جبکہ ایک دور وہ بھی آئے گا کہ اگر تم دین میں ایک بٹا دس پر عمل کر لو تو نجات پا جاؤ گے“۔ تو یہ خارج کے حالات سے بہت فرق پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملات کیسے ہوں گے لیکن اصل بات یہی ہے کہ اللہ کی بندگی کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے اور ہمیں اس کی بندگی کرنی ہے۔ حالات سخت ہوں یا نرم ہوں، بہر حال ہمیں اللہ کی بندگی کرنی ہے۔ یہ بات بھی کہ ہمیں کسی چیز کو معطل نہیں کرنا کہ اب تو کوئی فائدہ نہیں ہے، اب تو قیامت کی علامتیں سب ظاہر ہو گئی ہیں اور اب ہمارے کرنے سے کیا ہو گا۔ وہی بات کہ تکوین کو تشریع کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا۔ اب وہ دور آ گیا ہے، اب تو خرابی ہی آنی ہے اب تو فتنہ ہی آنا ہے اس طرح کے جملے بولے جاتے ہیں۔ اور اب گویا ہم کچھ کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو Divine scheme of things میں مداخلت کر رہے ہیں، یہ تصور بالکل غلط ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ قَامَتْ عَلَى أَحَدِكُمُ الْقِيَامَةُ، وَفِي يَدِهِ فَسِيلَةٌ فَلْيَغْرِسْهَا». (مسندِ احمد) ”اگر قیامت قائم ہونے لگے اور تم میں سے کسی شخص کے ہاتھ میں کھجور کا ایک پودا ہو اور اگر اس کے بس میں ہو تو وہ اس پودے کو لگا دے“۔ یعنی درخت انسان لگاتا ہے اور اس امید پر لگاتا ہے کہ میں پھل کھا لوں گا یا اس امید پر کہ میں نہیں کھا پاؤں گا تو میری نسلیں کھا لیں گی لیکن اب تو پتا لگ رہا ہے کہ ناقوس بجنے والا ہے اور صور پھونکا جانے والا ہے اور ابتدائی آثار بھی ظاہر ہو گئے ہیں اور دنیا ختم ہونے جا رہی ہے۔ تو اب اس وقت

درخت لگانے کا تو کوئی مطلب ہی نہیں ہے لیکن یہاں نبی اکرم ﷺ نے عمل کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے کہ ہمیں بہر حال کام کرنا ہے۔ ہم اللہ کے مزدور ہیں، اللہ کے غلام ہیں، اللہ کے بندے ہیں، حالات جیسے بھی ہوں ہمیں بہر حال چیزوں کو درست کرنے کی اپنی سی کوشش کرنی ہے۔

۲: فتنوں کے زمانے میں اپنی فکر کریں

پیچھے ہم نے سیدنا عبد اللہ بن عمرو ابنِ عاص رضی اللہ عنہما سے دورِ فتن کے بارے میں مروی ایک حدیث پڑھی تھی، اس میں یہ الفاظ بھی تھے: «وَعَلَيْكَ بِأَمْرِ خَاصَّةِ نَفْسِكَ، وَدَعْ عَنْكَ أَمْرَ الْعَامَّةِ». (ابوداود) ”خاص طور پر اپنے معاملے کی طرف متوجہ ہو اور امرِ عام کو چھوڑ دو“۔ چوں کہ دور فتنے کا ہے اور صورتِ حال غیر معمولی ہے تو خطرہ ہے کہ دوسروں کو بچاتے ہوئے کہیں خود نہ بہہ جائیں۔ وہ کیفیت نہیں ہونی چاہیے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تو آج کل ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تجزیہ نگار ہوتے ہیں جو کہتے رہتے ہیں کہ امت کے ساتھ یہ ہو رہا ہے اصل میں یہ سازش ہے اور یہ ہے اور وہ ہے لیکن اپنے گھر کی فکر نہیں ہے، اپنے حالات پتلے ہیں۔ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ ہمیں حکم ہے کہ خاص اپنے معاملات کو سیدھا کرو۔ ایک خاص مدت تک آدمی دوسروں کے بارے میں بھی فکر مند رہتا ہے، ان کے لیے اہتمام بھی کرتا ہے، لیکن بنیادی بات وہی ہے کہ: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا قُوا أَنفُسَكُم وَأَهلِيكُم نَارًا﴾ (التحریم: ٦) ”اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ“۔ ایک اور روایت جو میں نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا جو دجال کے حوالے سے طویل روایت ہے کہ جب دجال کا آپ ﷺ نے تذکرہ فرمایا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! یہ فرمائیے کہ زمین میں کتنا اس کا قیام ہو گا؟ فرمایا کہ چالیس دن، ان میں سے ایک دن ایک سال کی مانند ہو گا اور ایک دن ایک مہینے کے برابر ہو گا یا اس کی مانند ہو گا اور ایک دن گویا ایک ہفتے کے برابر ہو گا، پھر اس کے بعد باقی دن جو ہیں وہ تمھارے عام دنوں کی طرح کے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے صورتِ حال بتائی، اب اس میں

ایک ایسی چیز کا آپ ﷺ نے تذکرہ فرمایا کہ جو ظاہری بات ہے کہ پوری طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن دیکھیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو تسلیم کیا اور اس کے بعد فوری طور پر جو سوال کیا وہ عمل کے متعلق تھا: يَا رَسُولَ اللهِ أَرَأَيْتَ اليَوْمَ الَّذِي كَالسَّنَةِ أَتكْفِينَا فِيهِ صَلاةُ يَوْمٍ. "اے اللہ کے رسول! وہ دن جو ایک سال کی مانند ہو گا کیا اس میں ایک ہی دن کی نمازیں ہمارے لیے کافی ہوں گی"۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لاَ وَلَكِنْ اقْدُرُوا لَهُ». "نہیں بلکہ تم اندازے سے نمازیں پوری کرنا"۔ اس سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں جو سب سے بنیادی چیز تھی اور گویا جوان کی زندگی کا مقصد و محور تھا وہ اللہ کی بندگی ہے، کیونکہ اسی لیے انسانوں کو خلق کیا گیا ہے۔ اور اللہ کی بندگی کا سب سے بڑا مظہر، نماز ہے۔ اسی لیے انھوں نے دجال کے بارے میں دیگر تفصیلات کے بجائے عمل اور عبادت کے متعلق سوال کیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کرونا کے ہنگام میں جو ساری Debate چل رہی تھی، وہ مسجد اور نماز ہی سے متعلق تھی، اور اس میں لوگ دو حصوں میں بٹ گئے۔ دونوں طرف سے گفتگو ہوتی رہی، جو باجماعت نماز کے خلاف تھے ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا اس موضوع سے، انھوں نے نماز نہ پہلے کبھی پڑھی اور نہ جمعہ پڑھا۔ وہ بہت بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے کہ احتیاط کرنی چاہیے اور یہ کرنا چاہیے، وہ کرنا چاہیے۔ تو ان سے تو پوچھنا چاہیے کہ حضرت آپ کو کتنے سال ہو گئے کہ آپ کسی مسجد میں کبھی تشریف لے گئے ہوں؟ تو ان کا تو مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ تو دین سے غافل ہیں اور وہ کھیل تماشا کر رہے ہیں۔ لیکن بہر حال جو اہلِ ایمان ہیں، مومنین ہیں، ان کے نزدیک نماز کا مسئلہ جزوی مسئلہ نہیں، چھوٹا مسئلہ نہیں ہے۔ لہذا دجال کا فتنہ اتنا بڑا ہے اور ان کے دنوں کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن ایک سال کے مانند ہو گا، کیا ہمارے لیے پھر ایک دن کی نماز کافی ہو جائے گی؟ صحابہ نے سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال کیا؟ تو فرمایا کہ اس کا ایک اندازہ قائم کرو۔ اب اس روایت کا کیا مفہوم ہے وہ ہمارا اس وقت موضوع نہیں ہے، لیکن میں بس ایک عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ جب آپ ﷺ ہدایت دے رہے ہیں تو خود سے بھی بعض اوقات بتاتے تھے کہ یہ واقعہ ہو گا۔ ہم کچھ روایتوں میں دیکھ رہے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پوچھ رہے ہیں کہ اے اللہ کے نبی! جب اس

طرح کے حالات ہوں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟ تو حالات جیسے بھی ہوں ہمیں عمل اور عبادت کی فکر کرنا چاہیے۔

۳: حصولِ علم اور رجوع الی الاصل

احادیثِ فتن میں رسول اللہ ﷺ اخبار کے ساتھ جو احکام اور ہدایات دے رہے ہیں تو ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ عمل صحیح علم کے ذریعے ہوگا۔ ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے، یعنی جو قرآنِ مجید نے کہا ہے: ﴿أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ (الانعام:۱۲۲) "کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو؟" تو ایک وہ جو مردہ تھا اس کو ہم نے زندہ کر دیا اور پھر اس کے لیے نور مقرر کر دیا جس کے ساتھ وہ چلتا ہے لوگوں میں، کیا وہ اس کے برابر ہو سکتا ہے کہ جو اندھیروں میں ہو اور اس میں سے وہ نکلنا بھی نہ چاہتا ہو۔ آیتِ مبارکہ میں نور کا ذکر ہے اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ علم روشنی ہے تو فتنوں کے حوالے سے ایک روایت میں راہِ نجات کے طور پر علم کا ذکر بھی آیا ہے: سیدنا ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سَتَكُونُ فِتَنٌ يُصْبِحُ الرَّجُلُ فِيهَا مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا إِلاَّ مَنْ أَحْيَاهُ اللهُ بِالْعِلْمِ». (ابنِ ماجہ) "عن قریب ایسے فتنے ہوں گے کہ بندہ حالت ایمان میں صبح کرے گا لیکن شام کو مبتلائے اعمالِ کفر ہو گا سوائے اُس کے کہ جسے اللہ، علمِ دین کے ذریعے محفوظ رکھے"۔ علمِ دین ہی ہماری اصل ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی اصل کی طرف پلٹیں، مولانا روم نے کہا تھا کہ:

دستِ ہر نااہل بیمارت کند
سوے مادر آ کہ تیمارت کند

ہر نااہل کے ہاتھ میں تم نے اپنا ہاتھ دے کر خود کو بیمار کر لیا ہے، تم ماں کی طرف آؤ کہ وہ تمھاری تیمارداری کرے۔ اقبال نے بھی جگہ جگہ اپنی شاعری میں "مشربِ ناب" اور "شرابِ کہن" کا تذکرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا

وہی جام گردش میں لا ساقیا

یہ شرابِ کہن کیا ہے؟ یہ قرآن و سنت کا چشمہ صافی ہے جس کی طرف ہمیں رجوع کرنا چاہیے۔

۴: روایت اور علمائے کرام کی طرف رجوع

ہم نے تو مان لیا کہ ہمیں قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن اس رجوع کا طریق بھی درست ہونا چاہیے۔ قرآن و سنت سے راہنمائی لینے کا ہر گروہ اقراری ہے یہاں تک کہ منکرین سنت بھی انکار حدیث کے لیے کئی ایک احادیث سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں۔ تو فیصلہ کن یہ نہیں کہ آپ قرآن و سنت سے رجوع کرنے والے ہیں بلکہ فیصلہ کن امر یہ ہے کہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کا طریق کیا ہے۔ تو درست طریقہ یہی ہے کہ قرآن و سنت سے رجوع اہلِ سنت کے علمائے کرام کی روایت کے ذریعے سے کیا جائے۔ اس لیے کہ ہمارا دین "اسناد" کا دین ہے جس پر ہم پیچھے سیر حاصل گفتگو کر چکے اور اس لیے بھی کہ علمائے کرام، ان اولوالامر میں شامل ہیں جن کی اطاعت کا ہمیں حکم دیا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللهَ وَ اَطِيْعُوْا الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (النساء:۵۹) "اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی اور جو تم میں سے اولوالامر ہیں"۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں چھے اقوال نقل کیے ہیں جنھیں یہاں اختصار کے ساتھ درج کیا جاتا ہے: اولوالامر کے حوالے سے پہلا قول یہ ہے کہ هُمُ الْأُمَرَاءُ یعنی اُمرا سے مراد حکمران، خلیفہ یا امام ہیں، امام سیاسی معنوں میں ہے یعنی جس کو امامتِ کبریٰ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قول جمہور کا ہے، سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اولوالامر کون ہیں: هم أَهْلُ الْقُرْآنِ وَالْعِلْمِ، جو قرآن اور العلم یعنی حدیث و سنت کے عالم ہیں۔ العلم سے مراد وحی جلی، وحی خفی، وحی متلو، وحی غیر متلو سب اس میں شامل ہے یعنی قرآن و سنت کا علم۔ پہلی رائے میں اُمرا سے مراد حکمران ہیں، دوسری رائے میں اُمرا سے مراد علما ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ یہ دونوں اتھارٹیز جیسی تیسی تھیں پہلے قائم تھیں،

لیکن نوآبادیاتی دور میں انھیں گرایا گیا۔ تیسری رائے ہے جسے سیدنا جابر، حضرت مجاہد اور امام مالک رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا اور اسی طرح کی بات امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہی کہ اس سے مراد صحابہ ہیں، یعنی یہ بات اُس خاص زمانے کے مطابق بات کہی جا رہی ہے اور یہ رائے امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ اس سے مراد صحابہ ہیں۔ چوتھی رائے میں اس سے مراد حضراتِ شیخین سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما ہیں اور یہ قول حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ پانچویں رائے میں اس سے مراد أُولُوا الْعَقَلِ وَالرَّاىِٔ، عقل والے، رائے والے ہیں، یہ ابنِ کیسان رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور چھٹا قول نقل کرتے ہوئے امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: وَزَعَمَ قَوْمٌ أَنَّ الْمُرَادَ بِأُولِي الْأَمْرِ عَلِيٌّ وَالْأَئِمَّةُ الْمَعْصُومُونَ. (تفسیرِ قرطبی، النساء، آیت:۵۹، ص:۲۶۱) ”بعض لوگوں کے زعم میں اس سے مراد سیدنا حضرت علی المرتضٰی کَرَّمَ اللہُ وجہہ ہیں اور پھر ان کے بعد ائمۂ معصومین رحمۃ اللہ علیہم ہیں“۔ یہ شیعہ حضرات کا قول ہے، اہلِ تشیع کے نزدیک اولو الامر سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمۂ اہل بیت ہیں اور وہ معصوم ہیں۔ اس قول کے بارے میں امام کہتے ہیں: وَهَذَا قَوْلٌ مَهْجُورٌ مُخَالِفٌ لِمَا عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ. (تفسیرِ قرطبی، النساء، آیت:۵۹، ص:۲۶۱) ”یہ قول ناقابلِ التفات اور جمہور اہلِ اسلام کے مخالف ہے“۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: وَأَصَحُّ هَذِهِ الْأَقْوَالِ الْأَوَّلُ وَالثَّانِي، اس میں سے سب سے صحیح پہلا اور دوسرا قول ہے۔ یعنی اُمرا سے مراد حکمران اور علما ہیں۔ امام قرطبی حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی لائے ہیں: لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوا السُّلْطَانَ وَالْعُلَمَاءَ، فَإِذَا عَظَّمُوا هَذَيْنَ أَصْلَحَ اللهُ دُنْيَاهُمْ وَأُخْرَاهُمْ، وَإِذَا اسْتَخَفُّوا بهذين أفسد دنياهم وَأُخْرَاهُمْ. (تفسیرِ قرطبی) ”لوگ خیر پر رہیں گے جب تک سلطان یعنی حکمران اور علما کی تعظیم کریں گے۔ پس جب لوگ ان دونوں کی تعظیم کرتے رہیں گے اللہ ان کی دنیا و آخرت کو سنوار دے گا اور جب وہ ان دونوں کا استخفاف کریں گے تو لوگوں کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی“۔

۵: اختلاف کا حل

قرآن پاک میں ہے کہ: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ﴾ (النساء: ۵۹) ’’اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو‘‘۔ علما نے لکھا ہے کہ اللہ کی طرف لوٹانے کا مطلب قرآن کی طرف لوٹانا اور رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹانے کا مطلب سنت کی طرف لوٹانا ہے، لیکن اس میں اہم بات یہ ہے کہ یہ لوٹانے کا عمل کون کرے گا؟ قرآنِ مجید کا منشا کیا ہے؟ سنتِ رسول کیا ہے؟ قرآن وسنت میں وارد نصوص کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ تو یہاں بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایک ہے تذکیر، ذکر، نصیحت اور یاددہانی، تو وہ قرآنِ مجید کی بالائی سطح پر موجود ہے، سب لوگ اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، اسی طرح اخلاق، کردار اور رویوں سے متعلق احادیث سے ایک عام آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جیسا کہ عام لوگوں کے لیے حدیث کی کتابیں بخاری ومسلم نہیں۔ بخاری کو تو ہر عالم بھی حل نہیں کر سکتا، تو عام آدمی کیا پڑھیں گے، عام عوام کے لیے سب سے زیادہ مشہور اور متداول کتاب ریاض الصالحین ہے۔ اس کے مقدمے میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا مقصود تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن، تصفیۂ قلب اور اپنے معاملات کو سدھارنا بتلایا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قارئین وہ احادیث پڑھیں، اسی طرح قرآنِ مجید کا سادہ ترجمے کے ساتھ مطالعہ کریں اور نصیحت حاصل کریں۔ دوسری جانب جب اس طرح کے پرفتن معاملات میں رہنمائی درکار ہو تو ایسے میں دینی رہنمائی علما ہی سے حاصل ہو گی کیونکہ: «إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ». (ترمذی) ’’علما انبیا کے وارث ہیں‘‘۔ لہٰذا اس طرح کے پیچیدہ معاملات اور پُرفتن دور میں اس بات کی اہمیت وضرورت مزید بڑھ جاتی ہے کہ ہم علما سے اپنا تعلق جوڑیں اور مضبوط کریں اور نئی نئی آوازوں، نئی نئی پکاروں کو سننے اور ان پر توجہ کرنے سے پرہیز کریں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (النساء: ۸۳) ’’جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں، ان کی طرف پہنچاتے تو

اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہوجاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے"۔ جدید عربی میں اِذاعہ کا لفظ ریڈیو کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ اس خبر کو عام کردیتے ہیں، ہر طرف نشر کردیتے ہیں۔ اُولو الامر کا یہ ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ: "جو ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں"۔ تمام علما بھی ان امور کے ماہر نہیں ہوتے، کچھ کو فقہ میں اشتغال ہوتا ہے، کچھ کو کلام میں۔ علما میں سے حدیث کا فہم رکھنے والے، ان علامتوں کی تفہیم اور تعبیر کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو ان امور کو سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں بہت اہم بات بیان ہوئی کہ: ﴿أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ یعنی مرجعیت ہونی چاہیے صاحبِ استنباط اہل الامر کی طرف، اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اہلِ تشیع میں تو نیم گرجا گھر کی مانند انتظامی ڈھانچہ ہے اور پوری مرجعیت ہے، جس میں آیت اللہ ہیں، پھر آیت اللہ العظمیٰ ہیں، لیکن ہمارے ہاں اس طرح کے مراتب نہیں بلکہ ڈھیلے ڈھالے معاملات ہیں جس میں علما ہیں تاہم ان کی اندرونی سطح پر ایک درجہ بندی قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارا کوئی والی وارث ہونا چاہیے ورنہ وہی ہوگا جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قول کے حوالے سے ہے کہ: اَلنَّاسُ ثَلَاثَةٌ: فَعَالِمٌ رَبَّانِيٌّ وَمُتَعَلِّمٌ عَلَى سَبِيلِ نَجَاةٍ وَهَمَجٌ رَعَاعٌ أَتْبَاعُ كُلِّ نَاعِقٍ يَمِيلُونَ مَعَ كُلِّ رِيحٍ لَمْ يَسْتَضِيئُوا بِنُورِ الْعِلْمِ وَلَمْ يَلْجَئُوا إِلَى رُكْنٍ وَثِيقٍ. (حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، ص:۷۹) "لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک ربّانی عالم، دوسرے نجات کی راہ میں متعلم، تیسرے سمجھ بوجھ سے عاری جاہل عوام جو ہر پکارنے والے کے پیچھے چل پڑتے ہیں، ہر چلنے والی ہوا کی طرف مائل، نہ انھوں نے علم کے نور سے روشنی پائی، نہ کسی مضبوط ستون کا سہارا لیا"۔ یعنی تیسری قسم کے لوگ بالکل Faceless عوام ہیں، اخلاقی اقدار اور ذمے داریوں سے بے بہرہ، سمجھ بوجھ سے عاری اور ہر چلانے والے کے پیچھے لگ جانے والے۔ جیسا کہ ایک مشہور کردار Pied Piper of Hamelin ہے، جو بانسری بجاکر تمام سننے والوں حتیٰ کہ جانوروں کو بھی اپنا پیرو بنالیتا تھا، پھر جب اس سے کوئی کام لیا گیا، تو اس نے وہ کام کردیا لیکن اسے معاوضہ نہیں دیا گیا، اس نے ایک خاص سُر چھیڑا اور سارے بچے اس کے پیچھے لگ گئے، اس نے انھیں لے جاکر کسی غار میں بند کردیا۔ اس دور میں بھی بہت سے

پائیڈ پائپرز ہیں، جو بھانت بھانت کی آوازیں لگا رہے ہیں، اور کسی علم کے بغیر لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم ان کو انفرادی طور پر متعیّن بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ جبکہ جن لوگوں کو اللہ نے بصیرت دی ہے وہ دیکھ سکتے ہیں کہ کیسے اللہ کے نبی ﷺ کی پیش گوئیوں کے اطلاقات ہر دور میں ہوتے رہے ہیں اور اس دور میں بھی ہیں۔ وہ ان علامات میں سے ہیں کہ جو وقتاً فوقتاً ظہور کرتی رہتی ہیں اور وہ علامات ہیں کہ: «دُعَاةٌ إِلَى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا». (بخاری) ”جہنم کی طرف سے بلانے والے دوزخ کے دروازوں پر کھڑے ہوں گے جو ان کی بات مان لے گا وہ اس میں انھیں جھٹک دیں گے“۔ اصل بات یہی ہے کہ آپ اپنے علم کو دیکھیں، اپنی صلاحیت کو پہچانیں اور پھر وہ علما، جو ان معاملات کو سمجھتے ہیں ان کی طرف رجوع کریں اور ان سے رہنمائی حاصل کریں۔

٦: ایمان کی مضبوطی کی کوشش

ایک اہم کام جس کا اس دورِ فتن میں ہمیں خاص التزام و اہتمام کرنا چاہیے وہ یہ کہ ہم اپنے ایمان کی فکر کریں۔ فتنوں کا دور ہو یا کوئی سا بھی دور، انسان کی حفاظت کا اصل ذریعہ ایمان ہی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے دجال کے بارے میں فرمایا: «مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ، يَقْرَؤُهُ كُلُّ مُؤْمِنٍ، كَاتِبٍ وَغَيْرِ كَاتِبٍ». (مسلم) ”(دجال کے ماتھے پر) دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا، ہر مومن اس کو پڑھ لے گا چاہے وہ کاتب ہو یا غیر کاتب“۔ کچھ روایتوں میں قاری اور غیر قاری بھی آیا ہے یعنی چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ۔ معلوم ہوا کہ جس کے اندر ایمان ہے وہ بھانپ لے گا چاہے ان پڑھ ہو اور جس کے اندر ایمان نہیں ہے تو چاہے اس نے ادب میں ڈاکٹریٹ کیا ہو یا پی ایچ ڈی کی ہو تب بھی وہ اس کو نہیں پہچان سکے گا، اصل چیز جو درکار ہے وہ ایمان ہے۔ اگر شخصِ دجال نے ابھی ظہور نہیں کیا اور ہمارا ایمان ڈِھلمِل ہے تو جب وہ آجائے گا تو پھر بہت کم امکان ہے کہ ہم اس کو پہچان سکیں یا اس کے فتنے سے بچ سکیں۔ آج کل کے دور میں ہمارے خارج میں جو کچھ ہو رہا ہے خاص طور پر، میڈیا، سوشل میڈیا اور پھر بہت متعیّن کر کے، الیکٹرونک میڈیا جو کچھ کر رہا ہے تو اگر کسی شخص پر اس میڈیا کا دجل واضح نہیں ہے، خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا کے ماتھے پر موجود دجل لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا تو پھر بہت مشکل ہے

کہ شخصِ دجال کے ظاہر ہونے پر وہ اس کو بھی پہچان سکے۔ یعنی جو اس میڈیا کے دجل کو نہیں پہچان سکا وہ مسیح الدجال، جو دجالِ اکبر ہے، اس کے دجل کو کیسے پہچان سکے گا؟ اس وجہ سے ہمیں چاہیے کہ ہم ان تمام باتوں کا خیال کریں اور اپنے ایمان کی آبیاری کی فکر کریں، اس میں اضافے کی کوشش میں لگ جائیں۔

*****

جان جملہ علم ها این است این
که بدانی من کیم در یومِ دین

جان لو! کل علم بس یہی ہے، کہ تم یہ جان جاؤ کہ بروزِ جزا میرا مقام کہاں ہو گا

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ

فقہ اکیڈمی

حرفِ آخر

اس تحریر میں بہت سی باتیں زیرِ بحث آئیں۔ کچھ کتابوں کا حوالہ دیا گیا اور کچھ اشخاص کا تذکرہ ہوا، اسی طرح جو غلط اطلاق و استنباط اور Interpretations ہو رہے ہیں اس حوالے سے کچھ تحریریں بھی نقل کی گئیں، اب اگر ہمیں خارج میں کوئی ایسا عالمِ دین یا صاحبِ علم نظر آئے جو اس طرح کی باتیں کر رہا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم فوری طور پر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر دیں یا اشتعال میں آکر اس کو برا بھلا کہنا شروع کر دیں، یہ رویہ درست نہیں۔ اگر کوئی ایسی بات سامنے آتی ہے تو ادب سے خلوت میں جاکر ان کے سامنے اپنی بات رکھنی چاہیے، ممکن ہے کہ وہ کچھ ایسی توجیہات کر دیں یا کوئی ایسی وضاحت کر دیں کہ جس سے بات واضح ہو جائے۔ اس طرح کی باتیں سننے اور پڑھنے کا حاصل یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم خود بہت زیادہ Judgemental ہو جائیں اور لوگوں کے بارے میں Value Judgements صادر کرنا شروع کر دیں۔ اس پہلو کا بھی ہمیں لحاظ کرنا چاہیے۔ یہ ساری گفتگو اس لیے تھی کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی آخرت کی فکر کرے اور خود کو ان فتنوں نے سے محفوظ رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرے۔ احادیثِ فتن کا مطالعہ محض سنسنی پھیلانے یا دوسرے لوگوں پر حکم لگانے کے لیے نہ کیا جائے بلکہ ان کے مطالعے سے وعظ و نصیحت حاصل کی جائے۔

آخر میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ، چونکہ موضوع بہت حساس تھا اور بہت طول بھی پکڑ گیا۔ بہت سے موضوعات زیرِ بحث آئے اور بہت طویل کلام کیا گیا۔ جب طویل کلام کیا جاتا ہے تو اس میں غلطیاں اور سہو بھی زیادہ ہو جاتا ہے، دعا ہے کہ اس میں جو بھی غلطی کوتاہی ہوئی، اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائیں۔ جو بھی کمزور باتیں ذکر ہوئیں، اللہ تعالیٰ ہمارے ذہن سے ان کو محو فرما دیں اور جو باتیں خیر کی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرما لیں اور ہمارے ذہن میں ان کو راسخ فرما دیں۔ فنعم المولیٰ و نعم النصیر.

یہ بات ہر لحظہ شاملِ حال رہے کہ ان معاملات میں آخری اور حتمی بات کوئی شخص بھی نہیں کر سکتا، طالب علموں کی طرح ان چیزوں کا جائزہ لیا جانا چاہیے اور تواضع کے ساتھ اپنی بات کہنی چاہیے۔ لیکن بہ تقاضائے بشری ہمارے الفاظ میں شوخی یا تندی آگئی ہو یا کوئی نامناسب عبارت صادر ہوگئی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں، آمین۔ اس کتاب کے متن، املا یا اعراب، حواشی یا حوالہ جات اور تطبیق وتشریح میں صاحبانِ علم کوئی غلطی پائیں تو ضرور مطلع فرمائیں، اس تعاون پر ہم آپ کے مشکور رہیں گے اور آئندہ اشاعت میں اس کی تصحیح کی کوشش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

* * * * *